جہاں نما

۱۹۲۷ء جبر و استبداد کا زمانہ تھا۔ خدا کرے ۱۹۲۸ء عقل و آزادی کا عہد ثابت ہو۔

جب نومبر ۱۹۱۸ء میں جنگِ عالمگیر ایک ہنگامی صلح میں ختم ہوئی تو چار دانگِ عالم میں ڈنکا بجایا گیا کہ جنگ ہمیشہ کے لئے ختم ہوئی اور دائمی صلح کا آغاز ہوگیا۔ غلامی کی بیڑیاں ٹوٹ گئیں اور آزادی کی آنکھوں پر سے ظلم و ستم کی پٹی کھل گئی۔ اب ہر قوم کو اپنے حقوق ملیں گے اب سچ کا بول بالا ہوگا اور دنیا میں ایک نئے دور کی داغ بیل ڈالی جائے گی!

ولسن صدر جمہوریہ امریکہ نے یہ نعرہ بلند کیا۔ انگلستان اور دیگر اتحادیوں نے اس کی اشاعت کی اور انسانوں کی بستی اس دل خوش کن پیغام سے گونج اٹھی کہ یہ وہ جنگ تھی جس نے جنگ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا شکر ہے کہ یہ برپا ہوئی اور اب مزید شکر ہے کہ اس کا انجام بخیر ہوا +

محکوم و مظلوم قومیں بھی یہ بھول کر کہ خدا کی کائنات میں کئے کا پھل ملتا ہے دیئے کا پھل نہیں ملتا جی ہی جی میں خوش ہوا کیں کہ ہمیں گھر بیٹھے بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے وہ سب کچھ مل گیا جو ان مغربی لوگوں نے ہزار کشت و خون سے تھوڑا بہت حاصل کیا ہے ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی لیکن ۱۹۲۸ء کچھ اتنا صلح پسند نظر نہیں آتا جتنی توقع تھی۔ دس برس کے بعد انسانیت بجائے زیادہ خردمند ہو جانے کے کچھ کم عاقبت اندیش بنتی دکھائی دیتی ہے! خدا نہ کرے!

انگلستان اسی میں اپنی عظمت سمجھتا ہے کہ جو کچھ حاصل کر چکا ہے اُس پر اطمینان سے قابض رہے اس لئے اُس کی ساری حکمتِ عملی کا راز امن و امان میں ہے نہ جنگ نہیں چاہتا۔ جنگ سے اُسے اور کیا مل رہے گا جو صلح میں اُسے میسر نہیں۔ اُس کی سلطنت میں سورج نہیں ڈوبتا جنوبی افریقہ اور کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی نوآبادیات کو اُس نے نیم آزادی دے کر اپنے دائرے سے باہر نکلنے کی ترغیب دے لی ہے۔ مصر میں اُس کی ریشہ دوانیاں دار و رسن کا کام دے رہی ہیں اور اُس کی خوش قسمتی سے زاغلول پاشا سے "ہندی" محبّ وطن راہیٔ ملکِ عدم ہو چکے ہیں۔ عراق و عرب کے پاؤں میں اُس نے "مفید" عہدناموں کی بیڑیاں ڈال دی ہیں فلسطین کو مقدس جان کر اگر وہاں کوئی فساد نہ کرے تو بہتر ہے۔ افغانستان کا فرماں روا اگر آزاد تسلیم ہو چکا ہے تو مہمان نوازی سے اُس کا دل موہ لینے میں کیا حرج ہے؟ ہندوستان اپنے گھر میں لڑتا ہے تو بے جا مداخلت نامناسب ہے۔

حکومت میں قدامت پسندوں کا زور ہے۔ "آزاد" مزدور کبھی کبھی غل مچاتے ہیں لیکن مزدوروں کی باقاعدہ جماعت رعب داب کے سب کاموں میں حکومتِ انگلستان کا دست و بازو ہے۔ کیوں نہ ہو اگر ہم غلامی میں عیش نہ کریں تو وہاں کے مزدور آزادی میں کیسے خوش رہ سکیں؟

انجمنِ اقوام کی باگ ڈور زیادہ تر انگلستان کے مدبّر ہاتھوں میں ہے۔ وہیں دنیا کے قیامِ امن کا قرار واقعی بندوبست کیا جاتا ہے۔ وہیں جرمنی کا حوصلہ بڑھایا جاتا ہے۔ وہیں روس سے قطع تعلق کر کے پھر دل لگی کا سامان پیدا کیا جاتا ہے وہیں فرانس اور اطالیہ کی رقابت کا سماں نظر آتا ہے اور وہیں جاپان کی مشرقیت کا قلع قمع ہوا کرتا ہے۔

لیکن آفرین کیجئے اِس چھوٹے سے جزیرے کے دراز قد عملی باشندوں کو کہ مادی ترقی کے اکثر سر رشتے اُن کے قابو میں ہیں باہمی رقابت اُن تمام قوموں کی قوتِ لایموت ہے۔ اُسی کے باعث وہ آپس میں کٹ مرنے کو تیار ہیں لیکن اُسی کے دم سے وہ زندہ و تابندہ بھی ہیں۔ انگلستان چونکہ ہر انسانی ذخیرے پر نظر رکھتا ہے اِس لئے اُس کا سب سے مقابلہ ہے۔ وہ زرومال میں امریکہ، برّی سطوت میں فرانس، تجارت میں جاپان اور علوم و فنون میں جرمنی کا رقیب ہے۔ اور دن رات اِسی دُھن میں رہتا ہے کہ ہر میدان میں اگر سب سے آگے نہ بڑھ جائے تو کسی سے پیچھے بھی نہ رہے۔ اُس کی سرد مزاج حکمتِ عملی اور مستقل مزاج محنت فی الحقیقت قابلِ داد ہے۔

امریکہ جنگِ عالمگیر کے آغاز تک ایک خاموش و خوابیدہ ملک تھا۔ جنگ کے دوران میں جب اتحادی دنیا میں اپنی فوجوں اور جہازوں سے ایک قیامت برپا کئے ہوئے تھے تو یہ خاموشی کے ساتھ اپنی دولت بڑھا رہا تھا۔ اور جب وہ بیداری میں اپنی جسمانی و قلبی قوتیں کھو رہے تھے تو یہ محوِ خواب ہو کر اپنی اصلی طاقت کو حاصل و مجتمع کر رہا تھا۔ عین وقت پر یہ میدان میں آدھمکا اور باوجود انگلستان کے تمسخر اور طعن و تشنیع کے دنیا نے یہی دیکھا کہ امریکہ آیا اور جلد بازی جیت کر اپنے گھر واپس چلا گیا۔

دورانِ جنگ کے سکون و اطمینان کا نتیجہ بعد میں رونما ہوا۔ اِدھر اتحادی جن کی فوجیں ابھی جرمنی کے گھر میں ایک بڑی تعداد میں چھاونی ڈالے ہوئے تھیں، تھک کر چُور ہو رہے تھے اُدھر امریکہ چھینا جھپٹی سے اپنا سیم و زر گن رہا تھا اور ساتھ ساتھ اتحادیوں سے کہے جاتا تھا کہ جتنی جلد میرا قرض ادا کر دو گے سود کے مزید بار سے سبکدوش ہو جاؤ گے۔ اور امریکہ نے صرف زر و مال میں ترقی نہیں کی بلکہ برّی و بحری قوت میں، تجارت میں، معاشرت میں ہر شعبے میں آگے کو قدم مارا ہے۔ برّی قوت کی تو اُسے زیادہ ضرورت نہیں کہ امریکی براعظموں میں اُس کی طاقت کا لوہا خود بخود مانا جاتا ہے۔ بحریات جسے محض ایک انگریزی علم سمجھا جاتا تھا اب امریکیوں نے اُس کے تمام شعبوں پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ صدر جمہوریہ نے حال ہی میں اپنی ایک تقریر میں صاف صاف بتا دیا ہے کہ امریکہ کا بحری نصب العین یہ ہے کہ وہ دنیا کی کسی بحری طاقت سے پیچھے نہ رہے۔ ہوا میں تو انگلستان فرانس کے سامنے سرنگوں ہے ہی اب

سمندر میں وہ امریکہ کے آگے اپنی فوقیت کا نعرہ بلند نہیں کر سکتا۔ امریکہ کا قول ہے کہ مجھے جنگ سے مطلق سروکار نہیں میری طاقت صرف میری ذمہ داریوں کے لئے نشوونما پاتی ہے لیکن سیاست و تدبر کی دنیا میں کسی کے کہنے پر یقین کر لینا نادانوں کا کام ہے انگلستان جواب دیتا ہے میں بھی اپنے جہازوں کی تعداد میں جو اضافہ کروں گا وہ محض ضرورت کی بنا پر ہوگا نہ کہ اچھے دوست تمہارے مقابلے کی غرض سے۔ یہ کہہ سُن کر دونوں چہرے پر مسکراتے لیکن جی ہی جی میں کچھ گھبراتے ہیں۔

ہم نے انگلستان و امریکہ کا حال اس تفصیل سے بیان کیا ہے کیونکہ اگر انگلستان زمانۂ حال کی دولت ہے تو امریکہ مستقبل کی طاقت ہے۔ انگلستان ہوا ہے اور ہے۔ امریکہ ہو رہا ہے اور ہوگا۔

روس کی اشتراکی حالت کو ہم صرف اُس کے شاہی وجمہوری مخالفین کی عینک لگا کر دیکھنے پر مجبور ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اشتراکیت چھوٹے سرمایہ داروں کی متحمل بھی نہیں ہے اور ان کے بغیر ابھی اقتصادی زندگی ممکن نہیں نتیجہ تعمیر و تخریب کی کشمکش ہے۔ بیرونی دنیا میں روس اور انگلستان ایک دوسرے سے روٹھ چکے ہیں اور بالشویت اور انگریزیت ایک دوسرے کی جانی دشمن ہو رہی ہیں وہ اپنی دل آویز منصوبہ بندی سے اور یہ اپنی آرام دہ عملیت سے دنیا بھر کو اپنا بنا لینا چاہتی ہے۔

دنیا کی اکثر دولتیں بیش از بیش اس انقلاب انگیز جمہوریت سے خائف ہو رہی ہیں۔ ہاں چین کی طرح سیاسی فرقہ بندی میں اطالیہ کی طرح تجارتی جلبِ منفعت کے لئے اُس کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کی رغبت بعض قوموں میں ظاہر ہو رہی ہے۔

فرانس جرمنی کو فتح کر کے یورپ کی سب سے زبردست قوت بنا بیٹھا ہے اور باد کے گھوڑوں پر سوار ہو کر سمجھتا ہے کہ فرنساویت یورپیت کا عطر ہے۔ خوش قسمتی سے انگلستان کو جو اس معشوقانہ ناز و ادا کا متحمل نہ ہو سکتا تھا ایک ایسا حلیف مل گیا جو یورپ میں فرانس کا سب سے زیادہ خطرناک حریف بن گیا ہے۔

اطالیہ سیاسیاتِ یورپ کے میدان میں "فاسیت" کی تلوار تولے ہوئے فرانس کے مدمقابل آ اترا ہے اور زور کا جواب زور سے اور فریب کا جواب فریب سے دیا چاہتا ہے۔ مسولینی اطالوی ترقی کی راہ میں ہر دشمن کو پاؤں کے نیچے مسل ڈالنا اپنا حق جانتا ہے۔ سیاست میں کوئی اصول نہیں صرف مصلحتِ وقت کی پہچان اُس کی جان ہے۔

یورپ اس وقت سیاسی ریشہ دوانیوں کا اک اکھاڑا بن رہا ہے۔ ایک طرف فرانس بیٹھا ہے دوسری طرف اطالیہ۔ فرانس پولینڈ کو اُبھارتا ہے تو اطالیہ لتھوانیا کو اُکسا دیتا ہے۔ اطالیہ البانیا سے ساز باز کرتا ہے تو فرانس یگوسلاویا سے سرگوشیاں کرنے لگتا ہے کہ بھائی! میں تیری پشت پر ہوں۔

جرمنی انگلستان اور روس۔ فرانس اور اطالیہ سب کی رقابتوں سے فائدہ اُٹھا کر سب سے اقتصادی دوستی پیدا کر رہا ہے اور خاموشی سے اپنے برباد شدہ گھر کو آباد کئے جاتا ہے۔

جاپان تعلیمی و معاشرتی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

چین شمال وجنوب کی اینچا تانی میں نڈھال ہو رہا ہے۔ اِدھر انگلستان اُدھر روس پرا جمائے بیٹھا ہے اور دونوں اپنی اپنی چالیں چل رہے ہیں۔

ترکی ۔ ہر قسم کی آزادی کو دنیا کی بہترین چیز سمجھ کر اُسے قانونی طور پر اپنے روح و رواں سے عزیز تر ظاہر کرنے پر مُصر ہے۔

ایران اور افغانستان شاہنشاہوں اور اشتراکیوں کو کنکھیوں سے دیکھتے جاتے ہیں اور جتنا کام اُن سے بن پڑتا ہے کئے جاتے ہیں۔

ہندوستان دنیا و مافیہا سے بےخبر ہے اُس کا پُرانا شغل لڑنا بھڑنا اُسے پھر ہاتھ آگیا ہے مسلمان اللہ اللہ کہہ کر گائے کے سر پر سوار ہوتے ہیں تو ہندو رام رام کر کے مسجد کے آگے شور مچاتے جاتے ہیں۔ حضرتِ ثالث بالخیر چوک میں بیٹھے "ہم لڑائی نہیں مانگتا" کہہ کر کبھی کبھی اپنا ڈنڈا زمین پر مار دیتے ہیں لیکن اِس سے کسی فریق کی حق تلفی یا دل آزاری نہیں ہوتی!

دُنیا جادۂ "تہذیب" پر سرگرم سفر ہے۔

طبیعی ترقی کا یہ عالم ہے کہ اکثر اہلِ دنیا ابھی دس سال گزشتہ کی ایجادات کے نام سے بھی واقف نہیں ہو چکتے کہ نئی اختراعات کا ایک طوفان امنڈ آتا ہے۔ دنیا طبیعیات کے افادات سے کما حقہ مستفید نہیں ہو رہی۔ موٹر کار ولاری، ہوائی جہاز کی ارزانی اور تیز رفتاری، گھر گھر میں خبر رساں کلوں کا قیام، بے تار ٹیلیفون اور بیسیوں ویسی سہولتیں دنیا کو روز بروز ایک نئی دنیا بنا رہی ہیں۔

معاشرتی حلقے میں عورت کا درجہ سرعت کے ساتھ بلند تر ہوا جا رہا ہے۔ نوجوانوں میں خود شناسی اور خودداری کے ساتھ خود سری اور خود نمائی کی عادات نمایاں ہو رہی ہیں۔ لباس و گفتگو کی ظاہری شان عموماً باطنی خوبیوں کو نیچا دکھاتی ہے۔

اقتصادی حالت میں بہتری کی صورت ظاہر ہے لیکن اس کی رفتار بہت سست ہے۔

سیاسیات میں ایک تنگ نظر قومیت انسانیت کی ترقی کے رستے میں حائل ہے اور ساتھ ہی ایک غلط کار اشتراکیت ایک غلط کار شاہنشاہیت سے مصروفِ پیکار ہے۔ ملک ملک میں استبداد پسند مدبر برسرِ اقتدار ہو رہے ہیں۔ جمہوریت پسند یورپ میں بھی، اطالیہ میں مسولینی اور سپین میں ڈی ولیرا عوام کی آزادی کو پاؤں کے نیچے روندے ڈالتے ہیں۔

اخلاقی و مذہبی دائرے میں آزاد خیالی بے اصولی کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ اور روحانیت کی آواز کچھ کمزور سی پڑ گئی ہے لیکن گھڑی کا رقاص جب ایک انتہائی حد تک پہنچ جائے تو پھر دوبارہ واپس ہوتا ہے۔ سو یقیناً یہ سب تنزل و انحطاط بھی اسی لئے ہے کہ دنیا کی روح کھوئی جا کر پھر جلد اُس کے جسم کے ہر رگ و پے میں از سرِ نو سرایت کر جائے اور اُسے دوبارہ زندہ و قوی تر بنا دے!

ب ا

تمنّائے محبّت

اے کاش کہ میں اور تُو — اے کاش کہ تُو اور میں
اِس بزم سے چل نکلیں

اِس رُوح کے زنداں میں — اِس دل کے بیاباں میں
ہر دم کوئی کھٹکا ہے — ہر دل میں غم اٹکا ہے
بچّے ہیں قضا کے ہم — بندے ہیں جفا کے ہم
انسان ہے اِک مزدُور — مقہور ہے اور مجبُور
پاتا ہے تو کھوتا ہے — ہنستا ہے تو روتا ہے
گو اشک پروتا ہے — ہونا ہے جو ہوتا ہے

اِس دارِ مشقّت میں — اِس دشتِ مُصیبت میں
تہذیب کی شورش ہے — تادیب کی کوشش ہے

مشغول ہیں روز و شب — مسئول ہیں روز و شب
بھرمار فرائض کی — بوچھاڑ عرائض کی
گو لطف کی محفل ہے — گو عیش کی منزل ہے
شائستہ تکلّم ہے — گلدستہ تبسّم ہے
باتوں میں ہے رنگینی — آنکھوں میں ہے شیرینی
لیکن جو ٹٹولو دل — اک پارۂ آب و گل
چاہت نہیں دُنیا میں — راحت نہیں دُنیا میں
اُلفت کا بہت مذکور — ایثار بہت مشہور
اقرار کے چرچے ہیں — اخلاص کے دعوے ہیں
دیکھو جو مُروّت کو — ڈھونڈو جو محبّت کو
گُزرے نہ گماں ان کا — پاؤ نہ نشاں ان کا
مسکن ہے کہاں ان کا — مدفن ہے کہاں ان کا
اے کاش کہ میں اور تُو — اے کاش کہ تُو اور میں

اِس بزم سے چل نکلیں

اے کاش کہ میں اور تُو اے کاش کہ تُو اور میں
اِس شور و شغب سے دُور اِس رنج و طرب سے دُور
اُس جا پہ پہنچ جائیں

جو حُسن کا گلشن ہے جو عشق کا مسکن ہے
کِھلتی ہے جہاں اُلفت ملتی ہے جہاں راحت
غُنچوں میں ہے زیبائی پُھولوں میں ہے رعنائی
کیا حُسن نُمائی ہے گُل ریز خُدائی ہے
اے کاش کہ تُو اور میں اے کاش کہ میں اور تُو
اُس دیس میں بس جائیں کیوں جگ میں ترس جائیں؟

اے کاش کہ میں اور تُو اے کاش کہ تُو اور میں
اُس خُلد میں جا اُتریں

کچھ دن تو جئیں مِل کر گلزار ہوں دل کِھل کر
تاروں سے کریں باتیں کٹ جائیں یونہی راتیں
میری کہ تری ہستی نیکی کی بنے بستی

اک ہار ہو رنگوں کا — پھولوں کی اُمنگوں کا

شبنم سے جو دھویا ہو — کرنوں نے پرویا ہو

تیری ہو وہ آرایش — تیری ہو وہ زیبایش

کلیاں تجھے پہنا ئیں — چڑیاں ترے گُن گائیں

شورش ہو روانی میں — اک راگ ہو پانی میں

منظر ہو مسرّت کا — عالم ہو محبّت کا

نغمہ ہو صداقت کا — نعرہ ہو شجاعت کا

حاصل کریں قوّت کو — اور پائیں حقیقت کو

ہر جا تری خلوت ہو — ہر جا تری جلوت ہو

تُو مجھ پہ جو چھا جائے — تن من میں سما جائے

تُو میں ہوں نہ میں تُو ہوں — ہم یک دل و یک سُو ہوں

اے کاش کہ میں اور تُو — اے کاش کہ تُو اور میں

اک پھول سا ہو جائیں
نکہت بنیں کھو جائیں

بشیر احمد

تاریخِ دُنیا پر ایک نظر

دُنیائے قبلِ تاریخ

(۱)

مکان و زمان کی وسعتیں

کائنات۔ ابھی تھوڑی مدت ہُوئی کہ لوگ عام طور پر زمین کو کائنات کا مرکز مانتے تھے۔ اور اُن کا خیال تھا کہ کائنات کو وجود میں آئے چھ ہزار سال سے زیادہ عرصہ نہیں ہُوا۔ لیکن موجودہ ماہرانِ طبیعیات کے خیالات اِن حقائق کے متعلق بالکل تبدیل ہو چکے ہیں جن کے باعث زمان و مکان کے متعلق اب قطعی نئے نظریات قائم کئے گئے ہیں۔ فضا کی بے انتہا وسعت کی طرف پہلے پہل سولھویں اور بعد کی صدیوں کے اہلِ ہیئت نے توجہ دلائی اور بتایا کہ (۱) زمین ایک متحرک گولہ ہے۔ (۲) وہ سورج کے گرد گھومنے والا ایک چھوٹا سا سیارہ ہے (۳) سورج خود بھی محض ایک اوسط درجے کا ستارہ ہے جو آسمان کے بہت سے اَور ستاروں سے کم جسیم اور کم چمکدار ہے۔ زمانے کی بے انتہا وسعت کی طرف پہلے اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے اہلِ حجریات متوجہ ہوئے اور انھوں نے بتایا کہ تہ در تہ چٹانیں جن سے زمین کی پرت مرکب ہے خدا جانے کتنے کروڑ سالوں میں جا کر بنی ہونگی۔

حال میں بہت سے فہیم و ذکی ماہرانِ طبیعیات نے سرتوڑ کوشش کی ہے کہ وہ مرئی کائنات کی وسعت اور زمانِ فلکی کی مدت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگائیں۔ اگرچہ ابھی اُن کے انکشافات کی ابتدا ہی ہے لیکن ان کی دریافت شدہ معلومات نے ہماری عقل کو حیران اور ہمارے تخیل کو متہیج کر دیا ہے۔ ہمارے نفس ان اعداد کی وسعت پر حاوی نہیں ہو سکتے جو وہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

سورج زمین سے تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ مسافت ہمارے لئے سخت حیرت انگیز ہے لیکن

تاریخی مضامین کا یہ سلسلہ جو مختصر تاریخ دنیا پر مشتمل ہے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے لیکن آگے چل کر دو چار مقامات میں مشرقی نقطۂ نظر سے بُزوی تصرف کیا گیا ہے۔

جب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ روشنی جو ایک ثانیے میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی رفتار سے اس فاصلے کو تقریباً آٹھ منٹ میں طے کر لیتی ہے اُسے بھی قریب ترین ستارے سے زمین تک پہنچتے چار برس سے زائد مدت درکار ہے اور کہکشان کے گنجان کوکبات ہم سے چار ہزار "روشنی کے سالوں کی مسافت" پر واقع ہیں تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور ہمارا سورج اور ہماری زمین ہمیں ایک ہی کوچے کے قریبی ہمسائے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ پھر ہیئت دان ہمیں بتاتے ہیں کہ سورج اور زمین ایک زمانہ میں ایک ہی وسیع اور دقیق سحابیہ میں شامل تھے لیکن اُن کو ایک دوسرے سے جدا ہوئے تیس ارب سال گزر چکے ہیں۔ ان محیر العقول حقائق کے بعد زمین نقطۂ غیر محدود کا اک نامعلوم سا نقطہ معلوم ہونے لگتی ہے اور نسلِ انسانی کی ساری تاریخ ازل کا ایک فانی لمحہ!

نظامِ شمسی ۔ زمین کیا ہے ؟ اُن آٹھ سیّاروں میں کا ایک سیارہ جو روز و شب سورج کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ بُعدِ مسافت کے لحاظ سے یہ سیارے یُوں واقع ہوئے ہیں۔

عُطارد سورج سے تین کروڑ ساٹھ لاکھ میل ہے۔

زہرہ چھ کروڑ ستر لاکھ

زمین نو کروڑ تیس لاکھ

مریخ ایک ارب چار کروڑ دس لاکھ۔

مشتری چار ارب آٹھ کروڑ تیس لاکھ

زحل آٹھ ارب آٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ

یورنیس سترہ ارب آٹھ کروڑ بیس لاکھ

نیپتون ستائیس ارب نو کروڑ بیس لاکھ

عطارد کے ہماری بہ نسبت سورج کے زیادہ نزدیک ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اُس کا سال صرف ۸۸ دن کا ہے اس کے مقابل میں نیپتون کا سال ۶۰۱۲۷ دن کا ہوتا ہے یعنی ہمارے ۱۶۴ سالوں میں جا کر نیپتون سورج کے گرد بمشکل اپنی ایک گردش پُوری کرتا ہے۔

جسامت میں عطارد مریخ اور زہرہ زمین سے چھوٹے اور باقی ماندہ اس سے بہت زیادہ بڑے ہیں۔ سیاروں میں سب سے چھوٹا عطارد زمین کا تیسواں حصہ ہے اور سب سے بڑا مشتری زمین سے ۱۳۰۰ گنا زیادہ بڑا ہے۔ اکثر سیاروں میں گرمی اس قدر ہے کہ وہاں دنیاوی نوع کی زندگی ناممکن ہے۔ صرف مریخ ایک ایسا سیارہ ہے جہاں زندگی کا ہونا ممکن

سمجھا گیا ہے۔ لیکن ہماری تحقیق فی الحال اس بات پر قطعی ہے کہ کائنات بھر میں صرف زمین ہی ایک آباد خطہ ہے۔

یہ سارا نظام شمسی مع اپنے سورج سیاروں اور توابع واقمار کے فضا میں اک حیرت انگیز سرعت کے ساتھ کسی نامعلوم مدار میں جس کی ماہیت ابھی معلوم نہیں ہوسکی محو گردش ہے لیکن کائنات کی دوریاں اس قدر تحیر خیز ہیں کہ اگر ہرشل کے خیال کے مطابق یہ رفتار بیس ہزار میل فی گھنٹہ بھی ہے تو کروڑوں سال چلنے پر کہیں سورج اور اُس کے حواری قریب ترین ستارے کے کچھ قریب پہنچ سکیں گے۔

زمین ۔زمین جب سورج سے جُدا ہوئی تو کروڑوں سال تک وہ ایک گیسی یا نیم سیّال حالت میں رہی۔اس میں گرمی اس قدر تھی کہ پانی دھاتیں اور چٹانیں تک سب ایک عظیم الشان بھٹی میں خلط ملط ہورہی تھیں۔ بتدریج شدید زلزلوں کے ساتھ وہ ٹھنڈی پڑتی گئی۔عناصر جدا جدا ہوئے ایک ٹھوس پرت بنتی گئی اور آخر کار زمین اور سمندر ظاہر ہوئے۔ان تبدیلیوں کے دوران میں چاند زمین کے بطن سے پیدا ہوا۔چونکہ اس کی جسامت زمین سے صرف پچاسواں حصہ تھی۔وہ بہت جلد سرد ہوگیا یہاں تک کہ آج اُس میں اولین گرمی کا شاید کچھ بھی نشان باقی نہیں رہا۔ بعض طبیعیین کا خیال ہے کہ چاند زمین کا وہ حصہ تھا جہاں اب بحرالکاہل واقع ہے۔

زمین کے سرد پڑنے کے ساتھ ساتھ دو تغیرات ہوتے گئے۔ایک یہ کہ زمین سورج سے دور ہوتی گئی۔ پہلے زمین تھوڑے عرصے میں سورج کے گرد گھوم لیا کرتی تھی اب یہ مدّت بڑھتی گئی یہاں تک کہ ہمارا سال ۳۶۵ دن کا ہوگیا۔ دوسرے زمین اپنے محور کے گرد پہلے تھوڑی دیر میں گھوم جایا کرتی تھی اب اس گردش میں ہمارے موجودہ دن رات کے چوبیس گھنٹے صرف ہونے لگے۔ یہ بات یاد رہے کہ یہ سب تبدیلیاں اب بھی جاری ہیں۔اب بھی ہمارے دن رات کی مدت زیادہ لمبی ہورہی ہے۔اب بھی ہمارے سال کے دن بڑھتے جاتے ہیں۔لیکن اس تغیر کی رفتار اس قدر دھیمی ہے کہ ہماری آنی جانی دنیا کو اس کا احساس ہونا ناممکن ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ کروڑوں اربوں سال کے بعد کبھی وہ زمانہ آئے گا، جب زمین اس قدر سرد، رات اتنی طویل اور سال اتنا لمبا ہوچکا ہوگا کہ زمین نوعِ انسان کے رہنے سہنے کے قابل نہ ہوگی بلکہ کسی قسم کی زندگی کا قیام بھی یہاں ناممکن ہوگا۔ دنیا کی تاریخ کی ساری مدت العمر شروع سے اخیر تک کائنات کی تاریخ میں سوائے ایک مختصر لمحہ کے اَور کچھ بھی نہیں۔اب بھی زمین اپنی جوانی سے گزر چکی ہے۔اس کے اندر حرارت یا روشنی کا کوئی اپنا ذخیرہ باقی نہیں رہا۔ضیا وحیات حرارت وتوانائی ان سب کے لیے وہ تقریباً قطعی طور پر سورج کی دست نگر ہے۔یہ سورج ہی کا تعلق ہے جس سے اُس کے دن رات اُس کے موسم اور اُس کی آب وہوا کا تنوّع پیدا ہوتا ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ قدیم انسان سورج کا پرستار تھا۔

خشکی اور تری - ماہرانِ ارضیات نے معلوم کیا ہے کہ پرانے زمانوں میں زمین کی سطح پر عظیم الشان تبدیلیاں ہوئیں - ہیبت ناک زلزلے، دہشت خیز آتش فشانیاں، اور خوفناک طوفان اُٹھتے تھے - کہیں سمندروں کی عمیق و وسیع وادیاں بنتی تھیں - کہیں پہاڑوں کے طویل و عریض سلسلے قائم ہوتے تھے - ان تند مزاج قوتوں کے ساتھ ساتھ وہ نرم وسبک طاقتیں بھی عمل پیرا تھیں جن کا کام روزمرہ ہماری آنکھوں کے سامنے جاری رہتا ہے - بالخصوص بارش اور ہوائیں، کہر اور برف، سورج اور چاند - یہ برّاعظم اور سمندر جو ہمارے نقشوں پر جلوہ گر ہیں فقط اک عارضی عظمت والے ہیں - برطانیہ کا جزیرہ ایک وقت میں سمندر کی تہ پر تھا - اور ایک زمانے میں وہ برف کے ملبوس میں مستور ہو چکا تھا - ہمارے زمانے میں بھی ہر روز ہر خطّہ زمین میں خاموش تغیرات وقوع میں آتے رہتے ہیں جن کا علم ہمیں کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا - اور گاہے گاہے خوفناک حادثات بھی پیش آجاتے ہیں جیسے حال ہی میں جاپان میں ہُوا - اس میں شبہ نہیں کہ ان تبدیلیوں کی وجہ سے جواب بھی زمین اور سورج میں واقع ہو رہی ہیں برف اور سمندر ایک روز پھر اپنی کھوئی ہوئی مملکت پر قبضہ پالیں گے -

سب سے پہلا سبق جو ہم ان تغیرات سے حاصل کرتے ہیں یہ ہے کہ بقول قدیم یونانیوں کے اس دنیا کی سب چیزیں ہر لحظہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں - اور کسی مادّی شئے کو ثبات نہیں - اگر یہ بات ہمیں اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے گی تو ہم واقعات کی اصلیت اور اہمیت کا بخوبی اندازہ کر سکیں گے اور جان لیں گے کہ انسانی شان و شوکت اور زور و قوت کس قدر غیر اہم اور بے بنیاد ہیں - اور انسان کے لئے سچی عظمت کا راز کس شے میں پوشیدہ ہے !

---

(۲)

دُنیا ظہورِ انسان سے پہلے

طلوعِ زندگی - یہ بتانا ناممکن ہے کہ زندگی زمین پر پہلے پہل کب ظاہر ہوئی - بعض طبیعیین نے اندازہ لگایا ہے کہ اِس کا ظہور اسّی کروڑ سال ہوئے وقوع میں آیا - وہ اِس امر کے معترف ہیں کہ شاید اُنکا اندازہ حقیقت سے بعید ہو ممکن ہے کہ یہ اندازہ بہت زیادہ ہو لیکن اغلب یہ ہے کہ یہ بہت کم ہو کیونکہ پہلی ہستیاں نرم اور بے صورت تھیں جو پیدا ہو کر جھٹ پٹ فنا بھی ہو جاتیں - اور اُن کا کچھ نشان باقی نہ رہتا - لیکن اِس بات کا اُن کو یقین ہے کہ زندگی

کی پہلی صورتیں گرم و کیاب سمندروں کے ساحلی پانیوں میں پیدا ہوئیں۔ اور کچھ مدت کے بعد انہوں نے ننھے پودوں اور چھوٹے چھوٹے لعاب نما جانداروں کی شکل اختیار کی۔ طبیعیات زندگی کی حقیقت کو نہیں پا سکا۔ صرف وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ان جاندار چیزوں کی خصوصیات کیا تھیں۔ اول جاندار چیزیں حرکت کرتی ہیں۔ خواہ یہ حرکت صرف نشوونما ہی کی ہو۔ دوم وہ کھاتی ہیں۔ یعنی اور چیزوں کو خوراک بنا کر اپنا جزو بنا لیتی ہیں۔ سوم۔ وہ جنتی ہیں یعنی اُن کی سی اور ہستیاں اُن سے رونما ہوتی ہیں۔ یہ ہستیاں ان سے مشابہ ہوتی ہیں لیکن بعینہ ان کی مانند نہیں ہوتیں۔ ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہ ہے ارتقا کی کنجی۔ اگر ایک شے سے دوسری شے بالکل پہلی کی مانند ہی پیدا ہوتی تو ترقی ناممکن تھی۔ کسی نامعلوم سبب کا نتیجہ ہے کہ گھاس کے کوئی سے دو تنکے کوئی سے دو کیڑے۔ کوئی سے دو جانور قطعی یکساں نہیں ہوتے۔ ہر فرد میں کوئی نہ کوئی اختلاف۔ کوئی نہ کوئی جدّت ضرور ہوتی ہے۔ بعض حالتوں میں یہ اختلافات ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے میں بغایت معاون ہوتے ہیں۔ روشنی، گرمی، ہوا، خوراک اِن سے حسبِ ضرورت فائدہ اٹھا کر زندگی کی اسفل صورتیں بتدریج اعلیٰ صورتوں میں تبدیل ہوتی جاتی ہیں۔ اور اس طرح زندگی یکے بعد دیگرے ترقی کے مدارج طے کرتی چلی جاتی ہے۔

مچھلیوں کا زمانہ۔ اُن ابتدائی سمندروں کے ساحلی پانیوں میں جہاں زندگی پہلے پہل ظاہر ہوئی جہد للبقا کے باعث دو قسم کی حرکتیں رونما ہوئیں۔ ایک خشک تر ساحل کی طرف۔ دوسری عمیق تر سمندر کی جانب۔ کچھ جانور جو اپنے خول اور غلاف کے ساتھ سورج اور کہر کی سختیوں کو زیادہ اچھی طرح برداشت کر سکتے تھے خشک زمین کی طرف چلے اور کچھ جن کا ڈھانچا کرخت ہو گیا تھا گہرے سمندر میں جا پہنچے۔ اسی طرح لعابی مچھلیاں بحری کیڑے اسفنج وغیرہ ظہور میں آئے۔ اور آخر کار اصلی مچھلیاں (جو سب سے پہلے ریڑھ دار جانور تھے) پیدا ہو کر رفتہ رفتہ جسامت میں بڑھیں اور سمندروں کی سردار بن گئیں۔

پھر خشکی پر ادنیٰ قسم کے پودے مثلاً فرن اور دوسرے بے پھول پودے جو تھوڑے پانی میں گزر اوقات کر سکتے تھے ساحل سے اونچی زمینوں کی طرف اُبھرے اور دلدلی مچھلیاں جن میں ہوا کے لئے پھیپھڑے اور پانی کے لئے گلپھڑے تھے خشکی کی جانب لپکیں۔ پودے اونچائی اور تعداد میں بڑھے، یہاں تک کہ اُن سے وہ وسیع جنگل بن گئے جن کی یادگار ہماری کوئلوں کی کانیں ہیں۔ جانور جو ان جنگلوں میں رہتے تھے زیادہ تر وہ دوعنصری تھے جن کا آج وجود نہیں۔ ان کے ساتھ لاتعداد حشرات الارض بھی تھے۔ مثلاً بڑے بڑے مکڑے اور وہ تند بڑی مکھیاں جن کے پر دو فٹ چوڑے تھے بتیس کروڑ سال ہوئے کہ زمین کی آبادی کا یہ حال تھا۔

حشرات الارض کا زمانہ۔ جنگلات اور دو عنصریوں کا طویل زمانہ آخر ہوا تو کم از کم شمالی کرۂ ارض میں سخت سردی کا ایک طویل دور شروع ہو گیا۔ ان برفانی حالتوں میں بہت سے گرمی پسند پودے اور جانور تباہ ہو کر زمین سے نیست و نابود ہو گئے۔ دنیا کی تری سمٹ کر تھوڑی سی رہ گئی اور اغلب ہے کہ آسٹریلیا، ہندوستان، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے متفرق خطہ ہائے زمین باہم مل کر ایک ہی وسیع براعظم بن گئے۔ نئے قسم کے جاندار پیدا ہوئے جو ان نئے اور دشوار حالات میں زندہ رہ سکتے تھے۔ جنہیں پانی کے قرب یا موجودگی کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ جو محض خشک زمین پر رہ کر زندگی گزار سکتے اور بآسانی اپنی نسل بڑھا سکتے تھے۔ یعنی رینگنے والے جانوروں کا زمانہ شروع ہو گیا تھا۔ جن میں کیکڑے مگرمچھ چھپکلیاں اور سانپ تھے۔ جو بجائے بچوں کے انڈے دیتے تھے۔ اسی وقت میں وہ مخروطی درخت بھی نظر آئے جو بعد میں ہمارے چیل اور چلغوزے بنے۔ جوں جوں لاکھوں سال کی مدت میں سردی بتدریج کم ہوتی گئی حشرات الارض جسامت و تعداد میں روز بروز بڑھتے گئے۔ ان میں تھے وہ عظیم الجثہ جانور "دائنوسارس" جن کے بڑے بڑے پنجر آج ہمارے بعض عجائب خانوں میں نظر آتے ہیں۔ اور جن کے انڈے تھوڑی مدت ہوئی ایشیا کے صحراؤں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ایسے ہی تھے "منارودکتل" جنہوں نے پہلے پہل اُڑنا سیکھا بعد کے پرندے اور شیر خوار جانور انہیں ناپید جانوروں کی نسل سے تھے۔ زمانۂ حشرات کو ختم ہوئے سات کروڑ سال گزر چکے ہیں۔

شیر خواروں کا زمانہ۔ ان دونوں زمانوں کے درمیان میں کھریا مٹی کا زمانہ حائل تھا جس میں شمالی کرۂ ارض سمندر کے نیچے جا ڈوبا اور لاکھوں سال تک ڈوبا رہا۔ انگلستان اور فرانس کے کھریا مٹی کے خطے اور سفید ٹیلے اسی زمانے کے لاتعداد ننھے ننھے جانداروں کی یادگار ہیں۔ جو جو زمینیں طوفانوں کی غرق آبی سے بچیں۔ وہاں شیر خواروں نے اپنا قدم جمایا۔ شیر خوار اور حشرات میں یہ باتیں مابہ الامتیاز تھیں۔ شیر خواروں کے بال تھے جو انہیں سخت گرمی و سردی سے بچانے میں مدد دیتے تھے۔ دوسرے ان کے بچے بجائے انڈوں کے ان کے جسم کے اندر ہی سے نشوونما پا کر نکلتے تھے۔ تیسرے یہ اپنے بچوں کو دودھ دیتے تھے۔ اور ان کی حفاظت کر کے انہیں دنیا میں رہنے سہنے کے ایسے طریقے بتاتے تھے جو وہ نسلاً بعد نسل سیکھتے آتے تھے۔ ان میں وہ سبھی جانور تھے جن سے آج ہمیں واسطہ پڑتا ہے قدیمی کتا اور بھیڑیئے کی قسم کے جانور۔ قدیمی بلی اور شیر کی قسم کے جانور۔ قدیمی گھوڑا اور گدھا۔ ہاتھی اور اونٹ۔ بیل اور بھیڑ وغیرہ وغیرہ۔ اس زمانے کے اخیر میں بندروں اور لنگوروں کی ٹولیاں نمودار ہوئیں جو خونخوار درندوں سے بچنے کے لئے درختوں میں بسر اوقات کرتے تھے۔ یہ تھے وہ جانور جن کے سر بڑے اور پختہ تھے۔ ان میں عقل اور چالاکی پائی جاتی تھی۔ جس کے بل پر وہ دنیا کے کارزار میں زیادہ مضبوط اور قوی ہیکل جانوروں کے خلاف زندگی کی جنگ میں پورے

اُترے۔ اکثر طبیعیین کا خیال ہے کہ انسان انہیں کی نسل سے پیدا ہوُا۔

(۳)

ازمنۂ حجریہ

عہدِ برفانی - مغربی طبیعین کے مشکوک اندازے کے مطابق انسان اپنے بندر بزرگوں میں سے پانچ لاکھ سال ہوئے، اور بعض کے خیال کے مطابق دس[1] لاکھ سال ہوئے رونما ہوُا۔ یہ بات درست ہو یا نہ ہو یہ وہی وقت تھا جب سخت سردی کا وہ نیا زمانہ شروع ہوُا جسے "زمانۂ برف" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بحرِ منجمد شمالی سے برف کے پہاڑ جنوب کی طرف سرکنے شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ برطانیہ سے لیکر دریائے ڈنیوب بحرِ اسود اور بحرِ اخضر تک کے خطّے سب برف سے ڈھک گئے۔ برطانیہ میں جو کسی زمانے میں شیر ببر ہاتھی اور گینڈے پائے جاتے تھے وہ سب اسی شدید سردی سے تباہ ہو گئے۔ یا جنوبی ملکوں کی طرف بھاگ گئے۔ ان جدید حالات میں خوراک اور پناہ گزینی کے لئے ایک سخت جہد للبقا شروع ہوئی۔ بالخصوص بندر کی قسم کے جانور تباہی سے بچنے کیلئے وسط ایشیا کے لق و دق میدانوں کی طرف چل دیئے۔ اکثر طبیعین کے خیال کے مطابق یہی وہ مقامات تھے جہاں پہلے پہل انسان ظہور میں آیا۔ حیوانیت سے انسانیت میں تبدیلی اس قدر آہستہ اور تدریجی تھی کہ ہزاروں سال تک کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ کونسا حیوان ہے اور کونسا انسان۔ لیکن بالآخر امتیازی خصوصیات اظہر من الشمس ہو گئیں۔ انسان کا دماغ بہ نسبت حیوان کے زیادہ بڑا اور بہتر تھا۔ وہ زیادہ سیدھا ہو کر چلتا تھا۔ اس کا ہاتھ کام کاج کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ وہ ہتھیار چلا اور بنا سکتا تھا۔ اس کے اعضائے کلام و گفتگو زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ وہ جانوروں کو گھر میں پال سکتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل کر کام کر سکتا۔ اور جماعتیں بنا سکتا تھا۔ ان صفات کی اعانت سے اس نے اپنی کمزوری، سست رفتاری۔ اور بے پناہی کا تدارک کیا اور بتدریج زمین اور اہلِ زمین پر غلبہ پانا شروع کر دیا۔

ابتدائی انسان - عہدِ برفانی جو پانچ لاکھ سال ہوئے شروع ہوُا وہ تھوڑی گرمی کے وقفوں کے ساتھ تقریباً

---

[1] مشہورۂ آفاق ماہر علم الانسان مسٹر آرتھر کیتھ نے ۳۱ اگست ۱۹۲۷ء کو برٹش ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس کے سامنے اپنے خطبۂ صدارت میں ڈارون کے مسئلۂ ارتقا کی پُرزور حمایت کرتے ہوئے اس مدت کو دس لاکھ سال سے تعبیر کیا۔

پچیس ہزار ق م تک جاری رہا۔ یہ وقفے ہمارے انسانی معیار کے مطابق خاصے طویل تھے اوران کا وجود انسانی نسل کے لئے غایت درجہ نفع رساں ثابت ہوا۔ قدیم ترین انسانی اور نیم انسانی آثار انہیں زمانوں کی یادگار ہیں۔ عہدِ برفانی کی تقسیم یوں کی گئی ہے۔

عہدِ برفانی

پہلا عرصۂ برفانی	تقریباً	۵۰۰،۰۰۰ ق م سے ۴۷۵،۰۰۰ ق م تک
پہلا گرم وقفہ	"	۴۷۵،۰۰۰ سے ۴۰۰،۰۰۰ تک
دوسرا عرصۂ برفانی	"	۴۰۰،۰۰۰ سے ۳۵۰،۰۰۰ تک
دوسرا گرم وقفہ	"	۳۵۰،۰۰۰ سے ۲۰۰،۰۰۰ تک
تیسرا عرصۂ برفانی	"	۲۰۰،۰۰۰ سے ۱۵۰،۰۰۰ تک
تیسرا گرم وقفہ	"	۱۵۰،۰۰۰ سے ۵۰،۰۰۰ تک
چوتھا عرصۂ برفانی	"	۵۰،۰۰۰ سے ۲۵،۰۰۰ ق م تک

بعض ماہرانِ حجریات کا خیال ہے کہ آج کل ہم چوتھے گرم وقفے میں ہیں۔ اور ۵۰،۰۰۰ سال کے بعد ایک پانچویں عرصۂ برفانی کا آغاز ہوگا۔ ایسا ہو بھی تو یہ کچھ نئی بات نہیں کیونکہ نسلِ انسانی کو اپنی تاریخ میں بسا اوقات گرم و سرد زمانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور اس نے اپنے تئیں ہمیشہ حالاتِ مختلفہ کے مطابق بنالیا ہے۔

سب سے پرانا آثار انسانی وہ ہے جو فرانسیسی ماہر حجریات ڈاکٹر یوجین ڈوبوآ نے ۱۸۹۲ء میں بمقام ٹرنیل دریافت کیا اور جسے "جاوا کا بندر نما انسان" کہا گیا ہے۔ یہ کھوپری کا ایک حصہ ہے جس کی دماغی قابلیت بندر اور انسان کے بین بین معلوم ہوتی ہے۔ اور جسے بوجہ اُن معدنی چیزوں کے جس کے ساتھ وہ پائی گئی ڈاکٹر موصوف نے پانچ لاکھ سال ق م کے زمانہ سے منسوب کیا ہے۔

اس کے بعد کا آثار وہ ہے جسے "ہائیڈل برگی انسان" کہتے ہیں۔ اور جسے ۱۹۰۷ء میں چند کاریگروں نے مَور میں سطحِ زمین سے اسی فٹ نیچے پایا۔ پنجر کے ساتھ اُن ہاتھیوں، گینڈوں اور غاروں کے رہنے والے شیر ببروں وغیرہ کے پنجر پائے گئے جو ایک مدتِ مدید سے روئے زمین پر ناپید ہو چکے ہیں۔ ان کا زمانہ تقریباً ۲۵۰،۰۰۰ کا ہے۔

تیسرے درجہ پر "پلٹڈاؤن انسان"، ہے جسے مسٹر چارلس ڈوسن نے ۱۹۱۲ء میں پایا۔ غالباً اس کا زمانہ ۱۰۰،۰۰۰ ق م کا ہے۔

قدیم زمانہ حجریہ - جب ہم ایک لاکھ سال ق م پر پہنچتے ہیں تو ہمیں پتھر کے اور دوسرے آلات ملتے ہیں جن سے ہمیں اس وقت کے انسان کی صلاحیتوں اور بود و باش کا پتہ چلتا ہے - سب سے پرانے پتھر کے آلات اُن دریاؤں کے پاٹ میں پائے گئے ہیں جو مدتیں ہوئیں کہ گم ہو گئے یا جنہوں نے اپنا پاٹ بدل لیا - یہ ہیں دستی کلہاڑیاں جنہیں ایک دوسرے پتھر سے رگڑ کر تیار کیا گیا - اور کُھرپیاں جن کی دھاریں تیز کی گئی تھیں -

۵۰،۰۰۰ ق م سے زیادہ عمدہ آلات ملتے ہیں جو اُن بڑی قدرتی غاروں سے دستیاب ہوئے ہیں جن میں انسان نے چوتھے عرصۂ برفانی کی سردی سے پناہ لی - نہ صرف یہ آلات پہلے سے بہتر ہیں بلکہ ان کے ساتھ کہیں کہیں ہڈی کے آلات بھی پائے گئے ہیں - ایک عرصہ گزرنے پر شاید ۲۰،۰۰۰ ق م میں انسان نے آگ جلانا سیکھا بعض پرانی غاروں میں ایسی آگ کے نشان پائے گئے ہیں جو غالباً سو سو سال تک جلتی رہی - انہیں غاروں سے انسانی نقاشی کی اولین مساعی کا پتہ ملتا ہے - غاروں کی دیواروں پر بارہ سنگے اور دوسرے وحشی جانوروں کی تصویریں ہیں جن سے انسان واقف ہو چکا تھا۔ اور جن سے اس کے خوراک و لباس مہیا ہوتے تھے -

غالبًا ۱۰،۰۰۰ ق م میں جب کہ موجودہ گرم زمانہ کا ایک خاصا حصّہ گزر چکا تھا - انسان نے غاروں کی رہائش چھوڑ دی -

جدید زمانہ حجریہ - ہزاروں سال گزرنے پر جدید زمانہ حجریہ کا آغاز ہوا - دنیا کے مختلف حصّوں میں یہ مختلف اوقات میں شروع ہوا - سب سے پہلے اس کی ابتدا مشرق میں ۱۲،۰۰۰ ق م میں ہوئی - مغرب میں غالبًا اس کا زمانہ ۸،۰۰۰ ق م کا ہے - اس جدید زمانے میں قدیم زمانے کے مقابل میں بعض امتیازی خصوصیات تھیں - اول معتدل آب و ہوا کے دو نتائج ہوئے - ادھر وسیع برفانی میدانوں کے پگھلنے سے سمندر پھر بھرنے شروع ہوئے - برطانیہ براعظم سے جدا ہو گیا - بحیرۂ بالٹک بحرِ شمالی سے مل گیا اور بحرِ متوسط کی جھیلیں ایک دوسرے سے اور بحرِ اوقیانوس سے واصل ہو گئیں - ادھر جنگل پھر روز بروز پھیلنے لگے یہاں تک کہ بارہ سنگے اور اس کے شکاریوں نے شمالی ملکوں کا رخ کیا - دوسرے جنوبی ملکوں کے رہنے والے تبدیلیٔ موسم کے باعث شمالی خطۂ زمین کو آباد کرنے لگے - یہ تھی وہ متوسط نسل جس کی اولاد آج مغربی دنیا میں متمکن ہے یہ لوگ پست قد - گندم گوں - سیاہ مُو تھے جو اس نقلِ مکانی سے پہلے شمالی لوگوں سے کہیں زیادہ متمدن ہو چکے تھے - یہ بجائے صید و شکار کے مچھلیوں پر گزرِ اوقات کرتے تھے - بعض جانوروں کو پالتو بنا چکے تھے - اور ابتدائی زراعت کا فن بھی جانتے تھے - انہوں نے ایک قسم کی کمان بنائی تھی جس کے تیر کی انی پتھر کی تھی - یہ مٹی کے برتن دھوپ میں سُکھا کر بنا لیتے تھے - اور یہ ملمع کرنے اور بُننے کے فنون سے بھی آگاہ ہو گئے تھے - سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انہوں

نے اپنے لئے جھونپڑے بنانے سیکھ لئے تھے۔ زمین میں گڑھے کھودنا اور شاخوں سے اُسے ڈھانپ دینا پھر لکڑی کی ٹٹیا کو گارے سے لیپنا اور آخر کار جھیلوں میں گاؤں بنانا یعنی جھیل یا دلدل میں کہیں کھٹے ڈال کر بہت سے چوبی جھونپڑے بنالینا اُن کا کام تھا۔ جدید زمانہ حجریہ کے اخیر سے پہلے (مشرق قریب میں ۵۰۰۰ ق م میں اور مغربی یورپ میں ۲۰۰۰ ق م میں) ایک خاصا ترقی یافتہ تمدن نوعِ انسان میں قائم ہوچکا تھا۔ اس زمانہ کے خاتمے پر انسان نے ایک ایسی چیز دریافت کی جس سے اُسے قدرت پر پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ طاقت حاصل ہوگئی۔ اور وہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ یہ دھاتوں کی دریافت تھی۔

---

(۴)

ازمنۂ فلزّات

فلزّات کی دریافت ۔ یہ معاشاید ہمیشہ لاینحل رہے گا کہ انسان نے پہلے پہل کس طرح (فلزات یعنی) دھاتوں کو دریافت کیا۔ بعض مصنفین کا خیال ہے کہ سب سے پہلے سونا دریافت اور استعمال ہوا۔ بہ نسبت دوسری دھاتوں کے یہ اپنی اصلی حالت میں ملتا ہے۔ اس کا رنگ چمکدار اور دلکش ہے۔ اس کی رنگت نہیں بدلتی اور نہ اسے زنگ لگتا ہے۔ غالباً جب زمانۂ برف کے برفانی پہاڑ پگھلے تو سونے کی ڈلیاں بہت سی پہاڑی ندیوں کے پاٹ میں چمکتی ہوئی دکھائی دیں۔ یہ سونا قدیمی انسان کے کام کی چیز نہ تھی لیکن اس سے اُس نے اپنا شوقِ آرائش پورا کیا۔ چنانچہ پرانی قبروں سے ہمیں بے شمار چھوٹی چھوٹی چیزیں ملی ہیں جن میں سونا نفاست سے جڑا ہوا ہے۔

اس سے کہیں زیادہ مفید تانبے کی دریافت تھی جو اس کے بعد ہوئی۔ یہ انکشاف جو یقینی طور پر کہیں اتفاقیہ آگ کے ذریعے سے ہوگیا ہوگا۔ مشرق قریب میں تقریباً ۵۰۰۰ ق م میں ہوا۔ یہ امر طے شدہ نہیں کہ تانبے کو پہلے پہل گلانے کا شرف کس سرزمین کو حاصل ہے۔ جزیرۂ قبرس کو یا جزیرہ نمائے سینا کو۔ پروفیسر برسٹڈ اپنے تخیل میں کسی آوارہ انسان کو دیکھتا ہے جس نے رات کے وقت اپنے خیمہ کے گرد آگ جلائی اور اُسے کچے تانبے کی آڑ دی۔ پھر جب صبح کو اٹھا تو اس نے راکھ میں خالص تانبے کی چمکتی گولیاں دیکھیں۔ کچھ اسی طرح تانبا دریافت ہوا ہوگا اور پھر چند صدیوں میں اُسے عمدہ طرح گلانے اور اس میں مختلف قسم کے گھر کے برتن، کام کے اوزار، اور جنگ کے ہتھیار تیار کرنے کے طریقے وضع کئے گئے ہونگے۔ ان

باتوں سے حضارت وتمدن کو معتدبہ ترقی ہوئی۔

کانسے کا زمانہ۔ لیکن سخت کاموں کے لئے سونے کی طرح تانبا بھی بہت نرم ثابت ہوا۔ اس کی دھار بہت جلد کند ہو جاتی تھی۔ اس کی نوک بہت جلد مُڑ جاتی تھی۔ اور اس لئے وہ پتھر کی نوک کی طرح بھی کام نہ دیتی تھی۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد یہ دیکھا گیا کہ اگر تانبے میں تھوڑا سا ٹین ملا دیا جائے تو اس کا مرکب جس کا نام کانسا رکھا گیا پگھلاؤ اور مضبوطی میں اپنے اجزا سے جنگی اور دیگر کاروبار کے لئے کہیں زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ ایجاد کیسے اور کب ہوئی۔ اور کس نے کی ممکن ہے اتفاقی طور پر دو دھاتوں کے مل جانے سے اس کا پتہ چل گیا لیکن یہ ایجاد تانبے کے بہت جلد بعد ہی ہو گئی۔ ۳۰۰۰ ق م میں کانسا مشرق قریب میں عام طور پر استعمال کیا جا رہا تھا

اس کا اثر بہت جلد اور بہت نمایاں طور پر ظاہر ہوا۔ کانسے کے ذریعہ سے انسان نے پہلی بار پتھر توڑنا اور پتھروں کے مکانات اور عبادت گاہیں بنانی شروع کیں۔ مصری اہرام کانسے ہی کے آلات سے تیار کئے گئے تھے۔ کانسے ہی کے کلہاڑوں سے انسان نے اُن دور دور تک پھیلے ہوئے گنجان جنگلوں کو کاٹنا شروع کیا جو بحرِ متوسط کے اور دوسرے علاقوں پر محیط تھے۔ اب اُس نے بڑے بڑے درخت کاٹے۔ تنوں اور ٹہنوں سے تختے اور شہتیر بنائے اور لکڑی کو بے شمار مختلف کاموں میں استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ذرائع آمد و رفت عام ہوئے۔ بیل گاڑیاں اور جنگی رتھیں اور بڑے بڑے نفیس جہاز تیار کئے گئے اور نقل و حرکت اور تجارت کے کام میں لائے جانے لگے۔

زراعت میں بھی کانسے کے ہلوں سے بونے کی محنت آدھی اور اسکی پیداوار دُگنی ہو گئی۔ کانسے کے پھاوڑوں اور کُدالوں سے باغات اور انگوری بیلیں بغیر زیادہ دقت کے پھلنے پھولنے لگیں۔ جنگ میں وہ قومیں جنہوں نے کانسے کے آلات استعمال کئے اُن قوموں پر غالب آئیں جو ابھی اس سے آشنا نہ ہوئی تھیں۔ مثلاً وہ ایلپائی نسل جس نے ۲۰۰۰ ق م میں برطانیہ پر حملہ کر کے وہاں کے متوسط النسل باشندوں پر غلبہ پایا کانسے کے ہتھیاروں سے مسلح تھی۔

لوہے کا زمانہ۔ لوہا سب سے اخیر میں دریافت ہوا۔ یہ امر کہ لوہے کا سب سے پہلا نام "آسمانی دھات" تھا ظاہر کرتا ہے کہ ایک مدت تک انسان نے اُسے صرف ٹوٹنے والے تاروں سے حاصل کیا۔ مصر میں کانسے کے زمانہ کے شروع ہی میں ۳۰۰۰ ق م کے قریب لوہا اسی ماخذ سے حاصل ہوتا تھا۔ لیکن آسمانی خزانہ بہت دُور اور کمیاب تھا۔ اس لئے زمین پر اُسے ڈھونڈ نکالنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پہلے پہل ایشیائے کوچک میں ہتی لوگوں نے لوہے کی کانیں کھودیں۔ ۱۵۰۰ ق م میں ایجیئن میں اور ۱۳۰۰ ق م میں مصر میں یہ کانسے کی جگہ استعمال کیا جانے لگا۔ مغرب کے وحشی لوگوں تک پہنچتے اسے بڑی مدت لگی۔ علاقہ گال (فرانس وغیرہ) میں ۸۰۰ ق م سے پہلے اس کا پتہ نہ تھا اور آئرستان

توکہیں پہلی صدی عیسوی میں جاکراس سے آشنا ہوا۔

جہاں کہیں لوہے کا پتہ چلا تمدن میں ایک نمایاں ترقی ہونے لگی لوہے کی بنی ہوئی چیزیں کاٹنے کی چیزوں سے اتنی ہی زیادہ مفید اور پائیدار تھیں۔جتنی کاٹنے کی چیزیں پتھر کی چیزوں سے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو اس سے بہتر اوزار بننے لگے اور دوسری طرف اس سے جنگ زیادہ خوفناک اور خونریز ہوگئی۔

سب سے پہلی زبردست فوجیں وہ تھیں جو اشوریوں نے اپنے بادشاہوں سارگن اور سناحرب (۶۸۱-۲۲ء ق م) کے تحت میں تیار کیں اور ان سے مشرق کو کچھ عرصے کے لئے خاک وخون کا ظلمت کدہ بنا دیا۔اشوریوں کے آہنی ظلم وجفا سے یہ بات طشت از بام ہوگئی۔کہ علمی ترقی اور انسانی قوت جب وہ رحم ومعدلت سے عاری ہوں اور خودغرضانہ مقاصد کے لئے استعمال میں لائی جائیں تو بجائے رحمت کے نوع انسان کے لئے زحمت کا ذریعہ ثابت ہوتی ہیں۔

طلوع تاریخ۔مصریوں، کریتیوں، ہتیوں، اور اشوریوں کے ذکراذکار سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اب ہم بجائے زمانۂ قبل تاریخ کی شب تاریک میں ٹامک ٹوئیے مارنے کے تاریخی عہد کی روشنی میں انسانی نسل کے کارنامے ملاحظہ کر رہے ہیں۔یہ واقعہ ہے کہ قدیم زمانۂ حجریہ میں جب انسان کا دماغ اور دست وپا ترقی کر رہے تھے تو ساتھ ہی ساتھ اسکی گفتگو بھی چلا پا رہی تھی۔جس سے یہ ممکن ہوگیا کہ معلومات سینہ بسینہ منتقل ہوں۔علم وفن سیکھے سکھائے جائیں۔روایت کا سلسلہ قائم ہوا اور گئی گذری باتوں کی یاد قایم رہے۔اسی طرح جدید زمانۂ حجریہ میں جب انسان فنون وصنعت میں ترقی کر رہا تھا وہ ٹوکریاں، مٹی کے برتن اور لکڑی کی چیزیں بنانے اور دھاتوں پر کام کرنے میں مصروف تھا تو ساتھ ہی ساتھ اس نے تحریر کا فن ایجاد کیا۔جس سے وہ نہ صرف دور ونزدیک ہدایات بھیج سکتا تھا۔اور علم کا ایک مستقل ذخیرہ جمع کرسکتا تھا بلکہ ایسی یادگاریں قائم کرسکتا تھا جن سے اہم واقعات کی یاد تازہ رہے اور دستاویزیں تیار کرسکتا تھا جن سے ایک باقاعدہ تاریخ مرتب ہوسکے۔

لکھنے کا فن یوں شروع ہوا کہ پہلے اُس شے کی جس کا اظہار کرنا ہو ایک بھونڈی سی تصویر بنادی جاتی۔مثلاً گائے کے لئے گائے کی تصویر کھینچ دی جاتی۔دوسرا درجہ یہ تھا کہ مکمل تصویر کی بجائے ایک نشان دے دیا جاتا۔مثلاً بجائے گائے کے اُس کے دو سینگ دکھا دیئے جاتے۔تیسرا درجہ یہ تھا کہ نشان سے چیز کا اظہار نہ ہوتا تھا۔بلکہ آواز کا۔مثلاً اظہار جانور گائے کا نہیں بلکہ لفظ "گاتے" کا کیا جاتا تھا۔جہاں کہیں بھی وہ استعمال کیا جائے خواہ گاتے ہیں خواہ "لگائے"، یا "بھگائے" ہیں۔آخری درجہ یہ تھا کہ آواز کے عناصر کا استخراج کیا گیا۔مثلاً گائے وغیرہ سے گ نکالا گیا اور ایسے ہی ان مختصر عنصری آوازوں کو جمع کر کے ان کے نشانات سے حروف تہجی کا ایک سلسلہ تیار کیا گیا۔

مصر اور بابل میں انشا ان تمام مدارج سے ہو کر گزری اور حروفِ تہجی کی حالت پر پہنچ گئی۔ اس کے مقابل میں چین میں وہ دوسرے درجہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اب تک چینیوں کے ہاں حروفِ تہجی نہیں ہیں بلکہ ہزاروں نشانات ہیں جن سے آوازوں کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ مختلف چیزوں کا۔ محنت اور حسنِ اتفاق سے علمارِ مصر کی تصویری تحریر اور بابل کی "میخ نما" تحریر کا بھید جان چکے ہیں۔ البتہ کریت کی کتابت کے سامنے ابھی ان کی عقل عاجز ہے۔ اصلی تاریخ نیل اور فرات کے تمدنوں کے تاریخی نوشتہ جات سے شروع ہوتی ہے۔ چین کی مسلسل روایات بھی ان سے زیادہ پیچھے نہیں۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم اُن کی کہانی بیان کریں بہتر ہوگا کہ ہم اُس ترقی پر ایک نظر ڈالیں جو انسان نے زمانۂ قبلِ تاریخ میں کی۔

(۵)

تاریخ سے قبل کا تمدّن

جماعتوں کی قسمیں ۔ بربریت سے تمدن کی طرف پہلا قدم یہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی قسم کی جماعت بنائی جائے بربریت کا جوہر عزلت ہے۔ پرانا فلسفی ٹامس ہابز اگرچہ اُس کے مشاہدات ہمیشہ درست نہ ہوتے تھے خوب کہتا ہے کہ معاشرت کی صورت اختیار کرنے سے پہلے انسانی زندگی کی فطری حالت "تنہا مفلوک قبیح وحشیانہ اور مختصر تھی"۔ البتہ اُس کے بیان میں یہ تاریخی شبہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ فطری حالت انسان کے ظہور سے لاکھوں سال پہلے ختم نہ ہو چکی تھی۔ ہمیں تقریباً کامل یقین ہے کہ وہ ختم ہو چکی تھی۔ تنہائی مچھلیوں کا خاصہ ہے خواہ وہ ایک گروہ ہی میں کیوں نہ تیرتی پھریں۔ تنہائی رینگنے والے جانوروں کی خصوصیت ہے خواہ وہ سینکڑوں کی تعداد میں جمع ہوں۔ اُن کی کوئی جماعت نہیں ہوتی۔ وہ ایک دوسرے کی اعانت نہیں کرتے۔ وہ جیتے ہیں تنہا اور مر جاتے ہیں تنہا۔ لیکن دودھ دینے والے جانوروں کا یہ حال نہیں۔ ان کے ہاں ایک قسم کی خاندانی زندگی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ ابتدائی اور مختصر ہی ہو۔ ان میں کی اعلیٰ انواع میں کسی نہ کسی طرح کی مصاحبت قائم ہو جاتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے کتے۔ گھوڑے۔ بھیڑیں گائیں بھینسیں۔ بلکہ شہد کی مکھیاں اور چیونٹیاں بھی تمدن کے میدان میں چند قدم بڑھ چکی ہیں۔ اعلیٰ درجے کے بندروں میں ایک صریح معاشرتی زندگی ظاہر ہو جاتی ہے۔ لیکن ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ معاشرت انسانی حلقوں کی بالکل ابتدائی

اور معمولی معاشرت سے بھی کمتر ہوتی ہے۔ کیونکہ جب تک گفتگو نہ ہو سکے باقاعدہ تنظیم اور اک خاص معاشرتی روایت قائم نہیں ہو سکتی۔

علاوہ ماں بچوں کے معمولی فطری ملاپ کے سب سے پہلی جماعتیں جو انسانوں میں منضبط ہوئیں وہ شکاری ٹولیاں تھیں۔ افریقہ اور آسٹریلیشیا کے موجودہ نمونوں سے اندازہ لگایا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے ہاں ربط وضبط کا ایک نہایت اعلیٰ نظام موجود تھا۔ غالباً یہ جماعتیں قدیم زمانہ حجریہ کی صدہا صدیوں میں جُوں کی توں قائم رہیں۔ لیکن جدید زمانہ کے ساتھ ان میں دو ترقیاں ہوئیں۔ ایک طرف تو کتوں۔ بھیڑوں۔ گھوڑوں۔ بیلوں اور بکریوں کے پالتو ہو جانے سے وسط ایشیا اور عربستان کے لق ودق وسیع میدانوں میں خانہ بدوشوں کی بہت سی قومیں سرگرداں ہوئیں۔ دوسری طرف زراعت کی اختراع سے مزارعین کی قومیں دریائے نیل، فرات، سندھ اور ہوآنگ ہو کی محفوظ و زرخیز وادیوں میں بس گئیں۔

قُدرت پر ملکہ۔ جانوروں کا پالتو بنانا اور اس بات کی ایجاد کہ کیونکر زمین کو جوت کر غلہ اور میوہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اُن اہم ترین ترقیات میں سے ہیں جنہوں نے انسان کو حیوانیت کے غار سے انسانیت کی چوٹیوں پر پہنچایا ہے یہ ایجادیں تاریخی زمانے سے پہلے نامعلوم طریقوں سے ہوئیں۔ بلکہ جانوروں کا پالتو بنانا تو انہیں زمانوں میں تکمیل کو پہنچا۔ کوئی جانور جو اُس وقت پالتو نہیں بنایا گیا اب تک پالتو نہیں ہُوا۔ کتا پہلا جانور تھا جو انسان کے دشمنوں کے گروہ سے بچھڑ کر اُس کے دوستوں کی جماعت میں آشامل ہُوا۔ وہ صید و شکار کے لئے نہایت مفید تھا۔ اور جب چوپانی کا زمانہ آیا تو اس نے گڈریے کا کام خوب سیکھا۔ ظاہر ہے کہ انسان کی زندگی بہت زیادہ محفوظ و منتظم ہو گئی جب وہ صید و شکار کے اتفاقات سے بالا بالا زندگی بسر کرنے لگا۔ جب وہ حضرت ابراہیمؑ اور لوطؑ کی طرح اپنے عزیز واقارب اور کارآمد پالتو جانوروں کا گروہ لئے جدھر چاہتا چلا جاتا اور جہاں چاہتا خیمہ زن ہو جاتا۔ کیونکہ اس کی خوراک اور اس کا لباس اس کے ساتھ ساتھ موجود و مہیا تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ خانہ بدوش اپنے گلوں میں چین اور آرام کی زندگی گزارتا تھا۔

اس بات کا ہمیں علم نہیں کہ بونے اور کاٹنے کے طریقے کیونکر ایجاد ہوئے۔ مورخین نے اس میدان میں نئے سے نئے خیال دوڑائے ہیں لیکن یہاں گنجائش نہیں کہ اس پر رائے زنی کی جائے۔ قصہ مختصر یہ کہ جب انسان نے گیہوں۔ باجرا۔ جو۔ اور جئی تیار کرنے شروع کئے۔ جب اس نے انگور اور دوسرے اور پھلوں کی کاشت کی تو وہ اس قابل ہو گیا کہ آوارہ گردی اور صید و شکار کو قطعی طور پر خیرباد کہہ کر چھوٹی چھوٹی دیہاتی جماعتوں میں بس جائے، اپنے سنے

کے لئے مکان بنائے۔ پوجا پاٹ کے لئے مندر تیار کرے، فنون وصنعت وحرفت کو ترقی دے۔ تجارت کی راہیں کھولے ریاستیں قائم کرے اور دیگر بے شمار ذریعوں سے اعلیٰ ترین تمدن کی شاہراہ پر گامزن ہو۔

اس تحریک میں خانہ بدوشوں اور شہر آبادوں دونوں نے قدرت کے ذرائع پر روز بروز زیادہ ملکہ حاصل کیا۔

اُن ایام سے جب غاروں کے رہنے والوں نے آگ جلانا اور کھانا پکانا سیکھا ترقی یافتہ طبیعیات کے اس دور تک انسانی تمدن کے معنی یہ رہے ہیں کہ انسان روز بروز قدرت کے ذرائع اور اس کے ذخائر پر بیش از پیش قابو حاصل کرکے اپنے آرام وآسائش کو بڑھائے اپنے علوم وفنون کو ترقی دے اور یوں اپنے عقل وادراک کو صیقل کرتا چلا جائے۔

بین جماعتی تعلقات۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ پہلا قدم جو انسان نے بربریت سے تہذیب کی طرف بڑھایا یہ تھا کہ اُس نے اپنے ہم جنسوں سے مل کر کسی نہ کسی قسم کی مستقل معاشرت۔ صیادانہ ٹولی۔ راعیانہ گروہ یا زراعتی قوم قائم کی۔ یہ ابتدائی سوسائیٹیاں لامحالہ چھوٹی ہوتی تھیں۔ کیونکہ ان حالات میں ایک ہی قوم میں بہت سے لوگوں کے لئے خوراک مہیا ہوسکنا ناممکن تھا۔ صیادی سے تھوڑے سے آدمیوں کے لئے تھوڑی بہت خوراک میسر آتی، راعی سرداروں کے گلّوں کے لئے بہت وسیع چراگاہوں کی ضرورت ہوتی۔ اور اولین مزارعین کی زراعت کا تقاضا تھا کہ ہر فصل کے لئے اک نئی زمین ملے نتیجہ یہ ہوا کہ نوعِ انسانی بجائے ایک جماعت کے بہت سی جماعتوں میں منقسم ہوگئی اور اس طرح بین جماعتی تعلقات کی ابتدا ہوئی۔

اس تقسیم کے دو قطعی مختلف نتیجے ہوئے ایک طرف تو اس سے جہد للبقا زوروں پر ہوگئی۔ اور جنگ وجدل کا بازار گرم ہوا۔ مختلف گروہوں میں صیادی خطوں عمدہ چراگاہوں اور سیراب وادیوں کے قبضے کے لئے سخت اور خوفناک لڑائیاں ٹھن گئیں۔ دوسری طرف ان جنگجو گروہوں میں سے ہر ایک میں ایک نیا اجتماعی جذبہ پیدا ہوا۔ مشترک غرض کے لئے یکسوئی کا احساس اپنے ہمراہیوں کی طرف وفاداری کا خیال ایک ہی رہنما کی فرمانبرداری کی عادت۔ اشتراکِ عمل کی قابلیت رفاہِ عام کے لئے نفس کشی۔ ایک ابتدائی شہری حس یہ اخلاقی اوصاف انسان کی فطرت میں نشو ونما پانے لگے۔ تمدن کی ترقی کا راز بہت کچھ اس واقعہ میں مضمر ہے۔ کہ چھوٹی جنگجو جماعتیں مل کر بڑی منتظم ملتیں بن گئیں اور بھائی چارے کے خیالات نے وسیع پیمانے پر ایک عملی صورت اختیار کی۔

لیکن ایک عرصۂ مدید تک اتحاد کی یہ کیفیت نہایت آہستگی کے ساتھ عمل میں آئی۔ چار سو لڑائیاں برپا ہوتیں ایک ٹولی دوسری ٹولی سے ایک خاندان دوسرے خاندان سے۔ ایک گروہ دوسرے گروہ سے اور ایک قوم دوسری قوم

سے برسرِ پیکار تھی۔ ان میں سب سے زیادہ عظیم الشان اور خوفناک جنگ وہ تھی جو لق و دق میدانوں کے خانہ بدوشوں اور ساحلی مقامات اور وادیوں کے خانہ آبادوں کے درمیان صدی بعد صدی جاری رہی۔ اس جنگ کے تسلسل اور اُس کے نتائج سے ہمیں انسانی تاریخ کے بعض دشوار معموں کا حل ملتا ہے۔

خوش قسمتی سے ان باتوں کے مقابل میں انہیں صدیوں میں ہم نوعِ انسان میں پُرامن تجارت کا نشو و نما، تبادلۂ خیالات میں ترقی اور ایک خطے کی شائستگی کا دوسرے خطے کی شائستگی پر تدریجی اثر دیکھتے ہیں۔

اخلاق اور مذہبی خیالات۔ جماعتوں کے بننے سے خود بخود ایک نوع کا اخلاق پیدا ہوا۔ ہر جماعت کے ارکان کو خواہ وہ غیروں سے کیسا ہی سلوک کیوں نہ کریں ایک دوسرے کی طرف تری وحشیانہ خود غرضی چھوڑنی پڑی۔ ورنہ گروہ کا گروہ بنے رہنا ناممکن ہوتا۔ زندگی کا تحفظ جائداد کا وجود۔ رسومِ شادی کا اجرا، محکم برداری کی عادت۔ فرضِ منصبی کا احساس، ایفائے عہد، ادائے رسم و رواج۔ خطروں اور موت تک سے بےپروائی۔ یہ اور ایسی ہی اور اخلاقی نیکیوں سے انسان کی فطرت جلا پانے لگی۔ یہ باتیں نہ ہوتیں تو ایک جماعت بہت جلد باہمی جنگ میں مبتلا ہو کر دوسری زیادہ نیک عمل جماعت کے ہاتھوں ملیا میٹ ہو جاتی۔ یہ اخلاق کی ابتدا تھی۔ مدت تک اخلاق محض ایک جماعتی کیفیت رہی۔ بیرونی "وحشیوں" "عجمیوں، یا کافروں" سے اسے کچھ تعلق نہ تھا۔ تمدن کی ترقی کے یہاں پھر یہ معنی ہوئے کہ اخلاق کا دائرہ بتدریج وسیع تر ہوتا گیا یہاں تک کہ آج کم از کم یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ اس کا اطلاق ساری نوعِ انسان پر کیا جائے۔

اخلاق کے ساتھ ساتھ لیکن شروع شروع میں اس سے بالکل الگ تھلگ مذہب کی نشو و نما ہوئی انسان نے دیکھا کہ وہ چاروں طرف ایسی طاقتوں سے محصور ہے جو اس کے قابو میں نہیں ہیں۔ اور ایسے رازوں اور معموں میں گھرا ہوا ہے جنہیں وہ حل نہیں کر سکتا۔ اُس کا نفس تیز فہم مصروفِ کار اور پُرتخیل تھا۔ لیکن ابھی اُس میں بچوں کی سی ناتجربہ کاری تھی جس کے باعث وہ سمجھتا تھا کہ قدرت کی تمام حرکتیں اُس جیسی ہستیوں ہی کے ارادوں کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے اُس نے کائنات کو اپنے جیسی مخلوقات سے آباد سمجھ لیا۔ جن میں کچھ اُس کی ہمدرد اور ہم نوا تھیں۔ اِن کی اُس نے خوشی سے پوجا کی اور اِن کی امداد کے لئے شکرانے کے چڑھاوے چڑھائے۔ کچھ خوفناک و مخالف تھیں۔ اِن کے راضی کرنے کو اس نے بےدردانہ قربانیاں کیں یا اِن سے بچنے کو ٹونے ٹوٹکے اور منتر سے کام لیا۔

مذہب نے مختلف مقامات میں مختلف صورتیں اختیار کیں۔ بالخصوص لق و دق میدانوں کے خانہ بدوش

اپنی بے پایاں تنہائیوں میں اور اپنے کھلے پھیلے ہوئے آسمان کے نیچے رہ کر وحدت الوجود کی طرف مائل ہوئے یعنی وہ ایک خدا کو ماننے لگے۔ جو ہر کہ ومہ کا حاکمِ اعلیٰ تھا۔ اُدھر زرخیز وادیوں کے زراعت پیشہ خانہ آباد جن کی زندگی زیادہ پیچیدہ تھی کثرت پرستی کی طرف راغب ہوئے یعنی وہ بہت سے خداؤں کی پوجا کرنے لگے۔ اِس طرح مذہبی اختلافات نے بھی ان مناقشات کو تیز تر کر دیا جو خانہ بدوشوں اور خانہ آبادوں کے درمیان شروع ہو چکے تھے۔

بشیر احمد

خیالات

عظمت انگلستان میں تجارت کی شکل میں فرانس میں حسن کی صورت میں اور جرمنی میں قوت کے لباس میں جلوہ گر ہوئی۔

حیرت ایوانِ تاریخ میں داخل ہوتے ہی اسلام سے دوچار ہوئی۔

وہ قوم جو غیر قوموں کی حکومت کو اپنی دائمی ترقی کا ذمہ دار بنائے دائمی غلامی کے لائق ہے۔

اے انگلستان! تو آزادی کا جنم بھوم ہے لیکن تیری آزادی کی تلوار سے بندش کی بیڑیاں لٹکتی ہیں۔

نیک ہندوستانیوں کی روحیں ہمالیہ کی چوٹیوں کو اپنا مسکن بناتی ہیں۔

"باغبان"

قصیدہ

در نعت سیّدِ کائنات علیہ الصلوات والتحیات

آ- خدارا ساقیٔ مینوش آ　　لا- دوبارہ بادۂ سرجوش لا
پھر علاجِ خوفِ استقبال کر　　پھر غمِ انجام کا کھٹکا مٹا

پھر نشاطِ کیف زا گھٹنے لگی　　پھر سرورِ روح پرور گھٹ چلا
پھر کرم فرما کہ دم پر آبنی　　پھر خمارِ کلفت افزا بڑھ گیا
پھر حجابِ شرم بے جا دور کر　　پھر نقابِ عارضِ انور اٹھا
پھر تمنائے نظر منظور کر　　پھر جمالِ چہرۂ زیبا دکھا

پھر بہ عجلت شیشہ و ساغر سنبھال　　پھر پلا اللہ جلدی پھر پلا
پھر شرابِ زندگی ساغر میں ڈال　　پھر جلا اک نیم جاں کو پھر جلا
پھر ادائے دلربا سے ساز چھیڑ　　پھر نوائے کیف زا کے ساتھ گا
پھر ربابِ جاں نفزائے راز چھیڑ　　پھر صدائے نغمۂ جنت سنا

پھر دماغِ طالبِ مے تازہ کر　　پھر بجھا دل کی لگی ہاں پھر بجھا
پھر لحاظِ رنج بے اندازہ کر　　پھر جما رنگِ خوشی ہاں پھر جما
پھر نویدِ وصل سے دل شاد کر　　پھر بلائے ہجر سے پیچھا چھڑا
پھر دلِ برباد کو آباد کر　　پھر عطائے قرب سے عزت بڑھا

پھر رواجِ عیشِ سابق زندہ کر　　پھر وفورِ کیف کے دریا بہا
پھر دلِ ہر ابرِ تر شرمندہ کر　　پھر مئے صافی کے خُم کے خُم لنڈھا
پھر کمالِ ضبطِ غم کی داد دے　　پھر تمنا پر ترس کر، رحم کھا
پھر وفائے دمبدم کی داد دے　　پھر در آغوش میں، ہاں پھر در آ

پھر طبیعت مائلِ خیرات کر　　پھر لگا مے کی سبیلیں پھر لگا
پھر جم و پرویز سب کو مات کر　　پھر لٹا مستی کی دولت پھر لٹا
پھر رہِ عشقِ نبی ہموار کر　　پھر درِ فیضِ رسالت کھٹکھٹا
پھر خدا کے لطف کا حقدار کر　　پھر حبیبِ حق تعالیٰ سے ملا

پھر کوئی درمانِ فکرِ حال کر　　پھر خیالِ این و آں دل سے بھلا
ٹھیر ابھی عجلت نہ کر اے یار ٹھیر　　سوچ لوں، دل عیش سے کیوں ہٹ چلا

ٹھیر ابھی اے دلبرِ طرار ٹھیر   دھیان سوئے سرورِ دیں چل دیا

درگزر ضبطِ طرب سے درگزر   ناروا اب شغلِ عشرت ناروا

درگزر رسوم ادب سے درگزر   سر جھکا، وقتِ ادب ہے سر جھکا

ہیں عیاں اور سرکارِ بطحا کا خیال   لب ہیں اور صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ

اب سرو برگِ نشاط امرِ محال   عرضِ نعت پاک کا وقت آ گیا

وہ بہارِ گلشنِ تلک الرسل   خاصۂ خاصانِ درگاہِ خدا

وہ کرم کی شاخ کا شاداب گل   دونوں عالم کی خبر کا مبتدا

وہ نبیِ ہاشمی، فخرِ کرام   سرورِ لولاک - احمد مجتبیٰ

وہ رسولِ محترم، عالی مقام   رحمتِ عالم - محمد مصطفیٰ

وہ عرب کی سرزمیں کا نونہال   فخرِ موجودات - ختم الانبیا

وہ شرف کے برج کا بدرِ کمال   خیرِ مطلق - ہادیٔ خیر الوریٰ

وہ خدا کی مہربانی کا سبب   رحمتِ حق - شافعِ روزِ جزا

وہ امام الانبیا - امی لقب   مصلحِ کامل حبیبِ کبریا

وہ مقدس ہستیوں میں بے مثال   پاک باطن برگزیدہ مقتدا

وہ خدا کے بعد بالکل بے ہمال   واجب التعظیم - سچا پیشوا

وہ امیں وہ راست گو وہ راست باز   عاملِ دع ما کدر - خذ ما صفا

وہ خدا آگاہ صاحب امتیاز   دوستدارِ حق عدوئے ماسوا

وہ نڈر سر عسکرِ اعلائے حق   وہ سپہ سالارِ افواجِ خدا

وہ اکیلا فاتحِ دنیائے حق   وہ علم بردارِ توحیدِ خدا

وہ زباندانِ خدائے کائنات   وہ لسانِ خالقِ ارض و سما

وہ نشانِ راہِ دنیائے نجات   وہ جہانِ رحمتِ ربُّ العلا

وہ بصیرت بخشِ چشمانِ شعور   وہ نظر افروزِ اہلِ اتقا

وہ حقیقت دانِ انجامِ غرور   وہ سبق آموزِ تسلیم و رضا

وہ ظہورِ لطفِ پیہم کی نوید   وہ وفورِ فضلِ بیحد کی بنا

وہ مسیحِ ابنِ مریم کی نوید   وہ خلیلِ ابنِ آذر کی دعا

وہ خدا کا آخری پیغامبر   وہ ہدیٰ کا آخری روشن دیا

وہ خطابِ نورِ حق سے مفتخر   وہ بڑا انسان اور سب سے بڑا

ضامنِ اصلاحِ کارِ دو جہاں   قاصدِ پیغامِ توحیدِ خدا

قائدِ خدمت گزارِ دو جہاں   حاملِ بارِ فلاحِ دو سرا

ماہرِ قانونِ تلقینِ نجات   واقفِ آدابِ تعلیمِ ہدا

ناشرِ احکامِ آئینِ نجات   کاملِ اخلاقِ حکمت انتما

مطلبِ صلواتِ ہر پیر و جواں　　مقصدِ دعواتِ ہر ما و شما
مرکزِ جذباتِ ہر خورد و کلاں　　قبلۂ حاجاتِ ہر شاہ و گدا

میر سامانِ نجاتِ جاوداں　　ساعیٔ بہبود اندر دو سرا
ابرِ بارانِ حیاتِ جاوداں　　داعیٔ حق، راعیٔ خلقِ خدا

اپنے یاروں کا صداقت کیش یار　　دوستوں کا دوست اور پھر باوفا
اپنے دشمن کا بھی اندیش یار　　بہتری مقصد بھلائی مدعا

مہلکاتِ زندگی کا چارہ گر　　مشکلاتِ موت کا مشکل کشا
راہ سے بھٹکے ہوؤں کا راہبر　　کشتیٔ دینِ خدا کا ناخدا

بیکسوں کا بیکسی میں دستگیر　　بےبسوں کا بےبسی میں آسرا
غمزدوں کا غمگسارِ بےنظیر　　بےدلوں کا دلنوازِ بےریا

ہر اسیرِ ابتلا کا غمگسار　　ہر مریضِ دردِ ہجراں کی دوا
ہر گرفتارِ بلا کا غمگسار　　ہر مصیبت آشنا کا آشنا

دولتِ کون و مکاں پاکر فقیر　　بادشاہِ دو جہاں ہو کر گدا
سرورِ کونین کہلا کر فقیر　　مالکِ دارین ہوتے بےنوا

بہترینِ اولین و آخریں　　برترینِ ابتدا و انتہا
کامیابِ مقصدِ دنیا و دین　　انتخابِ لاجواب دوسرا

اے ترا ہر لفظ اک الہامِ غیب　　اے ترا اقرار اقرارِ ہدا
اے ترا ہر حرف اک پیغامِ غیب　　اے ترا انکار انکارِ خدا

کامیابی رہنمائی کو بڑھی　　تو جدھر پیغامِ حق لیکر چلا
فتح و نصرت پیشوائی کو بڑھی　　تو جدھر نامِ خدا لیکر بڑھا

اسکو ہر سچی ہدایت کی نوید　　جو تری امت میں داخل ہو گیا
اس کو ہر غیبی ہدایت کی نوید　　جو ترے ارشاد پر "حق" بول اٹھا

ایک دنیا اسکی قسمت پر نثار　　جو ترا ارمان پیدا کر سکا
ایک عالم اسکی فرصت پر نثار　　جو تری دھن میں سدا در در پھرا

راحتِ ہر دو جہاں اسکو نصیب　　جو ترے شوقِ طلب میں مر مٹا
سرمدی آرامِ جاں اسکو نصیب　　جو ترے سوزِ نہاں سے جل بجھا

واہ اُن اقبال مندوں کے نصیب　　جن کو تیرے لطف سے حصہ ملا
واہ اُن اصحاب کا بختِ عجیب　　جن کی قسمت میں ترا دیدار تھا

اے زہے وہ خاک جوہر آفریں　　تو جہاں پیدا ہوا، پھولا پھلا
اے زہے وہ روح پرور سرزمیں　　تو جہاں برسوں کرم گستر رہا

حکیم آزاد انصاری

سودا کی ہجویہ نظمیں

دنیا کی ہر زبان میں جس میں ادب ہے، ہجویہ نظمیں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح مدحیہ نظمیں بھی۔ تعریف اور مذمت کی موجبات انسان کی فطرت میں داخل ہیں۔ مثلاً اگر زید عمرو کے ساتھ احسان سے پیش آئے تو ضروری ہے کہ عمرو زید کے احسان کا شکریہ ادا کرے۔ اور اس کی تعریف کرے۔ برخلاف اس کے اگر عمرو کو زید کے ہاتھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو بالضرور عمرو زید کو غصّے کی نظر سے دیکھے گا۔ اور زبان سے اس کی برائی ظاہر کرے گا۔ ایسے نیک نفس انسان دنیا میں بہت کم ہیں۔ اور وہ صرف صوفیہ میں ہیں کہ دنیا کے لوگ ان کو کیسی ہی ایذا پہنچائیں وہ کبھی ٹس سے مس نہ ہوں۔ اور انتقام کا جوش ان کے دل میں پیدا نہ ہو۔

ہجو و مذمت کے نفسیاتی محرکات بہت سے ہیں۔ مگر حسب ذیل محرکات زیادہ اہم ہیں۔

(۱) حسد۔

(۲) حد سے زیادہ کنجوسی۔

(۳) حد سے زیادہ حرص

(۴) مذہبی اختلاف۔

(۵) اظہار فخر۔

(۶) ریا و نفاق۔

(۷) جوش انتقام۔

(۸) ایذا رسانی

جب ایک شخص اپنے اقران و امثال سے علم و فضل میں یا دولت و ثروت میں یا عزت و حشمت میں بڑھ جاتا ہے تو وہ لوگ جو اس کے رتبے کو حاصل نہیں کر سکتے اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور اس کی نسبت بدگوئیاں کرتے ہیں۔ ایسی کمزور فطرت کے انسان ہر زمانے میں موجود رہے ہیں۔

حد سے زیادہ کنجوسی اور حد سے زیادہ حرص بھی لوگوں کو مخالفت اور بدگوئی پر آمادہ کر دیتی ہے۔ ریا اور نفاق بھی اُن اخلاق ذمیمہ میں سے ہیں جن کو ابنائے زمانہ نفرت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ایسے لوگ جو اپنے تئیں مقدس اور نیک ظاہر کرتے ہیں

مگر اُن کے باطنی اخلاق اُن کے دکھاوے کے مطابق نہیں ہوتے ہمیشہ شاعروں کے تختۂ مشق بنے رہے ہیں۔

جب ایک شخص دوسرے شخص کے مقابلے میں یا ایک قوم دوسری قوم کے مقابلے میں فخر کا اظہار کرتی ہے تو اس شخص یا قوم کے عیوب تلاش کئے جاتے ہیں۔ اور اس غرض سے کہ وہ شخص یا قوم نظروں سے گر جائے۔ اس کے عیوب کا اعلان کیا جاتا ہے۔ عرب جاہلیت کی شاعری میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

مذہبی اختلاف کی صورت میں ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ تعصب کا اظہار کرتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی بدگوئی پر کمر باندھ لیتے ہیں۔ مذہبی مباحثوں میں ایسی نظمیں یا نثریں بار بار لکھی گئی ہیں۔

انتقام تو ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کی طبیعت میں موجزن ہوتا ہے۔ اگر زبان یا ہاتھ سے ایک شخص دوسرے شخص کو ضرر پہنچائے تو وہ اس سے انتقام لینے پر مائل ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی مادّی ضرر اُس کو نہ پہنچا سکے تو کم سے کم زبان سے تو اس کی بدگوئی ضرور کرتا ہے۔

ایک شخص جو دولت یا حکومت رکھتا ہے اگر اُس کے ہاتھ سے لوگ تنگ ہوں اور لوگوں کو اُس کی طرف سے تکلیفیں پہنچتی رہتی ہوں تو کوئی نہ کوئی شخص علی الاعلان اُس کی ہجو و مذمت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ گو کہ اُس خاص شخص کو اس کے ہاتھ سے کوئی ضرر نہ پہنچا ہو۔

شاعر بھی ایک انسان ہے۔ اس کے دل میں بھی وہی جذبات ہیں جو تمام انسانوں کے دل میں ہیں۔ جب کوئی ایسا محرک اس کی طبیعت میں پیدا ہوتا ہے تو وہ بھی اپنی زبان و قلم سے کام لیتا ہے۔ مگر شاعر کے اندازِ بدگوئی اور عام انسانوں کے اندازِ بدگوئی میں فرق ہونا چاہئے۔ اگر شاعر عام انسانوں کی طرح گالی گلوج بکنے لگے تو نثر اور نظم کے سوا دونوں میں کوئی امتیاز نہ ہوگا۔ شاعر کے لئے حسبِ ذیل شرائط ہیں جن کا لحاظ رکھنا اُس کے لئے ضروری ہے۔

(۱) شوخی اور ظرافت ہو۔ مگر فحش و دشنام سے زبان آلودہ نہ کی جائے۔

(۲) جسمانی اور پیدائشی عیب بیان نہ کئے جائیں۔

(۳) صرف وہ اخلاقی عیوب بیان کئے جائیں جن کو دنیا جانتی ہو اور گرد و پیش کے لوگ اُنکا انکار نہ کر سکیں بلکہ اُن کی تصدیق کریں۔

(۴) ہر برائی جہاں تک ممکن ہو تعریض و کنایہ کے پیرائے میں بیان کی جائے۔ تصریح و تفصیل سے کام نہ لیا جائے۔

(۵) اگر قوتِ متخیلہ سے کام لیکر بیان کے نئے نئے پہلو پیدا کئے جائیں تو ایسی ہجو بلاغت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

(۶) مبالغہ جو دائرۂ فطرت سے خارج ہو عام طور پر شاعری میں نامقبول ہے مگر ہجویہ نظموں میں اسکی اجازت ہے اور ایسے مبالغہ پر لوگوں کو ہنسنے ہنسانے کا موقع ملتا ہے۔

اردو شاعری میں ناجی۔ ضاحک۔ فدوی۔ بقا۔ انشا اور مصحفی نے ہجویہ نظمیں لکھی ہیں۔ مگر سودا کے برابر کسی کی شہرت نہیں ہوئی۔ سودا نے جس طرح قصیدوں میں مدح کا کمال دکھایا ہے۔ اسی طرح وہ ہجو گوئی میں بھی طاق ہے۔ مدح اور قدح دونوں میں اُن کی لیاقت مسلّم ہے مگر ہجو گوئی کی جو شرطیں بیان کی گئی ہیں اُن کے معیار پر سودا کا کلام پورا نہیں اترتا۔ تاہم اُن کی ہجویہ نظموں میں جو شوخی اور لطافت جابجا پائی جاتی ہے۔ اسکے لحاظ سے اُن کی خاص ہجویہ نظمیں یا بعض نظموں کے حصّے آج بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ میں سودا کی ہجویہ نظموں کا خلاصہ وضاحت کی غرض سے نثر میں پیش کروں گا۔ سودا کا دیوان ہر جگہ ملتا ہے۔ اِن نظموں کو سب لوگ آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔

قصائد میں ایک متعصّب شخص کی ہجو پر سب سے پہلے نظر پڑتی ہے۔ جس کے قافیے درخشانی نورانی وغیرہ ہیں۔ اس سے متصل مولوی ساجد کی ہجو ہے۔ جس کے قافیے الحاد اور فولاد ہیں۔ ان دونوں نظموں میں مذہبی تعصب کی جھلک ہے اس لئے وہ نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔

تیسری ہجو گھوڑے کی ہے جس کے قافیے ہیں سوار اور شمار۔ سودا نے اپنے اس قصیدہ کا نام تضحیک روزگار رکھا ہے۔ یہ قصیدہ اپنی شوخی اور لطافت ہی کی وجہ سے اہم نہیں ہے۔ بلکہ سودا نے اس میں اپنے زمانے کے فوجی نظام کی خرابی بھی ضمناً بیان کی ہے اِس لحاظ سے بھی اس قصیدہ کو اہمیّت حاصل ہے۔

تمہید سودا نے یوں اٹھائی ہے کہ آج کل زمانے کی حالت بدلی ہوئی ہے جن لوگوں کے طویلے میں عراقی اور عربی گھوڑے بندھے رہتے تھے آج کل وہ اس قدر مفلس ہو گئے ہیں کہ موچی سے اپنی جوتی ادھار کے طریقے پر گٹھواتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے لوگ بھی ہیں جو مفلس تو نہیں ہیں مگر کنجوسی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ایسے ہی ایک دوست ہمارے ہیں (نام نہیں لیا) وہ اس قدر بخیل ہیں کہ اگر کوئی شخص نہار منہ اُن کا نام لے تو شاید دن بھر اُسے کھانا نہ ملے۔ سو روپیہ اُن کی تنخواہ ہے۔ مگر گھوڑا جو اُن کے پاس ہے دانہ گھاس سے محروم ہے۔ اُسکی خبر گیری کے لئے کوئی سائیس بھی نہیں رکھا۔ یہ گھوڑا مٹی کا کھلونا ہے جو شیر خوار بچّوں کے ہاتھ میں دیکھا جاتا ہے۔ فاقو

سے اُس کے ضعف کا یہ حال ہے کہ اگر وہ زمین پر بیٹھ جائے تو پھر اپنی نعل کے نقش کی طرح زمین سے بغیر مٹائے نہیں اٹھ سکتا۔ اگر اُس کا سوار کبھی بازار جا نکلتا ہے تو قصاب پوچھتے ہیں کہ آپ ہمیں کب یاد کریں گے۔ اور اُدھر چمار کہتے ہیں جناب! ہم بھی امیدوار ہیں۔ آگے شاعرانہ انداز سے کہتے ہیں کہ یہ گھوڑا رات کے وقت تاروں کو دانے سمجھ کر بے قراری کے ساتھ آسمان کو دیکھتا ہے۔ اور دن کے وقت سورج کی شعاعوں کو گھاس کا مٹھا سمجھ کر بار بار زمین پر سر پٹکتا ہے۔ وہ اس قدر ضعیف ہے کہ اگر اُس کے تھان کی میخیں مضبوط نہ ہوں تو عجب نہیں کہ ہوا کے جھونکے سے اڑ جائے۔ اُس کے جسم میں نہ ہڈی ہے نہ گوشت۔ سانس اُس کے نتھنوں سے اِس طرح نکلتا ہے گویا کوئی لہار اپنی دھونکنی دھونک رہا ہے۔ خارش کے سبب سے اس کے بدن پر زخم ہیں۔ اِس لئے کوئی نہیں پہچان سکتا کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ ہے۔ زخموں پر جو مکھیاں کثرت سے بیٹھتی رہتی ہیں اس لحاظ سے لوگوں نے اُس کا رنگ مگسی قرار دیا ہے۔

مجھے ایک دن کسی ضرورت سے کہیں جانا تھا۔ یہ دوست میرے ہمسائے میں رہتے ہیں۔ میں نے گھوڑا اُن سے مستعار لینا چاہا۔ انہوں نے فرمایا کہ ایسے ہزار گھوڑے تم پر نثار ہیں، مگر یہ اس قابل نہیں کہ کوئی اس پر سوار ہو سکے۔ یہ تو تھان پہ لاتیں مارتا رہتا ہے۔ یہ حشری گھوڑا اس قابل البتہ ہے کہ اگر دجّال قیامت کے قریب نمایاں ہو تو اسے گدھا جان کر اس پر سوار ہو۔ ہر وقت زمین پر سر جھکائے رہتا ہے۔ اپنی ہی ٹھوکروں سے اس کے سب دانت جھڑ گئے ہیں۔ اس بڈھے گھوڑے کی عمر وہی شخص بتا سکتا ہے جو بیابان میں ریت کے ذروں کو گن سکے۔ تاریخ کی رو سے البتہ میں کہہ سکتا ہوں کہ شیطان اسی پر سوار ہو کر جنت سے نکلا تھا۔

اس کی چال کی سستی کا بیان مالک کی زبان سے سودا نے اس طرح کیا ہے۔

کم رَو ہے اسقدر کہ اگر اس کی نعل کا	لوہا گلا کے تیغ بنائے کوئی لُہار
ہے مجھ کو یہ یقین کہ وہ تیغ روزِ جنگ	رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقتِ کارزار
مانندِ اسپِ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں	جز دستِ غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار

ایک دن یہ گھوڑا ایک برات میں مستعار لیا گیا تھا دولہا جو اُس پر سوار ہو کر دلہن کے گھر کی طرف چلا نوجوان تھا، مگر دلہن کے گھر تک پہنچتے پہنچتے بوڑھا ہو گیا۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے جو سننے کے قابل ہے۔ جب مرہٹوں کی فوج دہلی پر حملہ آور ہوئی تو شاہی نقیب دیگر سواروں کی طرح میرے پاس بھی آیا۔ اور اس نے کہا۔ مدت سے گھر بیٹھے مفت تنخواہ لے

رہے ہو۔ اب کام کا وقت آیا ہے۔ اس پر سوار ہو کر میدانِ جنگ کو جاؤ۔ مجبوراً میں نے اُس کی پشت پر زین رکھا اور ہتھیار باندھ کر سوار ہوا۔ مگر اُس دن کی کیا حالت بیان کروں - خدا دشمن کو بھی ایسا ذلیل نہ کرے - میرے دونوں ہاتھ میں چابک تھے - منہ میں باگ تھی - ایڑیاں ٹک ٹک کرنے سے زخمی ہوگئی تھیں۔ آگے سے سائیس توبرا دکھاتا تھا۔ پیچھے سے نقیب لکڑی مارتا تھا۔ مگر وہ نہ ہلتا تھا نہ چلتا تھا - عام لوگ اس تماشے کو دیکھ کر جمع ہوگئے - کوئی کہتا تھا۔ میاں پہیے لگاؤ پہیے - کوئی کہتا تھا اگر ناؤ کی طرح بادبان لگا کر چھوڑ دو تو ہوا کے زور سے یہ آپ چل پڑے گا۔ کوئی اُسے پہاڑی بکری بتاتا تھا کوئی ولایتی گدھا قرار دیتا تھا - کوئی کہتا تھا میاں تم سے کیا گناہ ہوا ہے۔ جو کوتوال نے تمہیں اس گدھے پر سوار کیا ہے - طرفہ یہ کہ اُس روز اتفاق سے ایک دھوبی اور ایک کمہار کا گدھا کھویا گیا تھا - دونوں وہاں آ نکلے ہر ایک نے اُس کو اپنا گدھا خیال کیا - دھوبی کان پکڑتا تھا اور کمہار اُس کی دم کھینچتا تھا - بازار کے لڑکے اُسے ریچھ سمجھ کر تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہوگئے - ایک شریر لڑکے نے کہا کہ تو اگر مجھے بھی اس پر چڑھا دے تو میں تجھے ایک ٹکا دوں گا۔ کتے اُس کے گرد و پیش جدا بھونک رہے تھے - میں اپنی مصیبت پر رو پڑا - خدا سے کہا کہ اب میں دھوبی اور کمہار سے جھگڑوں یا لڑکوں کو جواب دوں - کتوں سے لڑوں یا اپنا سر پیٹوں - خدایا میری اس حالت پر رحم کر - بارے میری دعا قبول ہوئی اور میں کسی نہ کسی طرح میدانِ جنگ میں جا پہنچا۔ میں نے اُس وقت دعا کی کہ الٰہی جو گولہ پہلے میدان میں چلے وہ اس گھوڑے کے آ لگے اور اس کا کام تمام کردے - میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ایک مرہٹہ سپاہی میرے مقابلے میں آ پہنچا - گھوڑا تو پہلے ہی بے کار تھا جب میں حریف پر ڈپٹ کر حملہ کرتا تھا تو مجھے اپنے پاؤں ہی سے دوڑنا پڑتا تھا۔ جس طرح کوئی لڑکا جو لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہو خود ہی کودتا اچھلتا ہے۔ جب میں نے یہ کیفیت دیکھی تو ناچار جوتیاں ہاتھ میں لیں اور گھوڑا بغل میں مار وہاں سے بھاگ نکلا -

مثنویوں میں چند ہجویہ ہیں - ان میں سے ایک مثنوی میں شیدی فولاد خاں کی ہجو ہے - جو دہلی کا کوتوال ہو گیا تھا - یہ رشوت خوار تھا، اس کے زمانے میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ سودا کہتے ہیں کہ آجکل شہر میں چور ٹھگ اور اچکے دکھائی دیتے ہیں - چاوڑی بازار کی جو حالت آج کل ہے اُس کے سامنے تراوڑی کی رہزنی مات ہے - خاص بازار والوں نے تو نزدک والوں کے بھی کان کاٹ لئے ہیں۔ اگر کوئی دمڑی کا سودا لینے بازار جاتا ہے تو پگڑی کھو کر سر پیٹتا آتا ہے - چور - اچکے، ٹھگ - سب کوتوال سے ملے ہوئے ہیں - رات کو جب وہ گشت کے لئے نکلتا ہے تو نرسنگا بجانے والا گویا چوروں سے کہتا ہے کہ صبح کو کوتوال کا حصہ پہنچا دینا - ایک دن کوتوال نے طنز کے طور پر بدمعاشوں سے کہا کہ تم میری چیزیں بھی لے جاتے ہو - اور بازار میں اُن کو بیچ ڈالتے ہو - آیندہ ایسا کرو کہ میری چیز کی جو قیمت بازار

میں لگے وہ چیز اسی قیمت پر میرے ہاتھ بیچ دیا کرو۔ یہ سُن کر ایک نے کہا کہ آپ کے سر پر جو پگڑی ہے مجھے اس کے دس روپیہ ملتے ہیں۔ آپ اُس کی کیا قیمت لگاتے ہیں۔ دوسرے نے کہا میں آپ کا دوشالہ چرانے کے لئے رات بھر جاگا ہوں۔ میری محنت پر نظر کر کے جو کچھ مناسب سمجھیں آپ دے ڈالیں۔ غرضکہ اس کوتوال کے سبب سے شہر میں ایک ہنگامہ برپا ہے۔ رات کو نرسنگا کیا پھکتا ہے گویا صورِ اسرافیل ہے۔ مردے بھی خواب عدم سے چونکتے ہیں۔ چوروں کے ڈر سے فتنہ بھی جاگتا رہتا ہے۔ چاند کی آنکھ بھی رات بھر کھلی رہتی ہے شام کے وقت شمع سے بھی چور آ لگتا ہے (شمع کے ایک طرف سے گھل جانے کو چور کہتے ہیں) شمع کے طرہ کا ذکر ایک طرف۔ آفتاب کی دستار بھی رات کے وقت گم ہو جاتی ہے۔ شبنم جو صبح کے وقت پھول پر ہوتی ہے وہ بھی غنچے کے بقچے کو روتی ہے۔ جو گم ہو گیا ہے آئینہ بھی اپنے گھر کی چوکیداری کرتا ہے۔ خطرہ سے کوئی خالی نہیں ہے۔ اس لئے میخانے میں بھی ہائے وہو کا شور سنائی دیتا ہے۔ شیخ جی رات کو جاگتے رہتے ہیں۔ عبادت کے لئے نہیں بلکہ چوروں کے ڈر سے۔ اگر کوئی کوتوال سے چوروں کی شکایت کرتا ہے تو وہ ہنس کر کہتا ہے میں کیا کر سکتا ہوں۔ چور سے کوئی جگہ خالی نہیں۔ کیا امیروں کے گھر میں چور محل نہیں ہے (داشتہ عورت جو منکوحہ نہ ہو اس کو چور محل کہتے ہیں) معشوقوں کے ہاتھ میں بھی مہندی کا چور ہے۔ (مہندی لگانے کے وقت جو سفیدی رہ جاتی ہے اس کو مہندی کا چور یا دزدِ حنا کہتے ہیں) میں خود بھی جب مسندوں پر چڑھ کر جاتا ہوں تو وقت پر جی چراتا ہوں۔ کسی کی کوئی چیز اب کیونکر بچ سکتی ہے۔ جب کہ خدا کا گھر بھی چور سے خالی نہیں دیکھو مسجد کا ملا بھی صبح خیز یا ہے (وہ چور جو صبح کے وقت جنگل میں مسافروں کے جاگنے سے پہلے اُن کا مال و اسباب لے جاتا ہے صبح خیزیا کہلاتا ہے) چوری کا رتبہ آج کل اس قدر بلند ہے کہ آسمان کی چھت پر بھی کہکشاں کی کمند پھینکی گئی ہے۔

ایک مثنوی میں راجہ نرپت سنگھ کے ہاتھی کی ہجو کی ہے اس کی تمہید بھی دلچسپ ہے اور خاتمہ بھی معنی خیز ہے تمہید میں اپنے شاعرانہ سخن کو فیل معنی بتایا ہے فرماتے ہیں کہ یہ ہاتھی ہمیشہ میرے ہاں بندھا رہتا ہے۔ سخن فہموں کا دماغ اس کے لئے گشت کا میدان ہے۔ وہ اس قدر پاک طینت ہے کہ خاک پر پاؤں نہیں رکھتا۔ سبک رفتاری کا یہ حال ہے کہ کاغذ پر جہاں تک دوڑاؤ دوڑتا چلا جاتا ہے۔ لوگ جو آفرین کرتے ہیں یہ اُس کے لئے آوازدار ہے۔ جلالتِ شان کے سبب وہ اپنی مستک پر سیندور کبھی نہیں لگواتا۔ قد و قامت میں وہ عرش سے بھی اونچا ہے۔ دل اس کے لئے مہاوت ہے۔ نالہ بھالہ بردار کا کام دیتا ہے۔ آہ شرربار اس کے لئے آتشبازی کی چرخی ہے۔ نہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ اور کسی کو نظر بھی نہیں آتا۔ اگر خدا کسی کو ہاتھی دے تو ایسا۔ نہ کہ راجہ نرپت کے ہاتھی جیسا۔ دیہ گریہ ہے اور کیسی

دلچسپ گریز ہے) راجہ کا ہاتھی نہایت شریر ہے۔سرخ کلاوہ اس کے گلے میں نہیں ہے۔بلکہ یہ خلقت کا خون ہے۔جو اس کی گردن پر ہے۔لڑائی کے دن وہ نیل کا داغ (یعنی کلنک کا ٹیکا) ہے۔زنجیر سونڈ میں پکڑ کر اپنی ہی فوج پر پل پڑتا ہے۔اگر وہ اپنی ہتیائی پر آجائے تو پھر بھالا بردار کتنے ہی برچھے چلائیں اور آتشبازی کی کتنی ہی چرخیاں چھوڑی جائیں وہ اپنی شرارت اور سرکشی سے باز نہیں آتا۔آدمیوں کے سروں کو وہ اپنے قدموں کے تلے چنوں کی طرح دل ڈالتا ہے۔خدا کو شاید اہلِ زمین کا زندہ رکھنا منظور تھا کہ اس ہاتھی کا مالک مفلس ہوگیا۔اب اس کے لئے چارہ کہاں۔فاقہ مستیاں کرتا ہے۔بدن کی کھال اس طرح سکڑ گئی ہے۔جیسے کسی خیمے کی رسیاں ڈھیلی پڑجائیں ہڈیاں نمودار ہیں۔ہر پسلی نردبان کی طرح نظر آتی ہے اب اُس کا مٹا پا جاتا رہا ہے۔وہی مثل ہے کہ ہاتھی نکل گیا اور دم رہ گئی۔تاہم اب بھی وہ اس قدر شریر ہے کہ اگر چھوٹ جائے تو معلوم نہیں کہ آتشبازی کے ہاتھی کی طرح کس کس کے گھر کو آگ لگائے۔میں نے ایک دن اُس کے مہاوت سے کہا کہ اگر اُس کو بیچ کر ایک گدھا بھی خرید لیا جائے تو اس سے کہیں بہتر ہے۔اس نے کہا اسے کون خرید سکتا ہے۔اُس کی پیٹھ بلند ہے مگر پیٹ کاواک ہے۔ہاتھی ہو تو کوئی اُس کو لے یہ تو بے ایمان کی مسجد کی محراب ہے۔اُسے تم ایک بوسیدہ اور پرانی چھت سمجھو چار پاؤں گویا چار ستون ہیں اور سونڈ گویا اڑواڑ ہے جو چھت کے سنبھالنے کے لئے کھڑی کردی گئی ہے۔اگر یہ بیٹھ جائے تو بغیر راج مزدور کی مدد کے نہیں اُٹھ سکتا۔یہ ہر بار کانوں کو اس طرح ہلاتا ہے گویا کوئلوں کا ایک انبار ہے۔جسے پنکھوں سے دھونک رہے ہیں۔کھانے کے وقت یہ اپنے تئیں ہاتھی بتاتا ہے اور من بھر ملیدہ روز آ طلب کرتا ہے مگر سواری کے وقت اپنے آپ کو فیل مرغ بتاتا ہے۔منحوس اس قدر ہے کہ سنیچر (زحل ستارہ جو منحوس ہے) بھی اس کے قدم چومتا ہے۔اگر کوئی شخص اُس کی پیٹھ پر سوار ہو تو گویا اُس کو بارود کے ڈھیر پر اڑانے کیلئے بٹھادیا ہے۔خدا کرے یہ مرے یا مارا جائے۔مہاوت کی یہ باتیں سُن کر ایک شخص کی حالت یکایک متغیر ہوگئی سبب پوچھا گیا تو اس نے کہا یہ ہاتھو، شریر ہے۔فیلبان کی روزی کا مدار اُس کے زندہ رہنے پر ہے۔تاہم وہ اس کا مرنا چاہتا ہے میرا نفس بھی اس ہاتھی کی طرح ظالم اور شریر ہے۔مگر جتنا کہ فیلبان اس شریر ہاتھی کی ہلاکت کے درپے ہے اتنا ہی میں اپنے نفس کی پرورش کے درپے ہوں۔گویا میری ہمت اس فیلبان کی ہمت سے بھی گئی گزری۔(یہ مثنوی کا خاتمہ ہے۔اور کیسا سبق آموز خاتمہ ہے)

ایک مثنوی ہے جس میں سودا نے ایک بخیل دولتمند کی ہجو کی ہے اس کی تمہید بھی دلچسپ ہے۔کہتے ہیں کہ آسمان کا تنور خدا کے نور سے روشن ہے۔اگر وہ چاہے تو سورج اور چاند کو روٹی اور پنیر کی شکل میں تبدیل کرسکتا ہے۔اس

نے آسمان کے دسترخوان پرستاروں کے نُقل چن دیئے ہیں۔ اُس نے ہزاروں نعمتیں انسان کو عطا کیں جن کا شکر ادا نہیں ہوسکتا۔ اُس کے فضل سے کسی نعمت کی کمی نہیں۔ مگر ہماری ہی طبیعت خسیس اور دنی ہو تو اسکا کیا علاج ہے۔ یہ کہہ کر سودا نے یہ نقل بیان کی ہے کہ میرے ایک دوست اتفاقاً ایک امیر کے ڈیرے پر جا نکلے تھے۔ ان کے پہنچتے ہی یکایک آسمان پر چاروں طرف سے بادل امنڈ آئے۔ امیر نے پہلا سوال یہ کیا کہ تمہارے ساتھ ٹٹو یا بارانی نہیں ہے؟ گھر سے چلتے وقت اس کا خیال کیوں نہیں رکھا۔ میرے دوست نے کہا مجھے مینہ کا حال معلوم نہ تھا۔ ورنہ بارانی ضرور لاتا۔ یکایک مینہ برسنے لگا۔ امیر نے بارانی سامنے لا رکھی۔ پھر کہا۔ یہ ہماری تقدیر کی خوبی ہے کہ حسنِ اتفاق سے ایک دوست مدت کے بعد ہمارے مکان پر آئے۔ اور اسی وقت مینہ برسنے لگا۔ اور اُس کو اپنے مکان پر بھیگتا جانا پڑے۔ میرے دوست اب بھی اس گفتگو کی رمز کو نہیں سمجھے اور سادگی سے کہنے لگے۔ ایسی کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے مکان پر بھیگتا جاؤں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے، اگر مینہ نہ کھلا تو میں رات کو آپ ہی کے مکان پر رہ جاؤں گا۔ یہ بات سن کر بخیل امیر کی تو گویا جان ہی نکل گئی۔ بارش کا سماں دیکھ کر گھبرا گیا اور کہنے لگا۔ یارو تیل چلاؤ (یہ بارش تھمانے کا ٹوٹکا ہے۔ بارش کے پانی پر تیل ڈال کر بہاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جس طرح پانی تیل پر پھیل کر پھٹ جاتا ہے۔ اسی طرح اس ٹوٹکے سے بادل پھٹ جاتے ہیں)، یا شیخ ڈونڈو بناؤ (یہ بھی بارش تھمانے کا ٹوٹکا ہے۔ کپڑے کا ایک مسافر بناتے اور اس کی کمر سے ایک گٹھڑی باندھ کر بارش کے پانی میں لکڑی کے ذریعہ سے کھڑا کر دیتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ ایسا کرنے سے بارش تھم جاتی ہے) کبھی کہتا تھا۔ دیکھو تو کہیں سے آسمان بھی نظر آتا ہے۔ اگر سورج نکل آئے تو ہمارے گھر میں تو عید ہو جائے۔ ایک نوکر نے آقا کے خوش کرنے کو کہا۔ ہاں آسمان ایک جگہ سے تو خالی نظر آتا ہے۔ امیر نے کہا۔ خدا تیری زبان مبارک کرے۔ مگر جب پرنالے چلنے لگے تو جھنجھلا کر کہنے لگا مینہ تو کمبخت ایسا برستا ہے کہ اگر درخت اور پہاڑ بھی ڈوب جائیں تو کچھ عجب نہیں۔

غرض کہ رات آگئی۔ مگر مینہ نہ تھما۔ کھانے کا وقت آیا تو بہانہ کر کے اُٹھا اور ایک نوکر سے کہا۔ جا ضرور میں آفتابہ رکھو۔ مہمان کے کان میں چلتے وقت کہہ گیا کہ اگر بھوک لگے تو بکاول کو حکم دے کر کچھ پکوا لینا۔ میرے دوست نے بکاول کو بلا کر پوچھا کھانے کو کچھ تیار ہے یا نہیں۔ کہا کچھ تیار نہیں۔ میرے دوست نے کہا۔ مودی سے جنس منگواؤ اور کچھ کھانا میرے لئے پکواؤ۔ کہا مودی میری بات کب مانتا ہے۔ جب کبھی اس کا حساب ہوتا ہے اس کو ہمیشہ جھینکنا پڑتا ہے۔ قصاب جدا مجھ پر خفا ہوتا ہے۔ ترکاری والا جدا۔ باورچی۔ رکابدار اور کبابی کا بھی یہی حال ہے۔ باورچیخانہ ہمیشہ ٹھنڈا پڑا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی سردی سے باورچیوں کی ناک بہتی رہتی ہے۔ لکڑیاں اسی غم سے

جلتی ہیں۔ دیگوں کے سینے جوش مارتے ہیں۔ سرپوش منہ ڈھانپ کر رویا کرتے ہیں۔ باورچی کہتے ہیں کہ ہم یہاں رہ کر اپنا فن بھول جائیں گے تو آپ کے بعد کیا کر کے کھائیں گے۔ تمام دیگچے چولہوں پر سرنگوں پڑے رہتے ہیں۔ دیگچوں کی جدائی کے سبب کفگیروں کے سینے چھلنی ہو رہے ہیں۔ دنیا میں سو عیدیں ہوں مگر ان کے گھر سے رمضان کا مہینا کبھی نہیں ٹلتا۔ غرض کہ اس گھر کا باورچی خانہ گویا آبدار خانہ ہے۔ جس تنور سے نوح کا طوفان نمودار ہوا تھا، شاید ہمارے آقا کی نانی کا تنور تھا۔ میاں کے صاحبزادے نے ایک دن اپنے دوست کی دعوت کر دی۔ طرح طرح کے کھانے تو کیا کھلاتے۔ سالن کی ایک رکابی اور روٹی سامنے لا رکھی۔ اس پر ہمارے آقا ایسے خفا ہوئے کہ اُس کو عاق کرنے اور اس کی ماں کو طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے۔ غصے میں کہا۔ اس کی ماں اس کی جگہ اگر پتھر جنتی تو اچھا تھا۔ میرا بیٹا ہو کر اس قدر ابتر نکلے۔ اس کا جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ اس کا دادا بھی اگرچہ عیاش تھا مگر وہ پھر بھی ایک سلیقے سے زندگی بسر کرتا تھا۔ گھر میں ایک نوکر رکھ چھوڑا تھا۔ اس کو حکم تھا کہ رات کو گھر گھر پھر کر بھیک مانگے۔ چنانچہ وہ ایسا ہی کرتا تھا اور جو ٹکڑے گھروں سے بھیک مانگ کر جمع کرتا۔ آقا کے سامنے لا رکھتا تھا۔ وہ اُن میں سے اچھے چن چن کر آپ کھاتے تھے اور برے نوکر کی تنخواہ میں لگاتے تھے۔ اس سلیقے سے دادا پردادا نے جو کچھ کمایا تھا یہ ناخلف اب اس کو برباد کر ڈالے گا۔ میں تو اپنے تئیں ہی فضول سمجھتا تھا۔ مگر یہ تو مجھ سے بھی زیادہ نامعقول نکلا۔ یہ گرے پیسے سب اڑا دے گا۔ اور گھر کی اینٹیں تک بیچ کھائے گا۔ اس لڑکے کے پردادا کا یہ حال تھا کہ اُن کا ایک دوست ایک دن شراکت میں کھچڑی پکوا لایا۔ جب کھانے بیٹھے تو ان کے دوست نے ایک دو نوالے ذرا بڑے کھائے۔ اس پر وہ خفا ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے، یہ شراکت کیسی۔ میرے سو نوالے اور تمہارا ایک نوالہ۔ غرض کہ ہمارے بزرگوں کا تو یہ چلن تھا۔ یہ لڑکا لوگوں کی فضول ضیافتیں کرتا ہے۔ خیر اس وقت کی ضیافت میں جو کچھ خرچ ہوا ہے وہ اس لڑکے کے اتالیق کی تنخواہ میں سے کاٹ لینا چاہیے۔ یہ کہہ کر بکاول نے کہا۔ یہاں کا حال تو آپ نے سن لیا۔ اب آپ اگر میرے غریب خانے پر چلیں تو البتہ میں سب کچھ مہیا کر سکتا ہوں۔

جس طرح بخیل کی ہجو میں سودا نے تخیل کی قوت سے کام لیکر مذمت کے نئے نئے پہلو نکالے ہیں۔ اسی طرح میر ضاحک کی ہجو میں اپنی قوتِ متخیلہ کا کمال دکھایا ہے۔ میر صاحب کو اکول یعنی پیٹو یا بسیار خوار قرار دیا ہے۔ اس مثنوی کے شروع میں فرماتے ہیں کہ زمانے نے ایک بار میر صاحب کی ضیافت کر کے اُس کے سامنے ایک لمبا دسترخوان بچھایا جو مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا تھا۔ اور اس پر تمام دنیا کی نعمتیں چن دی گئی تھیں۔ مگر کسی بات پر زمانے سے

اُس کی اَن بن ہوگئی۔ زمانے نے گردن پکڑ کر دسترخوان سے اٹھا دیا۔ ابھی وہ اس دسترخوان کی نعمتوں پر ہاتھ ڈالنے بھی نہ پایا تھا کہ ہونٹ چاٹتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اب زمانہ اس سے پھر گیا ہے۔ کھانے کو گھر میں کچھ نہیں ملتا۔ مرغیوں کی طرح اب کنکریاں چننے پر مدار ہے۔ آدھ سیر آٹے کا تو خدا بھی کفیل ہو سکتا ہے مگر اس کا پیٹ تو عمرو عیار کی زنبیل ہے۔ اگر کسی گھر سے دیگچی کھڑکنے کی آواز آتی ہے تو وہ اس کے دروازہ پر اس طرح اڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ رستم بھی اُسے اٹھا نہیں سکتا۔ اگر کسی جگہ کھانے کی بو پاتا ہے تو مکھی کی طرح دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنے لگتا ہے۔ اگر کسی کے گھر میں آگ لگے اور دھواں اٹھتا نظر آئے تو لوگ تو آگ بجھانے کو دوڑتے ہیں۔ مگر یہ رکابی ہاتھ میں لے کر کھانا مانگنے کو دوڑتا ہے۔ بنیے کی دکان پر جاتا ہے تو اُسے باتوں میں لگا لیتا ہے اور آنکھ بچا کر بندر کی طرح اپنے کلّے بھر لیتا ہے۔ اگر کسی شادی میں جاتا ہے تو لوگ ناچ رنگ سے جی بہلاتے ہیں۔ مگر وہ بار بار کھانے کے متعلق سوال کرتا ہے۔ محلے کا نان بائی شکایت کرتا ہے کہ ضاحک چوری سے میرے رفیدہ کو چاٹ جاتا ہے۔ اگر کسی جگہ دعوت میں بلایا جاتا ہے اور کھانے میں ذرا دیر ہوتی ہے تو میزبان سے کہتا ہے۔ میرے پیٹ کی بھی تمہیں کچھ فکر ہے آجکل میری بھوک ذرا کم ہوگئی ہے۔ مگر خیر تم بالفعل سو پچاس آدھ سیری روٹیاں تنور سے منگوا دو کیونکہ ابھی کھانا پکنے میں دیر ہے۔ کھانے پر بیٹھتا ہے تو اس طرح نوالے مارتا ہے۔ جیسے کوئی پٹے باز پٹے کے ہاتھ جھاڑتا ہو۔ جب تک دیگچی نہ چاٹ لے کھانے سے منہ نہیں موڑتا۔ ایک دفعہ ایک دوست نے شادی میں بلایا، لوگ تو تفریح میں مشغول تھے مگر وہ کبھی چونکتا تھا۔ کبھی اونگھنے لگتا تھا۔ کبھی باورچی خانے کی بُو سونگھتا تھا۔ اسی حال میں اس کی آنکھ لگ گئی خواب میں دیکھا کہ کھانے کا دسترخوان اُس کے سامنے بچھا ہے۔ اتفاق سے ایک اور آدمی بھی کھانے پر آ بیٹھا۔ ضاحک کو غصہ آیا اور اس پر حملہ آور ہوا۔ نیند میں جو ہاتھ مارا تو ایک شخص جو ضاحک کے قریب بیٹھا تھا اس کے سر پر دھول پڑی اور اس کی پگڑی دور جا پڑی۔ یہ حرکت دیکھ کر وہ نہایت برہم ہوا۔ قریب تھا کہ کشت و خون ہو جائے۔ مگر صاحب خانہ نے کہا۔ ذرا صبر کرو۔ پھر ضاحک سے اس کی حرکت کی وجہ دریافت کی۔ اُس نے اپنا خواب بیان کیا۔ اس پر سب ہنسنے لگے اور معاف کر دیا۔

ایک مثنوی میں حکیم غوث کی ہجو کی ہے۔ یہ بھی نہایت دلچسپ اور لطیف ہے۔ کہتے ہیں کہ صدر بازار میں ایک طبیب غوث نامی ہے جو دنیا میں ہلاکو کا قایم مقام ہے۔ یہ شخص روم کا باشندہ ہے۔ جب سے اس نے طبابت میں قدم رکھا ہے۔ روم سے شام تک تمام ملکوں کو بے چراغ کر دیا ہے۔ ہندوستان میں اس کا نام ملک الموت مشہور ہے۔ اس کا قلم خنجر براں کا کام کرتا ہے۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو برابر قتل کرتا ہے۔ اگر وہ نسخہ لکھنے کا پیشہ اختیار

نہ کرتا تو بہشت اور دوزخ انسانوں سے نہ بھرتے۔ جب سے اس نے لوگوں کو دوا دینی شروع کی ہے موت اپنے کام میں مشغول ہے اور شفا معطل ہوگئی ہے۔ اسی کے بھروسے پر گورکن قرض لیتے ہیں۔ اگر وہ کبھی بیمار ہوتا ہے اور اپنا علاج آپ کرتا ہے تو گورکن مردہ شو اور تابوت گر اس کا گھر گھیر لیتے ہیں اور دہائی دے کر کہتے ہیں کہ تو اپنی دوا آپ نہ کر۔ اگر تو مرگیا تو ہمارا روزگار بند ہو جائے گا۔ یا کوئی اپنے جیسا طبیب بتا کہ ہم اپنی روزی کی طرف سے مطمئن ہوکر تیری قبر پر چراغ جلایا کریں اور پھول چڑھایا کریں۔

اس کی تشخیص عجیب ہے۔ ایک شخص کو نزلہ تھا۔ نبض دیکھ کر اس نے دق تجویز کی اور نسخہ لکھ دیا۔ مریض نسخہ کو لے کر عطار کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا تمہیں کیا بیماری ہے۔ کہا طبیب نے دق بتائی ہے۔ عطار نے کہا اس نسخہ میں تو معجون زرنباد ہے۔ ذرا اس طبیب کا نام و نشان تو بتا۔ مریض نے اس کا پتا دیا۔ عطار نے کہا۔ وہ تو ہلاکو ہے۔ طبیب کا ہیکو ہے۔ ایک دوست نے مجھ سے کہا تھا کہ چل تجھے غوث سے ملادوں۔ اگر اس کے نسخے تیری دکان پر آیا کریں گے تو تیری دکان خوب چمک جائیگی۔ چنانچہ وہ دوست مجھے اس کے پاس لے گیا۔ میں نے اس کے گرد بہت سے بیماروں کا ہجوم دیکھا ایک بیمار کی نبض دیکھ کر اس نے قبض بتایا اور سفوف حجر الیہود پھانکنے کی صلاح دی۔ غذا یہ بتائی کہ ماش کے آٹے کی روٹی پکاؤ اور پوست خشخاش کی ترکاری سے کھایا کرو۔ ایک مریض کو پیچش بتائی اور کرٹول دوا تجویز کی۔ ایک اور مریض کی بیماری ہیضہ تشخیص کی اور اسبغول نسخہ میں لکھا۔ جنون کے کے ایک مریض کے لئے اونٹ کا دودھ بتایا۔ ایک مریض کو استسقا (جلندھر) کی بیماری بتائی اور کہا تم اپنی فصد کراؤ اور گلتّھی دہی ملا کر کھایا کرو۔ دنبل کا علاج بتایا کہ اس کے زخم کو رفو کراؤ۔ ان سب بیماروں سے فارغ ہوکر ایک ڈولی کے پاس جا بیٹھا۔ اور مریضہ کی نبض دیکھ کر اس کی خادمہ سے کہا یا تو اس کو دردِ سر ہے یا دردِ کمر ہے۔ مگر مجھے زیادہ تر نقرس کا اندیشہ ہے۔ آخر کار اس نے مریضہ کا مرض صرع بتایا۔ اور ماء القرع (آبِ کدو) دوا تجویز کی۔ پھر کہا کہ آش جو کے سوا کھانے کو اور کچھ نہ دینا۔ خادمہ نے کہا اس کے لئے تو یہ دوا زہر ہے۔ اس کو تو لقوہ اور فالج کی بیماری ہے۔ غوث نے خفا ہوکر کہا تو نے نہ سدیدی پڑھی نہ شیخ کا قانون پڑھا اس پر حکیموں سے بحث کرتی ہے۔ تو پانچ روپیہ کی کنیز تجھے دوا اور بیماری کی کیا تمیز۔ مجمع میں سے ایک شخص نے کہا۔ حکیم جی کا کیا گناہ۔ مریضہ پردہ میں ہے۔ اس کی بیماری کا حال کیونکر معلوم ہو۔ اس طنز کو حکیم جی سمجھ گئے اور دونوں میں خوب جھڑپ ہوئی۔ یہ کہہ کر عطار نے مریض سے کہا خبردار ایسے حکیموں کی دوا استعمال نہ کرنا۔

باقی مثنویوں میں ایک میاں فوقی کی ہجو میں ہے۔ ایک فدوی کی ہجو میں اور ایک میں مرزا فیضو کی چیچک

کا مرثیہ ہے۔ ان میں سے کوئی مثنوی اہم نہیں۔

غزلوں میں سے ایک غزل میں میاں حسرت عطار کا خاکہ اڑایا ہے۔ ترجیع بندوں میں سے ایک میں ضاحک کی ہجو ہے۔ ایک میں فدوی کی اور ایک میں مولوی ندرت کشمیری کی دختر کی۔ بارہ مخمس ہیں جن میں ضاحک۔ میر علی ہاتف۔ ندرت کشمیری اور مرزا علی وغیرہ کی ہجو کی گئی ہے۔ مگر ان سب میں سے کوئی نظم بھی ایسی نہیں ہے جو قابل ذکر ہو۔ صرف وہی نظمیں زندہ رہنے کے قابل ہیں۔ جن کا ذکر کیا گیا ہے ان میں بھی جہاں کہیں فحش ہے خلاصہ میں ہم نے اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

سلیم

بالآخر میں آزاد ہو گیا ہوں

بالآخر میں آزاد ہو گیا ہوں۔ مصیبت میرے سر پر ٹوٹ پڑی۔ طبل ہتک بج چکا۔ میرا مرتبہ خاک میں مل گیا۔ اب میرے رستے میرے سامنے کھلے ہیں۔ میرے پر پرواز آسمان کی تمنا سے بھر رہے ہیں۔ میں نیم شب کے ٹوٹنے والے تاروں کے ساتھ سایۂ عمیق میں غوطہ زن ہونے کو جا رہا ہوں۔ میں موسم گرما کے اُس طوفان زدہ بادل کی مانند ہوں جو اپنا زرّیں تاج پھینک کر ایک برقی زنجیر پر بجلی کی تلوار آویزاں کئے ہوئے ہو۔

اک پر وحشت مسرت میں مَیں حقیر لوگوں کی گرد آلود راہ پر دوڑتا ہوں اور تیرے آخرین خیر مقدم کے زیادہ قریب ہوا جاتا ہوں۔ بچہ اپنی ماں کو پا لیتا ہے جب وہ اپنی ماں کے بطن کو چھوڑے۔ جب میں تجھ سے جدا ہوتا ہوں۔ جب میں تیرے گھر سے باہر نکال دیا جاتا ہوں۔ تو آزاد ہو کر میں تیرا پیارا چہرہ دیکھ سکتا ہوں۔

"گلچیں"

سُروں کے رنگ

ہندی سنگیت میں سُروں کے رنگ بیان کئے گئے ہیں۔ اور اب تو ایک مشین بھی اس قسم کی ایجاد ہوئی ہے جس سے آواز کے رنگ دکھائے جاتے ہیں۔ چند سال ہوئے لاہور میں ایک سائنٹیفک کانفرنس ہوئی تھی۔ ایک پروفیسر سے ہم نے درخواست کی کہ میں گاتا ہوں آپ مشین لگائیں اور میرے گانے کے رنگ دکھائیں۔ چنانچہ انہوں نے ہمیں مشکور فرمایا اور بھیرو راگنی کے رنگ دکھائے۔ اس سرعت سے رنگ پے در پے نظر آتے گئے کہ سارے رنگ میں نہ یاد رکھ سکتا تھا، نہ قلمبند کرسکتا تھا لیکن یہ ثابت ہوگیا کہ واقعی ہر ایک سُر کا رنگ جداگانہ ہے۔

ہندوستان کے زمانۂ قدیم میں ایسے سامان نہیں تھے جو حال کے زمانہ میں ایجاد و اختراع ہوئے۔ ہمیں تعجب ہے کہ کس طرح سے رشیوں نے یہ بات دریافت کی کہ ہر ایک سُر کا رنگ ہے۔ اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ امر انہیں معلوم تھا تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر ایک سُر کا رنگ اُنہوں نے کس طرح دریافت کیا۔ کیا اُن میں کوئی باطنی قوتیں ہوتی تھیں جو اب مفقود ہوگئی ہیں۔

یورپ کے سفر میں ہم کو ایک دوست نے بتایا کہ ایک کمپنی آواز کے رنگ بنا دیتی ہے اور رنگ سے پھر وہی آواز پیدا کر دیتی ہے۔ افسوس ہم کو اس تماشے کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

اب اگر کبھی موقع ملے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا جو رنگ سُروں کے ہندوؤں نے لکھے ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط۔ اِس میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ سُر صحیح ہوں۔ ہارمونیم کے سُر مسلّمہ طور پر عمداً صحیح نہیں رکھے گئے۔ البتہ ستار پر ہندی سُر درست ظاہر ہو سکتے ہیں۔

(۱) سر (کھرج) گلابی
(۲) رکھب۔ ہرا زردی مائل۔
(۳) گندھار۔ سنتری (نارنجی)
(۴) مدھم۔ گلابی زردی مائل۔
(۵) پنچم۔ سرخ
(۶) دھیوت۔ زرد
(۷) نکھاد (نشادہ) سیاہ

شمیم

خاتونِ نغمہ ساز سے

اے نوا پرداز اے شکّر فروشِ نغمہ ساز ۔۔۔ کاشفِ رازِ نیاز و ناز اے جدّت طراز
راگنی وہ چھیڑ جس سے دل ہوں سینوں میں گداز ۔۔۔ دُور ہو آئینۂ فطرت سے زنگِ حرص و آز
مردہ دل بھی اٹھیں سن کر نعرۂ ہنگامہ خیز
عیش و عشرت رنگ رلیوں میں ہوں اپنی اشک ریز

ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں محوِ غفلت ہے بشر ۔۔۔ بر سرِ پیکار ہیں ہر سُو قوائے خیر و شر
جلوہ گر ہے ہر کہیں آزادیِ وحشت اثر ۔۔۔ کانپتی ہے روحِ عفّت یہ مناظر دیکھ کر
حقّ و باطل کے حقائق سے ہے گو نا آشنا
بن رہا ہے ناخدائے خود نما خود ہی خدا

روز و شب کی جستجو ہے منتہائے زندگی ۔۔۔ شاہدِ قدرت کا جلوہ مدعائے زندگی
تیرے سینے میں جو پنہاں ہے صدائے زندگی ۔۔۔ وہ ہے دنیا کے لئے قبلہ نمائے زندگی
جذبۂ حسنِ عمل کو دہر میں بیدار کر
مے پرستوں کو مئے ایثار سے سرشار کر

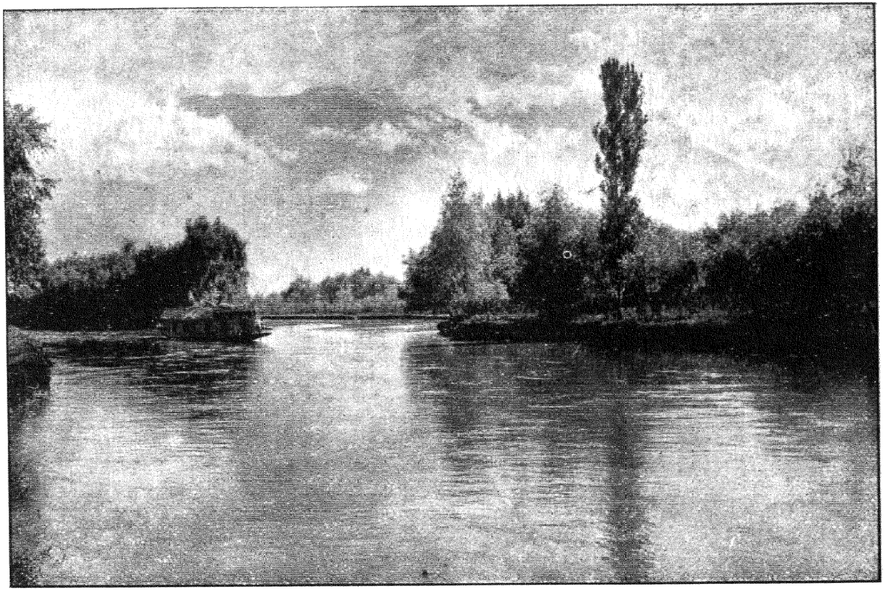
گنگری میں اپنی استغفار کا رستہ دکھا ۔۔۔ خود غرض کو ہستیٔ خوددار کا رستہ دکھا
خودسری کے عاشقوں کو پیار کا رستہ دکھا ۔۔۔ اہلِ دل کو گلشنِ بے خار کا رستہ دکھا
خلدِ امن و حسن میں اے رہنما لے چل ذرا
کچھ نہ کچھ پائیں جہاں اس آج کل سے کل ذرا

ب۔ا



نغمہ ساز

CALCUTTA
ART PO WORKS
LAHORE



وادیٔ کشمیر کی ایک ندی

نورِ فطرت

دُور افق پہ چوٹیاں برف سے ہیں ڈھکی ہوئی گم ہیں پہاڑ وادیاں ابر میں ہیں چھپی ہوئی

شاخیں ہوائے شوق سے کوہ پہ محوِ رقص اُدھر گُل کی پیالیاں اِدھر اوس سے ہیں بھری ہوئی

آبِ رواں کا شور ہے بادِ وزاں کا زور ہے صحنِ چمن میں آج ہے بزمِ طرب جمی ہوئی

نقشۂ حسن و عشق ہے راز و نیازِ شاخ و گل ناز سے یہ کھڑا ہوا شرم سے وہ جھکی ہوئی

آئی ہے رُت بہار کی چل دئیے اب خزاں کے دن دل میں جو آرزو کی تھی شاخ وہ پھر ہری ہوئی

چھاؤں گھنی گھنی کہیں دھوپ چھنی چھنی کہیں تیرہ و تار روح میں علم کی روشنی ہوئی

نفس خموش ہو گیا خوابِ خودی میں کھو گیا حق کے حضور زندگی روح کی راگنی ہوئی

کُلفت و یاس کس لئے خوف و ہراس کس لئے؟ غم سے جو پائمال ہو کیسی وہ زندگی ہوئی؟

غم ہو کہ ہو خوشی یہاں کھوئیے کیوں سکونِ دل غم اُسے غم نہیں جسے غم میں نہ بے کلی ہوئی

شکرِ خدا، خدا نے دیں تجھ کو یہ دونوں نعمتیں زارِ خوشی بھی پالیا غم سے بھی آگہی ہوئی

باغ میں صبح ہو گئی شاخ پہ پھول کھل چکا
جاتی ہے گلستاں سے اب نکہتِ گل اُڑی ہوئی

ب ل

ناہید

پیارے دوست! کیوں مجھ ناتوان پر تقاضوں کے تیر برساتے ہو؟ مجھے اپنی لاغر زندگی میں صرف چند حسرتیں جمع کرنے کا موقع ملا ہے۔ اور گو مجھ نادار کی گٹھی میں یہ چڑیلیں بھی پریاں ہیں۔ مگر دنیا انہیں دیکھے گی تو جو وہ ہیں وہی کہے گی۔ تقاضا کرو اُن فربہ معتبر شخصیتوں سے جن کے چرچے ہیں۔ جن کے محلوں کی ہوا شبانہ رقص سے پامال ہے۔ جن کی جیبوں سے زندگی چھن چھن کرتی ہوئی اچھلتی ہے۔ نہ مجھ سے جس کی زندگی محض زندگی کی آرزو ہو۔ میرے شعلے صرف میرے اپنے لئے ہیں، دنیا کے لئے

شرارم سنگ شد از کلفتِ صبر آزمائیہا

مجھ پر رحم نہیں کرتے تو اپنے رسالے کے پڑھنے والوں کی ادبی توقعات کا احترام تو کرو۔

تمہارا ۔۔۔۔۔۔۔۔

دوست! تم یہ اپنا بوسیدہ فلسفہ رہنے دو۔ ظالم! تمہیں پتہ تو ہے کہ میری ردّی کی ٹوکری آباد ہے۔ اور انتخاب کا بکس خالی۔ اس پر تمہاری طرف سے یہ لیت ولعل! اور کچھ نہیں تو علّو والے ماجرے کو نام بدل کر لکھ ڈالو اتنا بہت دلچسپ تو نہیں مگر چونکہ امرِ واقع ہے۔ کئی اخبار زدہ شوق سے پڑھ لیں گے۔ عبارت میں خود درست کرلوں گا۔

تمہارا ۔۔۔۔۔۔

پیارے دوست! سبحان اللہ کیا فرمائش کی ہے؟ تمہارے عامیانہ مذاق کی کوئی حد بھی ہے؟ اور کیا میں ایسا غدّار ہوں کہ اپنے عزیز ترین دوست علّو اور اس کی بیوی ناہید کا حال شائع کردوں اور اس میں بات کیا ہے؟

ہزار آرزوؤں سے شادی ہوئی، دو ایک سال ایک دوسرے کے پروانہ وار عاشق رہے۔ مگر ناہید کی کافی سے زیادہ جائداد جب علّو صاحب کی ناتجربہ کاری پر نثار ہو چکی تو رخنہ اندازوں نے چپکے ہی چپکے لگانے بجھانے سے اُدھر علّو کو اِدھر ناہید کے بھائی کو ایک دوسرے سے وہ برگشتہ کیا کہ ناہید کے لئے زندگی جہنم ہوگئی

وہ تو اس پر بھی نہ بدلی۔ ریشم سے ململ پر اور سونے سے کانچ پر آ اتری۔ مگر واہ ری ناہید کیا مجال کہ علّو کو کبھی کنایتًا بھی جتلایا ہو کہ برا ہوا۔ دنیا مگر کب چھوڑتی ہے۔ بہن، بھائی کو لڑوا دیا۔ بھائی کو سکھلایا گیا کہ ناہید کو مجبور کرے کہ وہ علّو کے کان کھینچے۔ ناہید کو جائیداد کی تباہی کا قلق کچھ بھی نہ تھا مگر سگے ماں جائے کو کہنا کہ مجھے تباہ ہونے دو تم دخل مت دو۔ زہر کھانے کے برابر تھا۔ وہ اس پر بھی تیار ہو گئی۔ جب علّو کو اس باوفا کے اس فیصلے کا علم ہوا تو آپ کی آنکھیں کھلیں مگر کیا خاک کھلیں۔ آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ خود بدولت ناہید جیسی فرشتہ خصلت کے شوہر ہونے کے قابل نہیں اور جدید فلسفۂ زندگی کی تکمیل میں آپ نے خودکشی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ڈوب کر مر جانے سے انہیں نفرت تھی، اور پستول آپ کے پاس تھا نہیں۔ روشنی طبع یوں چمکی کہ پستول چرایا جائے۔ اور یہ خیال اس قدر مستحکم ہوا کہ کئی سو تدبیروں کو رد کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ سب سے آسان طریقہ پستول چرانے کا یہ ہے کہ کسی فوجی افسر کے بہرے بن جائیں اور موقع ملے تو پستول اڑا لیں۔ اس عزم سے آپ پتا ور جا نکلے اور سچ مچ ایک کرنیل کے خدمتگار بن گئے۔ چند ہی دن میں وہ اعتبار جمایا کہ کرنیل کو کسی طرح کا شبہ نہ رہا۔ اور کرنیل صاحب مع خدمت گار شکار کو نکلے۔ علّو کرنیل صاحب کے خیمے کو پوری طرح بند کرنے کے بہانے سے عین اس وقت خیمہ سے نکلا جب اس نے دیکھ لیا کہ کرنیل نے پستول بھر کر بستر کے نیچے رکھ لیا ہے۔ علّو نے دو ایک گھنٹے تو انتظار کیا اور پھر دبے پاؤں اپنی چھولداری سے نکل کر چپکے سے خیمہ کا پردہ کھول کر اندر گھسا۔ کیا دیکھتا ہے کہ دو غیر علاقہ کے پٹھان کرنیل کی رائفل کا بکس سنبھالے پہلو والی قنات کے نیچے سے نکلنے کو تیار ہیں۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جست کر کے ان دونوں کے اوپر گرا۔ بکس تو ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا مگر وہ کھسک گئے۔ ابھی علّو اٹھا بھی نہ تھا کہ کرنیل نے خیمہ سے نکل کر دو فیر کئے۔ مگر اندھیرے کے باعث وہ پٹھان صاف بچ گئے۔ اس کے بعد کرنیل خیمہ میں داخل ہوا اور بجلی کی دستی مشعل کی شعاع علّو پر ڈال کر اور پستول اس کی طرف سیدھا کر کے ذرا درشتی کے لہجے میں کہنے لگا۔

کرنیل ۔ سچ سچ بولو۔ مگر پہلے یہ سمجھ لو کہ ہم فوجی کبھی بے خبر نہیں ہوتے۔ مجھے چوروں کے آنے کی بھی خبر ہے۔ تمہارے آنے کی بھی خبر ہے۔ میں اس تاک میں تھا کہ جو نکلنے والے ہوں تو فیر کروں۔ بولو تم کیسے خیمے میں آئے؟

علّو ۔ (ایک آدھ منٹ سوچنے کے بعد) میں آپ کا پستول چرانے آیا تھا کیونکہ میں خودکشی کرنا چاہتا تھا۔

کرنیل ۔ خودکشی کیوں کرنا چاہتے تھے؟

علّو ۔ آپ کو اس سوال کے پوچھنے کا کوئی حق نہیں۔

کرنیل ۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی مجھے کوئی حق نہیں۔ مگر تم مجھے اجازت دو کہ میں تم سے یہ سوال پوچھوں (پستول کو

جھکا کر اور خالی کرتے ہوئے) یہ سوال ایک شریف آدمی دوسرے شریف آدمی سے پوچھنا چاہتا ہے۔
علو نے جب کچھ جواب نہ دیا تو کرنیل نے پستول خالی کر کے رکھ دیا۔ اور پھر پلنگ پر اطمینان سے بیٹھ کر کہا۔
کرنیل۔ کیا مسٹر علاء الدین کرسی پر بیٹھ کر مجھ سے بات کرنا پسند کریں گے۔
علو۔ (گھبرا کر بیٹھ کر) آپ کو میرے نام کا پتہ کیونکر ہے؟
کرنیل۔ جب آپ نے میرے پاس نوکری کی التجا کی اور یہ کہا کہ چٹھی کوئی نہیں تو میں اُسی وقت سمجھ گیا تھا کہ اس قطع وضع کے آدمی کے لئے نوکری کی تلاش کسی مصیبت کے باعث سے ہے۔ چنانچہ آپ سے میں نے والد کا نام دریافت کیا اور شہر۔ مجھے یقین تھا کہ والد کا نام آپ غلط نہیں بتائیں گے۔ اتفاق سے شہر بھی آپ نے صحیح بتا دیا۔ وہاں کے ڈپٹی کمشنر سے گو وہ میرا ذاتی واقف نہ تھا آپ کے والد کا نام لکھ کر حالات دریافت کیئے۔ معلوم ہوا کہ آپ نجیب خاندان سے ہیں۔ مگر کسی خانگی کشمکش اور مالی نقصان کے باعث کچھ عرصے سے شہر سے غائب ہیں۔ یہ اطلاع مجھے کل ملی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے ضلع کے افسر کو اطلاع دینی چاہیئے؟ غالباً میرا فیصلہ یہی ہوتا کہ اطلاع نہیں دینی چاہیئے۔ مگر اب یہ واقعہ پیش آگیا۔
علّو۔ آپ کو صحیح خبر ملی۔
کرنیل۔ شاید آپ کو علم ہو کہ آپ کے والد اور میرے چچا کے کچھ تعلقات تھے۔
علّو۔ میرے والد کے دوست کا نام تو کرنیل ہوورڈ تھا اور آپ کا نام ہوورڈمرے ہے۔
کرنیل۔ مجھے اپنے نانا کا نام اختیار کرنا پڑا۔ ورنہ کرنیل ہوورڈ میرے والد کے بھائی تھے۔

قصّہ مختصر یہ کہ کرنیل ہوورڈمرے نے علّو صاحب کو کسریٹ کے ایسے نفع والے ٹھیکے دیئے کہ علّو اب لاکھوں کے پھیر میں ہیں۔ مگر جب یہ ٹھیکہ دار صاحب دو سال کے بعد پہلی دفعہ گھر وارد ہوئے تو باوجود اس کے کہ انہوں نے ناہید کے پاؤں پر سر رکھا۔ ناہید اُن سے بگڑی رہی۔ علّو کے لئے وہ چند دن قیامت کی گھڑیاں تھیں۔ مگر ناہید آخر میری تدبیر سے رام ہوئی۔ اُسے غصّہ یہ تھا کہ اگر علّو نے خودکشی کرنی ہی تھی تو پہلے مجھے مارتا۔ اُس کے غم میں گھل گھل کر مرنے سے اُس کے ہاتھ سے مرنا بہتر ہوتا۔ وہ یہ بھی کہتی تھی کہ جس شخص کے لئے سگے بھائی سے بگاڑی اُس شخص پر کیا اتنا حق بھی مجھے نہ تھا کہ وہ مجھے اپنے دل کا راز بتاتا؟" اُس کا غصّہ حق بجانب تھا۔ مگر ادھر علّو کا یہ حال تھا کہ ناہید کی ناراضگی میں وہ منٹ منٹ میں سو سو دفعہ مرتا۔ ان دونوں عاشق معشوق کو بن موت مرتے ہوئے مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا اور مجھے ایک تجویز سوجھ گئی۔ ایک شام بصد منت ناہید کو کھانے پر بلوایا۔ اور اپنی بیوی کے رو برو حالانکہ

وہ علّو کی رشتے میں بہن تھی۔ اور اس معاملہ میں علّو کی طرفدار تھی۔ بندے نے علّو کی وہ بدتعریفی شروع کی کہ ناہید کا ایک رنگ آئے ایک جائے۔ آخر اُس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور جھنجھلا کر مجھے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

ناہید۔ میں سمجھتی تھی کہ علّو ہی خود پسند ہے مگر وہ اتنا کمینہ نہیں جتنے کہ تم ہو۔ اُس نے کبھی بھی کسی دوست کو بُرے لفظوں سے یاد نہیں کیا۔ یہاں تک کہ میرے بھائی سے بگاڑ رہا مگر بُرا لفظ اُس نے کبھی کوئی استعمال نہ کیا۔ اگر علّو نے دل دکھایا ہے تو میرا دکھایا ہے۔ تم اُسے بُرا کہنے والے کون؟ مجھے تمہارے گھر سے کھانا کھانا زہر ہے۔

یہ کہہ کر وہ غصہ میں بھری اُٹھی اور زار زار رونے لگی۔ اُدھر پردے کے پیچھے سے علّو رحمن کو پہلے ہی وہاں چھپا دیا گیا تھا نمودار ہوُا اور آتے ہی اُس نے ناہید کو اٹھا لیا۔ عشق وہ بلائے بد ہے کہ ان بے حیاؤں کو ہمارے سامنے پیار کرتے شرم نہ آئی۔ اور میرا شکریہ ادا کئے بغیر علّو صاحب ناہید کو گود میں اٹھائے چل دیئے۔

بھلے آدمی سوچو تو سہی یہ واقعہ ہی کیا ہے کہ اسے کوئی اہل قلم کسی مقبول رسالے کے لئے سجا کر پیش کرے۔ محض چند غلطیاں، چند غلط فہمیاں اور تھوڑی سی میری نفسیات سے واقفیت پر مبنی چالبازی۔ میں جانتا تھا کہ اگر کوئی علّو کا دوست ناہید کے سامنے علّو کو صلواتیں سنائے گا تو ناہید کی دبی ہوئی عشق کی آگ ازسرنو بھڑک اُٹھے گی۔ اِس معاملے میں سب سے بہتر میرا sentiment تھا۔ ناہید بھولی بھالی کو یقین ہوگیا۔ کہ میں سچے دل سے علّو کو حقارت آمیز لفظوں سے یاد کر رہا تھا مگر اچھی کہانی انگریزی salad کی طرح کاریگری کی محتاج ہے یعنی اِس طرح کہ درمیان میں تو وہی ایک بھنی بوٹی ہو مگر ادھر اُدھر ساگ کی سبزی، چقندر کی سرخی اور انڈے کی سلیقہ سے کٹی ہوئی سفیدی زردی اس بھنی بوٹی کو نگاہ کے لئے اور نگاہ کے ذریعہ اشتہا کے لئے اِس قدر دلفریب بنادے کہ وہ بوٹی صرف غذا نہ رہے بلکہ بجائے خود صنعت کا نمونہ بن جائے۔ اس دنقعے میں آندھی کیسے چلاؤں۔ بجلی کیونکر گرجے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مکالمے میں حاضر جوابی کے جو کرشمے ہوتے ہیں وہ اس میں کیسے کھپ سکیں۔ مگر تم ان باتوں کو کیا جانو اور کیا سمجھو!

تمہارا ....

دوست! تم اپنی امید سے بڑھ کر اس واقعے کا خون کرنے میں کامیاب ہوئے ہو۔ مجھے اب پتہ چلا کہ تمہیں وہ چند الٹی سیدھی ترکیبیں جو آج کل کے بعض رسائل کو مقبول بنا رہی ہیں ضرور ازبر ہیں۔ مگر واقعات کا شاعرانہ موازنہ

کرنے سے تم اپنی طبعی بشریت سے مجبور رہو۔ اس کا تم اللہ میاں سے دقتِ فرصت گلہ کر لینا۔ مجھے فی الحال وہ واقعہ لکھ بھیجو۔ جو دوسرے دن تمہارے اور ناہید کے درمیان علو کے روبرو ہوا۔ کوئی کہتا تھا کہ ناہید نے تم سے معافی مانگی اور تمہیں گلے لگا کر پیار کیا۔ کیا بات تھی؟ اگر کوئی صاحب تخیل اہلِ قلم مل گیا تو اُس سے استدعا کروں گا کہ جن واقعات کو تم نے اس بے دردی سے چکنا چُور کیا ہے اُن میں وہ ادبی شان پیدا کر دے۔

دوست۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہمارے ملک میں کوئی ادبی کورٹ مارشل ہوتا۔ تمہارا نام تو شاید کسی طرح علمی دنیا میں نہ آتا مگر کورٹ مارشل کے تذکرے پر تنقید نویس کس لطف سے اس شہادت کا ذکر کرتے جو تمہارے برخلاف گزرتی

میں ہوں ایک گھامڑ کا دوست

پیارے دوست! تم کچھ ہی بکا کرو مگر میری طرف سے ہرگز تمہیں اجازت نہیں کہ علاء الدین والے واقعات کا تم کوئی استعمال بھی کرو۔ جس قسم کے مبتدی تمہارے زیر اثر ہیں اُن کے قلمی داؤ پیچ سے میں خوب واقف ہوں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ جب سے تم سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا ہے میں خود محسوس کرتا ہوں کہ میرا کورٹ مارشل ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ تمہارا رسالہ اور تمہارے خط بن پڑھے جلا دینے کے پڑھتا بھی ہوں اور پھاڑتا بھی نہیں۔

تمہارا ....

دوست! تمہاری اور تمہاری ممانعت دونوں کی ایسی تیسی۔ تمہارا اپنا قول ہے کہ ایڈیٹر ہونا اور ایماندار ہونا دو متضاد باتیں ہیں۔ اگر تم نے مجھے وہ ناہید کے پیار والا واقعہ بلا کم و کاست بالکل راست راست نہ لکھا تو میں اپنے رسالے میں مفصلہ ذیل نوٹ شائع کر دوں گا۔

نئی تہذیب اور ایک مشہور گھرانہ

جن نئی اخلاقی آندھیوں نے آج کل مغربی ممالک میں سوشل تعلقات کے مطلع کو غبار آلود کر رکھا ہے وہ اِس پرانے شہر میں بھی زور شور سے چلنے لگی ہیں۔ یورپ میں تو صرف عین نکاح کے بعد دولہا کے عزیز ترین دوست کو حق ہوتا ہے کہ وہ نئی دلہن کے ہونٹوں سے ہونٹ رگڑ کر سرخروئی حاصل کرے مگر ہمارے شہر کے آنریبل فیشنیبلوں نے اس میں اتنی ترمیم اور کر لی ہے کہ جہاں کہیں میاں بیوی میں بگاڑ ہوا فوراً کسی دوست نے بیچ بچاؤ کر کے نئے سرے سے شادی رچا دی اور اس حق الخدمت میں اِس نئی پرانی دلہن کو خوب دل کھول کر اُس کے نئے پرانے میاں کے سامنے پیار کر لیا۔ ہمیں معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے

کہ اس تازہ بتازہ نو بنو کے موجد ہمارے شہر کے ایک بزعم خود مشہور اہلِ قلم مسٹر ڈیش ہیں اور اُن کے معاون مسٹر ۔۔۔۔ ہیں جن کا ہندوستانی نام ہم معلوم نہیں کر سکے گو مسٹر ۔۔۔۔ یورپین صحبت سے فیض یاب ضرور ہوئے ہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن کی بیگم صاحبہ نے کس طرح ایشیائی تہذیب سے عدم تعاون کی روش اختیار کر لی۔ دنیا منتظر رہے گی کہ مسٹر بزعم خود مشہور کے ہاں کس دن چپقلش ہوتی ہے۔ اور کیا اُس دن باہمی مصالحت کے لئے مسٹر ۔۔۔۔ کی خدمات طلب کی جائیں گی۔ یا اس تازہ بتازہ نو بنو کے حلقۂ تقدیس میں اور لوگوں کو شامل ہونے کا موقع دیا جائے گا۔ کیوں دوست۔ کیا تم اِس تحریر کا شائع ہونا پسند کروگے؟ واللہ بااللہ میں ضرور شائع کر دوں گا۔

تمہارا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پیارے دیوانے اگر یہ تحریر تم شائع کروگے تو اس کا جواب علّو کے بوٹ تمہاری کھوپری پر تصنیف کریں گے میں اِس تمام خط و کتابت کی نقل علّو کو روانہ کر رہا ہوں۔

تمہارا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ڈیر علّو۔ ملفوفہ نقول اپنے خطوط کو وقتِ فرصت دیکھ لینا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا ایڈیٹر دوست محض مذاق کے مرض میں مبتلا ہے۔ ورنہ کجا وہ کجا دل آزاری۔ بہرحال تمہیں بے خبر رکھنا مناسب نہیں۔

تمہارا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

علّو کی طرف سے جواب

ڈیر ڈیش۔ ناہید تمہارے اور تمہارے ایڈیٹر دوست کے خطوط کی نقول پڑھ کر ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ وہ اصرار کرتی ہے کہ یہ خط اور جو حاشیہ اُس نے چڑھایا ہے وہ سب ضرور شائع ہوں اور فوراً شائع ہوں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ تم نے ناہید کے سامنے یہ دعویٰ کیا تھا کہ غازی کمال پاشا جہاں تک آزاد خیالی کا تعلق ہے تمہارے سامنے طفلِ مکتب ہے۔ ناہید کہتی ہے کہ اگر آزاد خیال مرد ایسے ہی ہوئے ہیں جیسے کہ تم ہو تو تمہارا فطرتی حق ہے کہ تم اپنے لئے چوڑیاں بنواؤ اور برقعہ پہنو۔ مردِ خدا تم صرف اس بات سے ڈر گئے کہ ناہید جیسی باوفا پر تہمت تراشی گئی یا تہمت تراشنے کی دھمکی دی گئی۔ کیا تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ زمانے کے تغیر سے ناہید کیا ایسی سینکڑوں پر تہمتیں عائد ہونگی۔ میاں آنکھیں کھولو۔ انگورا لندن، اور کابل انگورا بن رہا ہے مگر تم انہیں دلی کی گلیوں

میں گرفتار رہو۔ خدا کے لئے اپنی حالت کو بدلو۔ ناہید کی تحریر حسبِ ذیل ہے مگر یہ خط نہیں تب ملے گا جب یہ سب کچھ شائع ہو جائے گا۔

درعلو نے ابھی مجھے بزعم خود مشہور کے اور اُن کے ایڈیٹر دوست کے خط دکھائے ہیں۔ مجھے یہ خیال تھا کہ علّو کے دقیانوسی دوست بزدل عورتوں سے بھی بدتر ہیں۔ مگر آج یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا۔ ایڈیٹر صاحب تو محض شوخیٔ تحریر کی خاطر جھوٹ بولنے پر آمادہ ہیں۔ مگر مسٹر ڈیش میں اتنی بھی ہمت نہیں۔ انہیں یہ بھی ناگوار گزرا کہ کیوں ہم نے ان کے سامنے ایک دوسرے کو پیار کیا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ مزید لطف یہ کہ ان کوڑمغزوں کی ڈرو طبیعتیں تہمت لگانے پر بھی آئیں تو بس اسی قدر کہ ناہید نے علو کی موجوگی میں مسٹر ڈیش کو پیار کر لیا۔ کیا اُن کی نگاہوں میں یہ جرم ہے؟ لاحول ولاقوۃ۔ مگر جی چاہتا ہے کہ کاش اُن کا جھوٹ کبھی تو سچ ہو جائے یعنی ہر ہندوستانی خاتون کا یہ حوصلہ ہو کہ عصمت کی غلامی میں زندگی کی جائز خوشیوں کو خواہ مخواہ اپنے پر حرام نہ کر لیں مگر اس مشکل مسئلے پر آرزو ہائے دل کا اظہار فی الحال فضول ہے۔ مگر مجھے موجودہ تاریکی کے زمانہ میں بھی یہ کہنے کی جرات ہے کہ کسی اور مرد کو پیار کرنا جرم ہو یا نہ ہو مگر ہزارہا مثالیں اس وقت ایسی موجود ہیں جن کی نسبت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ شوہر کو پیار کرنا ضرور جرم ہے گناہ ہے، کفر ہے کیونکہ صنفِ نازک کو مذہب یا رسم کے بہانے سے بند کرنے والے مرد اس قابل نہیں۔ چونکہ میں نہ کسی کے جھوٹ سے ڈرتی ہوں نہ مجھے کسی کے سچ کی پرواہ ہے۔ اس لئے جو اصل واقعات ہیں ان کو مختصراً لکھ دیتی ہوں۔ علّو سے میرا بگاڑ اس لئے نہ تھا کہ اس نے خودکشی کا ارادہ کیا اور مجھے خبر نہ کی۔ یہ تو میری محض کہنے کی باتیں تھیں۔ اصل بات تو یہ تھی کہ جب دو سال بعد علو واپس آیا تو اُس نے مجھ سے بہ تکلف گفتگو کی اور مجھ سے معافی مانگی۔ اس بات سے میں جل گئی۔ اُسے چاہئے تو یہ تھا کہ اِس طرح ملتا گویا کہ صرف دو منٹ جدا ہوئے گزرے ہیں۔ اور اُسے یقین ہوتا کہ علو چاہے دنیا بھر کا نالائق ہو مگر اُسے ناہید سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ ہر حال میں ناہید کا ہیرو ہے۔ اُس نے جو معافی مانگنے کی حرکت کی تو میں بھی اُس سے اس طرح پیش آئی جس طرح ہندوستانی روٹھ جانے والی خاتونوں کا قاعدہ ہے۔ روٹھنا میرے لئے واقعی کسرِ شان تھا مگر کیا کرتی جب خود اپنے ہی مرد کی عقل پر پردہ پڑ جائے اور میں بالارادہ اس وقت تک روٹھی رہی جب تک کہ اس نے بلا تکلف مجھے مسٹر ڈیش کے گھر میں گود میں نہ اٹھایا مجھے اُسے سبق سکھانا تھا کہ عشق میں تکلّف کفر ہے۔ باقی رہا مسٹر ڈیش سے پیار کرنے کا قصّہ سو اس میں صرف اِسی قدر سچ ہے کہ جب مسٹر ڈیش سے خلافِ عادت زبان درازی کر کے اُن کے گھر سے بلا اجازت رخصت ہوئی تو بعد میں مجھے خیال آیا کہ مجھے تو میرا علو مل ہی چکا ہے لاؤ مسٹر ڈیش کے آنسو تو پونچھ دوں۔ دوسرے دن اُن کو بلوایا تو وہ حضرت

بھی معافی مانگتے ہوئے وارد ہوئے۔ اِس پر مجھے ان کو بنانے کا خوب موقع ملا اور ہماری گفتگو حسب ذیل ہوئی۔

ناہید۔ آپ نے جو کچھ کیا اس نیت سے کیا کہ علّو کی اور میری صلح صفائی ہو جائے۔ میری یہ غلطی تھی کہ آپ سے ناحق زبان درازی کی۔

مسٹر ڈیش۔ معافی مانگنے کا حق میرا ہے کہ آپ مہمان تھیں اور مجھ سے آپ کی دل آزاری ہوئی۔

ناہید۔ آپ بڑے ہیں میں چھوٹی ہوں۔ معافی مانگنے کا حق میرا ہے۔

مسٹر ڈیش۔ اِس میں بڑے اور چھوٹے کا سوال نہیں۔ غلطی کی ابتدا مجھ سے ہوئی۔

جب یہ گفتگو ہو رہی تھی تو ہم دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل سر جھکائے کھڑے تھے۔ علّو کی طبیعت ہمیشہ سے چلبلی ہے اور اُس نے چپکے سے پہلو میں آ کر گردنوں میں ہاتھ دے کر ہم دونوں کے سر بھڑا دئیے۔ اور اِس پر ہم تینوں بے ساختہ ہنس پڑے۔ اور معافی کا ذکر اس قہقہے میں بہ گیا۔ یہ ہے اُس تمام پیار کا قصہ۔ اِس کی نسبت جتنا کسی کا جی چاہے جھوٹ جوڑے۔ بقلم خود ناہید"

تمہارا دوست علّو

عبدالعزیز

پرتوِ افکار

الٰہی آج یہ کیا ہو گیا زمانے کو
کہ ہے گناہ وسیع الخیال ہونا بھی

خزاں کی زد میں بآواز کہہ رہا ہے شجر
کہ تخم کو ہے غنیمت نہال ہونا بھی

جو چوٹیوں پہ ہے وہ گھاٹیوں سے گزرا ہے
کمال کی ہے علامت زوال ہونا بھی

نہ شکوہ سنج مزاجِ سحی ہو کیوں کر
محال ہی تو نہیں ہے محال ہونا بھی

دلِ برشتہ کی وہ خاک ہوں میں اے افسر
نہ آیا جس کو کبھی پائمال ہونا بھی

حامد اللہ افسر

سرودِ مستانہ

در شالا باغِ کشمیر گفته شد

(۱)

چه خوش روزگارے بود بانگارے
لب جُویبارے بزیرِ چنارے
سرِ سبزه زارے بر آبشارے
به ساقیٔ مہ طلعتے گلعذارے
به خنیاگرے رازداں رازدارے
به باغِ نشاطے و یا شالامارے
چه خوش روزگارے بود بانگارے　　لب جُویبارے بزیرِ چنارے

(۲)

گلان سر زنند از دلِ مرغزاران
ہزاران سرایند بر شاخساران
لب جُویباران نشستند یاران
بخوابند و غلطند بر سبزه زاران
برقصند و بجهند چوں مےگساران
بخوانند با نغمهٔ آبشاران
چه خوش روزگارے بود بانگارے　　لب جویبارے بزیرِ چنارے

(۳)

بباغ اندر آ بیں بساطِ زمین را
گل و سبزه و لاله و یاسمین را
بزیرِ درختان غزالانِ چین را
لب آب غلمان و حورانِ عین را
ثنا خوان خدائے جہان آفرین را
وزان پس بزن نغمهٔ آتشین را
چه خوش روزگارے بود بانگارے　　لب جویبارے بزیرِ چنارے

(۴)

ز ہر سو غزالے بباغ انجمن شد
بساطِ چمن چون دیارِ ختن شد
ز خوبان ہزاران چمن در چمن شد
چمنها همه پُر ز یاس و سمن شد
تو گوئی گلستان بهشتِ عدن شد
ز فرطِ طرب آبها نغمه زن شد
چه خوش روزگارے بود بانگارے　　لب جویبارے بزیرِ چنارے

(۵)

سر از خاک زد جلوۂ آتشینے
پر از اختران چون فلک شد زمینے
درے باز شد از بہشتِ برینے
بخواہم ہمی پُر زمے ساتگینے
کہ تا بہرِ درمانِ قلبِ حزینے
چو مستان سرودے زنم با حسینے
چہ خوش روزگارے بود با نگارے لبِ جویبارے بزیرِ چنارے

(۶)

بجوی اندر آید ز کہسار آبے
درخشان چو برقے روان چون سحابے
بدل ماہتابے بہ تن آفتابے
ہمہ مستی آرد چو جامِ شرابے
ہمہ نغمہ دارد چو تارِ ربابے
ہما نا بخواند بما این خطابے
چہ خوش روزگارے بود با نگارے لبِ جویبارے بزیرِ چنارے

(۷)

چہ خوش بوستانیست اللہ اکبر
بحیرت ہمی بیندش چرخِ اخضر
بآبش قسم مے خورد حوضِ کوثر
لبِ جوئے بنشیں بہ مینا و ساغر
بزن پشتِ پا بر بساطِ سکندر
برقص و بخواں با بتانِ سمن بر
چہ خوش روزگارے بود با نگارے لبِ جویبارے بزیرِ چنارے

(۸)

بیا مطربا زن سرودے نوائے
کہ دارم ببر ماہِ گلگوں قبائے
مہِ دلستانے مہِ دلربائے
پری چہرہ لالہ رخے خوش ادائے
بیا و بزن با حریفاں صلائے
بدہ ساز ایں جامۂ دلکشائے
چہ خوش روزگارے بود با نگارے لبِ جویبارے بزیرِ چنارے

(۹)

بیا ساقیا ریز بادہ بجامے
بگو از حریفاں سلامے پیامے
بخواہم مئے آتشیں لعل فامے
کہ سوزد ہمی دفترِ ننگ و نامے
بدہ آفتابے بہ ماہ تمامے
بہ بادہ گساراں چہ صبحے چہ شامے
چہ خوش روزگارے بود با نگارے لبِ جویبارے بزیرِ چنارے

(۱۰)

بیا ساقیا آر جامِ شرابے
کہ یک جا ببینم مہ و آفتابے
ویا باز کن نرگسِ نیم خوابے
ببیند از در ملکِ جان انقلابے
کہ تا مست گردم بگیرم ربابے
سرایم چو مرغے برقصم چو آبے
چہ خوش روزگارے بود با نگارے لبِ جویبارے بزیرِ چنارے

(۱۱)

بخواہم بخوبانِ کشمیر رقصم
بہ سبزہ و گل با بم و زیر رقصم
لب آب جُو پا بزنجیر رقصم
بلغزم بیفتم چو نخچیر رقصم
بآتش عذاران بشمشیر رقصم
بیا در زمانِ جہانگیر رقصم
چہ خوش روزگارے بود بانگارے لب جویبارے بزیر چنارے

(۱۲)

خوشا آن زمانے خوشا روزگارے
کہ بُد مردمِ ہند را شہریارے
خوشا شہریارے خوشا غمگسارے
کہ در دورِ اُو ملک شد لالہ زارے
ہمی خورد مردم مئے پُر شرارے
ہمی خواند با گلرخاں چوں ہزارے
چہ خوش روزگارے بود بانگارے لب جویبارے بزیر چنارے

(۱۳)

سلامے بخوانم بآں روزگاراں
سلامے فرستم بآں شہریاراں
خدایا ز گلزار ما شد بہاراں
ز ابر کرم باز بفرست باراں
بروہاں بہارا ز بر کوہساراں
کہ رقصیم و خوانیم بر جویباراں
چہ خوش روزگارے بود بانگارے لب جویبارے بزیر چنارے

محمد اکبر منیر

دردِ محبّت

یہ کچھ ہمارے درمیان محبت کا دکھلاوا نہیں میرے پیارے! بارہا طوفان کی دردناک راتوں نے مجھے آ لیا، اور میری شمع گل ہوگئی! تاریک شبہات چھاگئے اور میرے آسمان سے تمام ستاروں کو ملیا میٹ کردیا! بارہا کنارے ٹوٹے اور طغیانی میرے فصل کو بہالے گئی! اور چیخ پکار اور مایوسی نے میرے آسمان کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک شق کردیا! لیکن یہ میں نے جان لیا ہے کہ تیری محبت میں درد کے صدمے ہوتے ہیں موت کی سرد مہری کبھی نہیں ہوتی!!

"گلچیں"

تکمیلِ محبّت

تیرھویں رات کا چاند آسمان پر جلوہ گر تھا۔ تارے کہیں کہیں ٹمٹما رہے تھے، کچھ ننھی منّی بدلیاں فضا میں یوں منڈلا رہی تھیں جیسے کسی وسیع و شاداب چمن میں کم سن شہزادیاں محوِ خرام ہوں!

پانی چادرِ آب میں گر رہا تھا، فوّاروں سے اُچھل رہا تھا، کیاریوں میں بہ رہا تھا۔ درخت ہلکی پھلکی ہوا کے جھونکے میں جھولتے تھے۔ پھول اپنی اپنی ٹہنی کی آغوش میں مستِ ناز تھے۔ نکہت فضائے چمن میں نسیمِ چمن کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتی تھی اور مُسکراتی تھی!

چاند کی چاندنی اُداس تھی اور سکون آمیز، تاروں کی جھلملاہٹ شیریں تھی اور نرم و نازک، بدلیوں کا ملبُوس سیمین و زرّیں تھا اور فضا کا نیل عمیق و دل گداز!

پانی کی ہلکی شورش دل کے لئے تخیّل کی دنیا تھی اور گنجان درختوں کے جُھنڈ اسرارِ زندگی کی آرام گاہیں۔ پھولوں میں کسی شاہدِ رعنا کی جلوہ پاشیاں تھیں اور بھینی بھینی خوشبوؤں میں اُس کی میٹھی میٹھی سرگوشیاں!

غروبِ آفتاب کو ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے ہوئے ہونگے۔ چاند شالامار باغ کے وسطی تالاب پر اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سیر کرنے والے اپنا شور و غل ساتھ لئے دیر ہوئی رخصت ہو چکے تھے اور اب باغ میں یا پانی کی کچھ شورش تھی یا پرندوں کے کچھ چہچہے۔ البتہ اُدھر بزم آرائی کے لئے آسمان پر قمر دلکشا تھا، اِدھر بادہ پیمائی کے لئے زمین پر بوئے جانفزا!

تنہائی خاموشی کے ساتھ قدرت کے اس دھیمے دھیمے سُریلے راگ کو مستی کے کانوں سے سُن رہی تھی کہ محل مینا میں چادرِ آب کے اوپر ایک نوجوان آیا۔ اور آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر پھیلتی ہوئی چاندنی کا نظارہ کرنے لگا

جمیل ایک شاعر مزاج خیال پرست نوجوان تھا۔ ابھی اس نے عمر کے پندرھویں سال میں قدم رکھا ہی تھا۔ اسلامیہ سکول لاہور میں ثانوی تعلیم کے آخری مراحل درپیش تھے۔ لیکن اُسے رسمی تعلیم سے بجز اِس کے کہ اپنے بزرگوں کے لئے اِک سامانِ تسکین پیدا کردے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ امتحانات میں اچھی خاصی طرح کامیاب ہوکر وہ یہ حجت پوری کر دیتا اور پھر وقت کو دھوکا دے کر اپنی تمام توجہ تاریخ و شعر لیکن بالخصوص اپنے خیالات و تصورات کی طرف مبذول کرتا۔

وہ عزلت پسند تھا اگرچہ ملنسار بھی تھا۔ افسردہ خیال تھا اگرچہ گاہے گاہے اُس کی شگفتگی انتہائی شور وغل کی صورت اختیار کرلیتی + اُس کا سینہ گوناگوں جذبات سے معمور رہتا۔ اور گو وہ ایک زبردست سیرت کا مالک نہ تھا، جسمانی کمزوری کے ساتھ اس کے نفس میں بھی بعض کمزوریاں پیدا ہوگئی تھیں لیکن اُس کے فطری شرمیلے پن اور عزلت نشینی نے اُس کے متہیج خیالات پر ایک غیر مصنوعی پردہ ڈال دیا تھا جس سے اس کی دلی کیفیتیں شاید کبھی کسی پر ظاہر نہ ہوسکیں + وہ فلسفے کی پیچیدگیوں سے مطلق آگاہ نہ تھا بلکہ اُس کے سلسلۂ خیالات میں کئی بار بے منطقی الجھنیں پڑ پڑ جاتی تھیں لیکن پھر بھی کہا جاسکتا ہے۔ اُس کے دل و دماغ ایک نیم فلسفی نیم شعری فضا میں پر بہ ہوا رہتے تھے اور بے جانے بوجھے کسی نامعلوم سرزمین کی طرف محو پرواز تھے + نظری طور پر وہ انتہا پسند تھا لیکن عملاً بظاہر اُس سے کبھی کوئی غیر معمولی فعل سرزد نہ ہوا تھا نہ ہونے کی امید تھی + اپنے ہم عمروں کی صحبت میں اس نے کبھی کوئی نمایاں کام کرکے نہ دکھایا اور ان میں سے اکثر کو اس کی جسمانی نقاہت پر رحم نہ آتا تو وہ سبھی ضرور اُسے بزدل کہہ کہہ کر اُس کی ہنسی اڑایا کرتے۔ کبھی کبھی وہ اپنے گاؤں سے دور دیہاتی کھیتوں اور باغوں میں ان کے ہمراہ ہولیتا۔ اِن طفلانہ صحبتوں میں بعض وقعہ اُس کی فطرت کا ایک قطعی نیا پہلو پیشِ نظر ہوجاتا۔ اُس کا ٹھٹھا مخول اُس کا شور وغل اُس کی خوش گپیاں اُسے بالکل اَور کا اَور بنا دیتیں۔ بات یہ تھی کہ جب دل و دماغ ذرا آرام لینے کی طرف مائل ہوتے تو اس کمزور دست وپا والے نوجوان کی زبان قینچی کی طرح پھول کترنے لگتی + لیکن یہ بے ساختہ تقریریں بالعموم یک لخت ایک تنہائی پسند خاموشی میں تبدیل ہوجاتیں۔ اور جمیل اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ ہوکر مناظرِ قدرت میں محو ہوجاتا + دور دور تک پھیلی ہوئی ہری بھری کھیتیاں، کوئیں کے رہٹ کی خواب آور راگنی، فضا میں اُڑتے ہوئے کوّے اور چڑیاں، پیپل اور بڑ کے پتوں کی سرسراہٹ، کہیں کہیں مغلیہ عمارتوں کے عبرتناک کھنڈر، کہیں کہیں پرانے وقتوں کے اجاڑ آوے۔ یہ اس کے لئے تفریح کا ذریعہ اور انہماک کے سامان تھے +

اُس کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس میں گھر کے باہر دورِ حاضر کی روشنی ضوفگن تھی اور گھر کے اندر ابھی قدیمی تمدن کا چراغ جھلملا رہا تھا۔ اُدھر طبیعیات اُسے شکوک وشبہات کے سراب دکھاتا تھا۔ اِدھر مذہب اُسے وجدان ومعرفت کے بھید سمجھاتا تھا + پھر بھی اُس کا طبعی میلان اعتقاد و تصوّف کی طرف تھا اگرچہ جدید تعلیم کے خاموش ترغیب واثر نے مذہبی رسوم کی پابندی کو اُس کے نزدیک غیر ضروری قرار دے دیا تھا + جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں جمیل کی شخصیت اُس کے شرمیلے پن کے نیچے دبی ہوئی تھی لیکن اس کا جدت طراز تخیل جسے تصوف

نے اپنے ہلکے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اُسے ہمیشہ عوام سے متمیّز رکھتا تھا۔ وہ مسلّمہ طرزِ عمل سے بالطبع متنفر تھا گو اُس کی کمزور قوتِ ارادی نے اُسے اپنے خصوصی مطمحِ نظر کی تکمیل سے باز رکھا اور اس لئے بغیر دوسروں کی کانِ نمک میں نمک ہو جانے کے وہ سکون پسندی کے باعث اپنی طبیعت کے جوہر دنیا کو نہ دکھا سکا!

جمیل کی شکل سیدھی سادی تھی۔ اُس کا جسم تپلا دبلا تھا۔ اُس کے چہرے میں دلکشی نہ تھی البتہ اُس کی آنکھوں میں انہماک کی گہرائی دوسنداری کی ادا اور محبت کی تمنا ملی جلی نظر آتی تھیں۔

اس کا لباس بالکل سادہ تھا لیکن صاف ستھرا۔ النّاسُ بِاللباس کا مفہوم بجز اس کے اُس نے ابھی کچھ نہ سمجھا تھا کہ صفائی پاکیزگی اور سادگی نیک طینتی ہے۔

لاہور سے تین چار میل کے فاصلے پر شالامار کی سڑک پر بیگم پور کا چھوٹا سا گاؤں آباد ہے۔ یہاں مغلیہ وقتوں میں بعض امرائے دولت کا ٹھکانا تھا اور آج بھی ایک مسجد اُس زریں عہد کی یادگار موجود ہے جس کی پچیکاری میں فنِ قدیم کے سدابہار بیل بوٹے ہنوز لہلہا رہے ہیں۔ جمیل کے والد شیخ نعیم الدین اسی قصبے کے رہنے والے تھے۔ وہ اور اُن کے بھائی شیخ علیم الدین مغربی تعلیم اور انگریزی امتحانات کی رُکاوٹوں کو پھاند کر اب شرفا کے دائرے میں داخل ہو چکے تھے۔ نعیم الدین ایک ڈپٹی تھے اور علیم الدین ایک کامیاب بیرسٹر۔ اُن کی جائے سکونت "فہرستِ دیوانی" کے دیوانہ پن کی مرہونِ منّت رہتی تھی اور یہ گوجرانوالہ میں چند سال وکالت کر کے اب لاہور میں اپنی قسمت آزمائی کر رہے تھے۔ کبھی کبھی یہ لوگ اپنے فرائض سے عارضی طور پر سبکدوش ہو کر اپنے آبائی وطن میں چند روز کے لئے آجاتے اور اپنے بال بچّوں کے ساتھ مل کر دیہات کی فضا کا لطف اُٹھاتے۔

جمیل کو باغ میں آئے آدھ گھنٹہ ہوا ہو گا کہ کچھ مرد عورتیں اور بچے اُس کے ساتھ آشامل ہوئے اور دو دو تین تین ہو کر تالاب کے گرد چہل قدمی کرنے لگے۔ جمیل اور اُس کی خورد سال ہمشیرہ "ساون بھادوں" کی آبشار پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے کہ اِتنے میں دو چار اَور لڑکے لڑکیاں آگئے اور آپس میں بے تکلف باتیں ہونے لگیں جن سے ظاہر ہو گیا کہ یہ سب ایک ہی خاندان کے رُکن اور نزدیک ہی کے قرابت دار ہیں۔

چاندنی رات تھی، فوّاروں کا پانی تالابوں میں ٹپک رہا تھا، تالابوں کا پانی آبشاروں کے ذریعے سے ایک تختے سے دوسرے تختے میں بہ رہا تھا۔ اُدھر میٹھی میٹھی چاندنی، دھیما دھیما شور اور ہلکی ہلکی ہوائیں تھیں۔ اِدھر ننھے ننھے بچے بھولی بھالی لڑکیاں اور معصوم کم سن لڑکے۔ قدرت انسانیت سے کھیل رہی تھی حسن معصومیت

سے باتیں کر رہا تھا۔ جتنی سیمین و شیریں چاندنی کی کرنیں تھیں اُتنے ہی پاک و صاف اِن نوعمروں کے دل تھے۔ جتنی نکہت آمیز باغ کی ہوا تھی اُتنی ہی عصمت آمیز اُن کی متبسم نگاہیں تھیں۔ شباب کے طوفانی جذبات نے ابھی اِن پایاب پانیوں کو مضطرب نہ کیا تھا، دنیا کے حرص و ہوا نے ابھی ان نادانوں کو نہ سمجھایا تھا کہ دنیا والے تمہیں ہو۔ ابھی زندگی اُن کے لئے کھیل کود اور دنیا اُن کے لئے ایک تماشا گاہ تھی، ابھی شاید اُنہیں یہ خبر نہ تھی کہ اُنہیں جوان ہونا ہے، بڑے بننا ہے اور اگر خبر تھی بھی تو کم از کم یہ پتہ نہ تھا کہ یہ باتیں اور یہ دن یہ راتیں گئی پھر کبھی واپس نہ آئیں گی۔ آہ! بچپن بھولے پن کے زمانے! نادانی کے وقت! تُو حسن کی بھول بھلیاں ہے، تُو بے فکری کا چمنستاں ہے۔ یہ لڑکے لڑکیاں جو ہنستے کھیلتے ہیں معاملہ فہم دنیا اِنہیں لڑکے اور لڑکیاں پکارے مگر تیرے لئے تو یہ ایک ہی ہرے بھرے جنگل کے گنگا جمنی پھول ہیں۔ یہ مرد عورت کے امتیاز سے بے نیاز یہ جنسی برتری و کمتری کی معاشرتی خصوصیات سے یکسر پاک و صاف ہیں۔

جمیل اگرچہ عموماً اپنے ساتھیوں کے جمگھٹے سے گریز کرتا تھا لیکن بچپن ہی سے اُس کی طبیعت دوستداری کی طرف راغب تھی۔ اُس کی دوستی ہمیشہ نہایت ناقابلِ عمل اور اسی لئے بالکل ناپائدار ثابت ہوتی تھی۔ وہ جس کا ہو جاتا پھر اُسی کا ہو کر رہتا۔ اور اس پر بس ہوتی تو خیر اُس کی یہ توقع کہ اُس کا دوست بھی اُس کا ہو جائے اور پھر محض اُسی کا ہو کر رہے یاس انگیز اور بالآخر ناکام ثابت ہوتی۔

جمیل ایک شاعر مزاج خیال پرست نوجوان تھا۔ اُس کی روح کو ہمیشہ محبّت کی تلاش رہتی تھی اور اُس کے دل و دماغ ہمیشہ ہم خیالی و ہم آہنگی کے جویا تھے۔ جہاں تک عام فہم زبان میں کچھ کہا جا سکتا ہے محبت سے اُس کی مراد ایک ایسی خیالی مصاحبت تھی جس کا مدعا صرف ناقابلِ فہم اور ناممکن العمل تصورات میں مل کر محوِ پرواز رہنا تھا ـــــــ آٹھوں پہر کی مسلسل صحبت، دن رات کا غیر منقطع انہماک، رسمی گفتگو سے یکسر پرہیز اور فقط باہمی مجالست یا گلگشت اور باہمدگر ایک قلبی و روحانی استغراق ـــــــ کوئی اس سے کیا سمجھتا اور جمیل بھی بجز اس کے کچھ نہ سمجھا کہ کسی دوسرے کی مدد سے یہ سب کچھ سمجھا جا سکتا ہے!

شالامار کے گلزاروں میں اُس کے فوّاروں کے قریب اُس کی روشوں پر جمیل کے قدم تھے۔ فضا میں جو چاندنی سے معمور تھی، نکہت کے پس و پیش جو ہر کہیں منڈلا رہی تھی، پانی پر جو چمک چمک کر بہہ رہا تھا اُس کا نفس تھا۔ اور اُس کا دل جو بالعموم کسی نامعلوم سرزمین کی طرف سرگرداں رہتا تھا۔ آج رات اِسی چاندنی بھرے باغ میں ایک کم سن دوشیزہ کی رعنائی کے قدم سے رہا تھا!

جمیل نے ثروت کو بارہا پہلے دیکھا تھا اور آج بھی دیکھا۔ لیکن آج دیکھا تو وہ ایکبارگی ہمہ تن سرور و انبساط ہوگیا مگر ساتھ ہی کچھ غمگین و ملول بھی + اُسے ایسا معلوم ہوا گویا ایک کھوئی ہوئی چیز اُسے مل گئی، وہی چیز جسے اُس نے چند دنوں اپنے ہم عمر دوستوں عالم اور اختر اور ظفر سے پاکر کہیں کھو دیا تھا + اُسے یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ ثروت اُس کی ہم جنس نہیں۔ ہم جنسوں کی دوستی میں اُس نے کب دیکھا تھا کہ قابلِ عمل کیا ہے اور کیا نہیں۔ دوستی میں اُس نے نہ کسی مصنف کی پند و نصائح سے فائدہ اٹھایا نہ کسی بزرگ سے مشورت کی کہ ایک نوجوان کو کیونکر اس راہ میں گامزن ہونا چاہئے اور نہ خود کبھی غور کیا کہ اس امتحان میں کامیابی کیسے ہوسکتی ہے؟

جمیل نے ثروت کو دیکھا ثروت نے جمیل کو۔ لیکن جمیل نے وہ کچھ دیکھا جو پہلے کبھی اپنی آنکھوں نہ دیکھا تھا اور ثروت نے شاید وہی دیکھا جو وہ بارہا پہلے دیکھ چکی تھی + جمیل نے ثروت کو ثروت کہہ کر پکارا تو اُس نے حسبِ معمول جواب دیا لیکن جب ثروت نے جمیل کو جمیل کہا تو اُس کی رُوح و رواں میں ایک لرزش سی پیدا ہوگئی اور بجز اِس کے کچھ جواب بن نہ پڑا کہ اُس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور خاموش ہوگیا + وہ کہتا تو کیا کہتا کہ اب "ثروت" کا لفظ جمیل کے لیئے دنیا بھر کا سب سے زیادہ ناقابلِ اظہار جذبہ ہوگیا تھا!

اُسے اِس بات کا کچھ علم ہوچکا تھا کہ لڑکے لڑکی کی دوستی مشرقی تہذیب کے منافی ہے۔ وہ اِس تہذیب کا پابند تھا اور اِس لیے محبت کے اولین جذبات کے پیدا ہوتے ہی اُس کے منہ پر مُہرِ خاموشی ثبت ہوگئی + جہاں وہ اپنی عزیزہ ثروت سے دوسروں کے ہوتے یا تنہا بھی بہت سے کھیل کھیل سکتا تھا اور بہت سی باتیں کیا کرتا تھا۔ وہاں اب برسرِ محفل وہ اُسے اُس کے نام سے بھی نہ پکار سکتا تھا!

جمیل نے اُس چاندنی رات میں آبشار کے کنارے حسن کا وہ سیمیں ہلال دیکھا جس نے اُس کے دل کی ندی میں سمندروں کا طوفان برپا کردیا! وہ نہ سمجھا کہ یہ کیا ہوا اور کس لیئے؟ وہ سمجھا تو یہی سمجھا کہ اُسے وہ ہم خیال مل گیا ہے جس کی اُسے تلاش تھی جو پا پا جا کر بسا اوقات کھو گیا تھا اور سچ یہ ہے کہ اس کے نقطۂ نظر سے یہ تھا بھی بالکل درست + اُسے اک رفیق کی تلاش تھی —— تو کیا یہ رفیق وہی نہ تھا، وہی نہ تھی جس کی اُسے اک زمانے سے جستجو تھی؟!

رات اور رات بھی چاندنی، باغ اور باغ بھی پانیوں کی ہلکی شورش اور پھولوں کی بھینی نکہت سے مست و معمور، صحبت اور صحبت بھی بھولے بھالے معصوم بچوں اور ہم عمر عزیزوں کی —— اس فضا میں محبت کا وہ چشمہ پھوٹا جو خدا جانے کب سے زندگی کے کہسار کے نیچے نیچے اپنا سر پٹکتا ہوا روشنی کا رستہ ڈھونڈ

رہا تھا!

جمیل کا جی بھر آیا۔ اُس نے چاہا کہ وہیں کسی پھُوٹتے پھلتے گلزار کے پاس اُس آبشار کے قُرب میں جہاں چاند کی چاندی پانی کی روانی میں پگھل رہی تھی وہ اور ثروت تنہا بیٹھ جائیں۔ یہ اُسے اور وہ اسے اپنی ساری رام کہانی سنادے یہ اُس کے آگے اور وہ اس کے سامنے وہ شیریں گیت گا دے جو چاند اپنی چاندنی جو پھول اپنی نکہت اور جو آبشار اپنی روانی میں الاپتا ہے ـــــ گیت وہ گیت جو ہم آہنگ ہیں وہ دونوں گیت جو فی الحقیقت ایک ہی گیت ہے! بچپن کی دلچسپ و دلفریب باتیں ہوتی جائیں، محبت کی طول طویل کہانیاں کہی سُنی جائیں ـــــ اور یوں ہی یہ چاندنی رات ہو اور یہ رات یوں ہی چاندنی ہوتی جائے کہ کبھی اِس کی صبح نہ ہو اور ہو تو اِس کٹی پھٹی روشن دنیا میں نہ ہو بلکہ کہیں اَور کسی اَور سرزمین میں جہاں دہن پھول ہو اور گفتگو اُس کی نکہت!!

---

(۲)

جمیل کی زندگی اُداسی اور ناخوشی کا مرقع بن گئی۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ثروت کا چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اُس کی باتیں اُس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی تھیں۔ اُس کی آنکھیں اُس کے دل کی گہرائیوں میں جاگزین تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جمیل کی رُوح ثروت کے وجود سے معمور ہو گئی اور پھر کسی اَور شے یا تصور کے لئے وہاں جگہ باقی نہ رہی!

لیکن انسان محض اِک روح نہیں۔ اُس کا ایک جسم بھی ہے اور پھر اُس روح اور اُس جسم کی کڑیاں ہیں جنہیں ہم نفس و دماغ کہتے ہیں۔ جب تک یہ قفسِ عنصری ہے جب تک یہ کڑیاں ہیں ہم ایک قید میں ہیں اور اس قید ہی سے ہماری دنیاوی زندگی ممکن و مرتب ہے۔

جمیل شرمیلا تھا، کمزور تھا، پابندِ تہذیب و تمدن تھا۔ اِس لئے لازم ہوا کہ اپنے جذبۂ محبت کے متعلق وہ خاموش رہے اور زندگی کو حسبِ سابق جاری رکھے۔

علاوہ بریں وہ اپنے مخصوص خیالات کے سلسلے کا پابند بھی تھا۔ اُس کے خصوصی جذباتِ محبت اظہارِ محبت کو اک لغزش اور رسمی تکمیلِ محبت کو اک گناہِ کبیرہ تصوّر کرتے تھے۔

جب اُس کے دل نے پہلے پہل سوچا کہ مرد عورت کی محبت کا انجام شادی اور شادی بھی خانہ آبادی ہوتا ہے تو عرقِ ندامت کے قطرے اُس کی پیشانی سے ٹپک پڑے اور اُس نے اپنے جی سے پوچھا کہ کیا میرے آغازِ محبت کی غرض یہی تھی! اور پھر بآوازِ بلند کہا کہ مرد عورت میں محبت نہیں ہوتی اور نہ لڑکے لڑکیاں مرد اور عورت ہی ہوتے ہیں۔

جب اُسے یہ معلوم ہؤا کہ یا وہ ثروت کو شادی کے ذریعے سے حاصل کر سکتا ہے اور یا کوئی اور اُسے اپنے لئے حاصل کرے گا تو اُس کے دل میں "ناممکن" کی صدا اُٹھی اور اُس نے کہا کہ ثروت میرے حصول کے لئے نہیں۔ اُسے کوئی حاصل کرے تو کیا کرے لیکن اُس سے یہ نہیں کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری نہ رہے گی جب تک "میں" ہوں ثروت بھی چاہے تو اپنے تئیں مجھ سے نہ چھین سکے گی اور میں بھی چاہوں تو اپنے کو اُس سے جدا نہ کر سکوں گا۔ اُس نے کہا کہ جب دل حسن کی پاکیزہ ترین صورت کو دیکھ لے وہ صورت جو محبت سے معمور ہو وہ صورت جس میں محبت وعصمت وقوت مستور ہوں جب دل ایسے زندہ وپایندہ حُسن کو دیکھ لے تو اُس حُسن کا لطیف جوہر اُس دل میں جگہ پالیتا ہے اور پھر حسن بھی اُسے وہاں سے خارج نہیں کر سکتا۔ پُر محبت دل حُسن میں اُس محبّت کو ڈھونڈتا ہے جس کی کائنات بھر میں ہر ہستی کو تلاش ہے۔ پھر وہ حسن کھویا جائے لیکن وہ محبت فنا نہیں ہو سکتی۔ زندگی کے ساز میں جب صدائے محبت ایک بار ارتعاش پیدا کر دے تو اُس کا تار تار ہم آہنگی میں محوِ اہتزاز ہو جاتا ہے۔ پھر سازندہ ساز چھوڑ دے لیکن موسیقی اُس ساز میں ہمیشہ کے لئے گھر بنا لیتی ہے!

اور جمیل نے کہا "ثروت! میری تیرے لئے محبت درحقیقت تیری میرے لئے محبت ہے۔ خواہ تجھے میرا خیال بھی ناگوار ہو"!

غرض اِن جنوں زا روح پرور خیالات کی کشمکش میں جمیل دنیا اور زندگی کو صرف محبت کی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ سچ یہ ہے کہ دنیا اب اگر تھی تو محض اُس کے حواسِ خمسہ کے لئے اور زندگی پہلے اُس کے لئے نہ بھی تھی تو اب محبت کے بلوریں منشور میں سے وہ نہ فقط نظر آئی بلکہ اس کے ایک ایک پہلو پر رنگ رنگ کی خوشنما روشنیوں کا عکس پڑا۔ کائنات سمٹ کر زندگی، زندگی سمٹ کر محبت اور محبت سمٹ کر ثروت بن گئی۔ رات کے وقت وہ کہکشاں کے دائیں بائیں کے دو ستاروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا اور کہتا کہ وہ ثروت ہے اور یہ جمیل جنہیں دنیا کے رسمی گرد و غبار نے ایک دوسرے سے جُدا کر رکھا ہے بارہا شب کو سوتے وقت اُس کا لباس تر ہو گیا اور گرمی کی بہت سی کٹھن دوپہریں بھی ایسے ہی کرب واندوہ میں کٹ گئیں۔ صبح و شام اُس کے خیالات شعر وسخن کے جھولوں

میں جھُولا کئے اور اُداسیاں روز بروز اُس کے دل پر گھٹائیں بن بن کر چھا گئیں ۔ وہ اکثر تنہا رہتا اور اُس کا دل تخیل کی عزلت میں اپنی ثروت کو پہلو میں بٹھا لیتا ، اور اُس کے زبان و قلم بھی اکثر اُسے روبرو جان کر اُس سے ہم کلام ہوا کرتے !

ایک روز اُس نے اپنے اک خیالی نامہ محبت کو اِس حسرت سے ایک رنگین لفافے میں بند کیا اور اُس پر "ثروت کو ملے" لکھا کہ اُس سے شبہ ہوا کہ اب اُس کے جذبات قابو سے باہر ہو رہے ہیں اور شاید کوئی نیا گل کھلا چاہتا ہے ۔ تاکہ اُس کی بھولی بھالی دلبر کی حسین نگاہ کسی ناموزوں لفظ سے آزردہ نہ ہو جائے اُس نے لفافے کو دوبارہ کھولا اور اُس کے جملوں کو ٹھیر ٹھیر کر پڑھنا شروع کیا :-

میری ثروت !

میں نہیں جانتا کہ اِس سرنامے کو دیکھ کر تم کیا کہو گی ؟ ثروت ! تم میری اس لئے نہیں کہ میں تمہیں اپنی بنانا چاہتا ہوں ۔ تم "میری" محض اِس لئے ہو کہ مجھے تم سے محبت ہے ۔ تم میری ہو صرف اِس خلوت میں صرف اِس ساعت میں جب کہ تم خود میرے سامنے نہیں ، دنیا میں تم میری نہیں ، تم اپنی ہو یا پھر جس کسی کی بھی تم ہونا چاہو !

ثروت ! میرا وجود تو محض اِس لئے ہے کہ میرے دل میں تمہارا عکس نظر آئے تمہارے حسن سے میرے دل میں محبت کے جذبات پیدا ہوں ، تمہارے خیالوں سے میری تنہائیوں کی دنیا معمور اور تمہاری آنکھوں کی یاد سے میری تاریکیاں پُرنور ہو جائیں ! میری ثروت !

تمہارا جمیل

ساتھ ہی ایک پرزے پر یہ شعر بھی تھے :-

مُورت مری صورت تری ثروت مری پیاری !
راحت مری چاہت تری ثروت مری پیاری !
غم میرے لئے ، تیرے لئے لُطف و مسرت
عشرت مری خدمت تری ثروت مری پیاری !
چہرے میں حیاء سر میں خرد ، دل میں محبت
آنکھوں میں مروّت تری ثروت مری پیاری !

کُلفت بھی ہو مجھ کو تو وہ کلفت نہیں مجھ کو
غم خوار ہے اُلفت تری ثروت مری پیاری!
تنہا جو نہ ہوتے تو نہ قسمت سے تجھے روتے
آفت ہے محبت تری ثروت مری پیاری!
ننھا سا ترا دل ہے مرے پیار سے آگاہ
ہاں چپ کی ہے عادت تری ثروت مری پیاری!

ثروت نے اُسی روز سہ پہر کو اپنی میز پر ایک لفافہ پڑا پایا۔ کھولا تو دیکھا ―― "میری ثروت"! دپھر گھبرا کر راقم کا نام دیکھا تو لکھا تھا) ―― "تمہارا جمیل" ―― اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا خط کو پھر پڑھنا شروع کیا ―― "میری ثروت!" ―― کہ اتنے میں چونک کر جاگ اُٹھی۔ کنکھیوں سے میز کی طرف دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ شرما کر پھر لیٹ گئی۔ لیکن اب نیند ان شیریں آنکھوں میں کب آتی تھی؟

(۳)

جمیل کی آنکھوں میں تو ثروت جو کچھ تھی سو تھی لیکن یوں بھی یہ دوشیزہ حسن و جمال کا اک تازہ مرقع تھی۔ اُس کا قد میانہ، اُس کی چال موزوں اور اُس کی چھب دلکش تھی۔ اُس کے رخساروں میں صباحت کی چمک اور اُس کی آنکھوں میں حیاداری کی جھلک تھی۔ اُس کا ذرا گول سا چہرہ، اُس کی ستواں اُٹھی ہوئی ناک، اُس کی لانبی لانبی پلکیں اور اُس کے پتلے پتلے ہونٹ ایسے متناسب تھے کہ وہ حسین صورتوں کے درمیان ایک چینی کی مورت معلوم ہوتی تھی! اُس کی نگاہ شرمگین تھی لیکن اُس بچپن کے عالم میں بھی اِس ادائے شرم کی خوش رنگ سطح کے نیچے معصوم شوخی اور انجان محبت کی ہلکی ہلکی لہریں اٹھتی معلوم ہوتی تھیں! وہ اپنے حُسن سے قطعی ناآگاہ تھی اور دلبرانہ اداؤں کے مصنوعات سے یکسر آزاد۔ بچپن اُس کے بھولے بھالے چہرے پر سبک پرواز بادلوں کی طرح منڈلاتا تھا اور طفلانہ شوخی اُس کے لب و دنداں پر قوسِ قزح کی طرح کھیلتی تھی! اُس کی مسکراہٹ میں ایک نرم و نازک غنچے کی شگفتگی تھی اور اُس کے قہقہوں میں کسی رنگیں نوا بلبل کے چہچہے! وہ محض حسن نہ تھی۔ وہ حسن کے ساتھ معصومیت، معصومیت کے ساتھ محبت اور محبت کے ساتھ زندہ دلی بھی تھی!

وہ تنہائی پسند نہ تھی، قدرت نے گویا اُسے محفل آرائی کے لیے ہی پیدا کیا تھا۔ وہ جس محفل میں شریک

ہوتی محفل کا گلدستہ بن جاتی وہ جس مجمع میں بیٹھتی اُس کی زیب وزینت ہو جاتی تھی۔ جب وہ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں کھیلتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ چاند کی کشتی تاروں کے کنول پھولوں کے بیچوں بیچ آسمان کی نیلگوں جھیل میں رواں ہے! اے کاش وہ یونہی کھیلتی رہتی، دریائے طفلی کے ہنڈولے میں یہ گوہر شاہوار یونہی اپنے صدف میں جھولتا رہتا اور کسی کی نظر اُس پر نہ پڑتی، بچپن کے رنگا رنگ پھولوں کے درمیان یہ چڑیا یونہی چہچہاتی رہتی ——— مگر مشرق کی دنیا میں جہاں بے نظر پڑے عقاب اپنے شکار پر جھپٹ پڑتا ہے۔ یہ کیونکر ممکن تھا؟

اُس کی تعلیم گھر پر ہوئی تھی۔ وہ انگریزی اور اردو اور فارسی علم ادب میں خاصی دسترس رکھتی تھی اور تاریخی کتب سے اُسے خاص شغف تھا۔

غرض ثروت حُسن و اخلاق اور تعلیم و تربیت ہر لحاظ سے بہمہ صفت موصوف تھی!

جمیل جو انٹرنس کا امتحان پاس کرکے اب کالج میں داخل ہونے والا تھا ثروت کے بھائی حمید کا ہم عمر اور ہم جماعت تھا۔ حمید کی اُس کی خاصی دوستی تھی۔ حمید کی خواہش پر اُس کے والد نے شیخ نعیم الدین سے اصرار کیا کہ جمیل کو بجائے بورڈنگ ہوس میں داخل کرنے کے حمید کے ساتھ ہی لاہور میں رہنے دیں۔ مردوں مردوں میں یہ باتیں ہوئیں لیکن مردوں کی وہ خانگی کنجیاں جن کے بغیر مُراد کے قفل کبھی کھل نہیں سکتے باہمی تعلقات کی پیچیدگیوں کو بہتر جانتی تھیں۔ ثروت کے لئے درپردہ پیام آنے شروع ہو گئے تھے اور اُس کی والدہ بدرالنسا اس تاک میں تھیں کہ ننھے پھول کے شیدائیوں میں بہترین گلچیں کونسا نکلے۔ جمیل اچھا لڑکا تھا لیکن محض داشتہ آید بکار۔ اُس کے مقابل میں زیادہ موزوں امیدوار موجود تھے اور انہیں میں سے انتخاب ضروری تھا۔

اُدھر جمیل کی والدہ خورشید بیگم کے اپنے منصوبے تھے۔ ہرچند جمیل کے لئے علیم الدین کا گھرانا اونچا تھا لیکن بجائے بدرالنسا کے گھر میں چاند نا کرنے کے اُسے اپنی بہن کا کلیجا ٹھنڈا کرنا تھا اور پھر عذرا لڑکی بھی کسی سے کم تھی؟ سو نہ ثروت کی والدہ نہ جمیل کی والدہ کسی طرح اُن کے رشتے پر راضی تھیں۔ اس لئے وہ اُن کے ایک ساتھ رہنے کے مخالف تھیں۔ لیکن علیم الدین مغربی وضع کے ایک فراخ دل آدمی تھے۔ چار راتوں کے باتونی جنگ کے بعد میاں نے بیوی کو سمجھا بجھا کر منا لیا کہ اکٹھے رہنے سے رشتے ناتے کو کچھ تعلق نہیں کیونکہ اب بارہا ایسے موقعے پیدا ہوا کریں گے اور ہونے بھی چاہئیں کہ نوجوان لڑکیاں لڑکوں سے ملیں جلیں اور

طرفین کے دل میں شادی کا خیال پیدا نہ ہو۔ بدرالنسا کی مزید تسلی ہوگئی جب ایک روز خورشید بیگم نے باتوں باتوں میں پیش بندی کے طور پر جتا دیا کہ جمیل کے لئے اُس کا خیال کدھر کو ہے؟

جمیل "علیم منزل" میں رہنے لگا۔ اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُس نے بہتیری کوشش کی کہ وہ معمول کے موافق زندگی گزارے۔ تیار ہوکر کالج جائے وہاں پڑھ پڑھا کر کالج کی بازی گاہ میں جا کر کوئی کھیل کھیلے۔ شام کو کسی طالب علمانہ مباحثے میں حصہ لے اور رات کو توجہ سے پڑھا ہوا دہرائے اور یوں باقاعدہ اپنا کام کرتا رہے۔ وہ اُن نوجوان مسلمان عشاق کی طرح تو تھا نہیں جو بمصداق

علی الصباح کہ مردم بہ کاروبار روند
بلاکشانِ محبت بکوئے یار روند

دن کو گریبان چاک ہوکر کوچوں میں گھومتے شام کو غزل لئے مشاعروں میں پڑ اجائے اور رات رات بھر "سحر البیان" یا "زہرِ عشق" کی مثنویوں یا شیریں و فرہاد اور لیلیٰ و مجنوں کے قصوں میں ہمہ تن مستغرق رہتے ہیں۔ گریبان کھلا ہے۔ سر کے بال ہر سمت لہرا رہے ہیں جہاں جاتے ہیں گنگناتے ہیں "مزا دیتے ہیں بار نیرے بال گھنگروالے" جب تک جیب میں چاندی ہوئی ہر دوسرے روز سنیما میں جا دھمکے کہ اَور کچھ نہیں تو مغربی محبت کے ناز و ادا کے نظاروں ہی سے دل کی کچھ تسلی کرلیں اور ہفتے میں دو بار ضرور تھئیٹر میں جا ڈٹے کہ "وہ ہو بڑی بانکی دُلھنیا موہنیا" والا پارٹ سن کر اپنی آئندہ "چھیلی البیلی" کا سراپا آنکھوں دیکھ لیں اور رات کو خواب میں "دبلی گوری نار" سے زندگی کے ڈرامے کی تکمیل کرلیں۔ نہ تعلیم سے غرض نہ عزیزوں سے واسطہ نہ قوم کا جھگڑا نہ ملک کا ٹنٹا۔ ہندو مسلم لڑیں تو اُن کی بلا سے۔ انگریز ڈیم فول کہہ کر کسی "کالے لوگ" کو ریل کے فرسٹ کلاس سے ٹھکرا یا کرے تو ٹھکرایا کرے یہ حضرت رواداری اور بے اعتنائی کی تصویر ہیں۔ باوا کمایا کرے یہ کھایا کریں اور کھانا بھی کیسا؟ یہ عشق کے پھیر میں ہیں کچھ بھوک لگی تو خیر کچھ زہر مار کرلیا ورنہ بالعموم تو

نہ کھانے کی سُدھ اور نہ پینے کا ہوش
بھرا دل میں اُس کے محبت کا جوش

اور اتفاق سے

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے
کہا خیر بہتر ہے منگوائیے

کسی کے ہاں شادی ہو تو اور ماتم ہو تو اُن کا وہی ایک سا عالمِ استغراق ہے۔ کوئی مرتا ہے لوگ انا للہ وانّا الیہ راجعون پڑھتے ہیں مگر اِن کے وردِ زبان وہی

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

خدا نے کائنات بنائی مگر سوائے ان حضرتِ دلگیر اور ان کے رنگیں ادا دلربا کے سب محض بے سود۔ نری رُکاوٹیں، خالی لغویات فقط خشک نمائشیں۔ دنیا کی تاریخوں میں دین کے قصوں میں بہت کچھ ہو گزرا مگر یہ بات کہاں؟

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

نہیں جمیل کے جذبات بے معنی ہوں ناممکن التکمیل ناقابلِ عمل سب کچھ سہی لیکن متانت سوز اور حیات کُش نہ تھے۔ کم از کم اپنی طالب علمانہ زندگی میں اُس نے اپنے مقررہ کام کو بوجہِ احسن سرانجام دیا اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ انگریزی و اردو علم ادب کے چمن سے ہمیشہ رنگ رنگ کے پھول چنا کیا۔ لیکن گو جمیل کی محبت تضیع اوقات نہ تھی اُس کی زندگی کے تقسیمِ اوقات میں بظاہر اُس کا کچھ زیادہ حصہ نہ تھا لیکن اُس کے دل و دماغ پر ایک بارِ گراں پڑ گیا جس کے باعث اِس بالی عمر میں وہ اُس جسمانی چستی اور قلبی خوش خیالی سے محروم ہو گیا جو جوانی کا طغرائے امتیاز ہے۔

بظاہر یہ ہوا کہ راتوں کو چھپ چھپ کر رونے سے اُس کی آنکھوں پر عینک لگ گئی۔ اُس کے چہرے پر چھائیاں سی پڑ گئیں اُسے کھیل کود سے دلچسپی نہ رہی وہ ہم عمروں کی صحبت سے پرہیز کرنے لگا۔ غم انگیز اشعار اور پُر درد واقعات میں اُس کے لئے ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ باقی وہ اپنے کالج کے ہونہار طلبا میں سے تھا۔ ادب سے اُسے گہری دلچسپی اور بالخصوص فارسی عربی سے اُسے خاص الفت تھی۔ البتہ ایسے مضامین سے وہ گریز کرتا جو اُس کے نزدیک طبیعت کے اسپِ تازی کے ساتھ ایک ٹوٹے ہوئے چھکڑے کی طرح باندھ دیئے جاتے تھے۔ چنانچہ اگر امتحان میں ناکامی کا ڈر نہ ہوتا تو طبیعیات میں سوائے اس کے کہ "پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے" اُسے کسی اور حقیقت کا علم نہ ہوتا۔

اِس سے پہلے جمیل گاہے گاہے جب کبھی ثروت کو دیکھتا تو خوشی کے ساتھ مایوسی اور تسکینِ قلب کے ساتھ

اک نوع کی گرانی بھی محسوس کرتا اور جب اُس کا دل اُسے اِس پر ملامت کرتا تو وہ چپکے چپکے لسان الغیب کے یہ شعر گنگنانے لگتا۔

بلبلے برگِ گلے خوش رنگ در منقار داشت | واندراں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت
گفتمش در عینِ وصل ایں نالہ و فریاد چیست | گفت مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

لیکن یہ آہ و زاری خوشیوں سے یہ بیزاری یہ ترکِ صحبت یہ میلانِ کلفت ثروت کی قربت سے یہ سب کے سب دفعتہً لطف و مسرّت کے جذبات میں تبدیل ہو گئے + اور کیونکر نہ ہوتے چمن سے دُور دشتِ فرقت میں بلبل محوِ فغاں ہوا کرے لیکن چمن زار میں اپنے ننھے پھول کو آ کر دیکھتے ہی کیونکر ہمہ تن سرور و انبساط نہ ہو جائے + یہ جمیل کے لئے کوئی اک معمولی بات نہ تھی کہ اُس کی ثروت دن رات اُس کی نظروں کے سامنے ہو اور نظروں کے سامنے ہونے کے معنی بھی کوئی اُس وارفتہ مزاج نوجوان سے پُوچھتا + جس قدر اُس کا ثروت سے کوئی بات بھی نہ کرنا ایک غیر معمولی بات تھی اُسی قدر اُس کا عموماً اُس کی طرف دیکھتے ہی رہنا ایک صاحبِ نظر کے لئے قابلِ غور امر تھا + کچھ دنوں کے بعد جمیل ذرا سنبھلا اور اب ایک معمولی انسان کی طرح پہلے کی بہ نسبت زیادہ بولنے اور کم دیکھنے لگا + اُس کا جی یہی چاہتا تھا کہ نہ کچھ بولے نہ بُلائے بلکہ صرف اک دیکھے ہی جائے۔ ثروت کی آنکھوں میں دلکشی بھی حدِ کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ اُسے موتی کی دمک جانئے یا کسی پھول کی چمک، ابر آلود افق میں سے آفتابِ صبح کی تنک تابی کہئے یا تاروں بھری رات میں سک پا زہرہ کی جھلملاہٹ + ثروت کی نگاہوں میں وہ معصوم حسن جلوہ ریز تھا جس کا جواب محض جمیل کے دل کی بے لوث و بے غرض محبت تھی + اُس کا جی چاہتا تھا کہ دیکھے اور دیکھتا رہے۔ مگر اِس آوارۂ شباب و پابندِ قواعد دنیا میں جہاں محبت ایک جنسی غرض اور گفتگو ایک کاروباری معاملہ ہے کوئی کس طرح دیکھے اور کس طرح بولے اور کس طرح پیار کرے کہ وہ دنیا کی نظروں خلائق کے کانوں اور قدرت کے رشک و حسد سے محفوظ و مامون رہے +

یہ رشک و حسد قدرت کے دل میں اُٹھا اور سُوءِ انتقام دیکھئے کہ اُس نے جمیل ہی کو اپنی بہیمانہ عقوبت کا ذریعہ بنایا۔

ثروت کے لئے جو پیغامات کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا وہ گویا حسن و عشق کا ایک معرکہ تھا جس میں قسم قسم کے امیدوار اپنی اپنی برچھی تانے شکارِ حسن کی متاعِ جانفزا لُوٹ لینے کو میدان میں اُتر آئے +

اِن میں محمد سلیم تو اپنے کنبے ہی کے رکن تھے۔ شکل و شباہت دلکش تھی، کالج میں ایف اے میں تعلیم پاتے

تھے اور صفاتِ ستودہ سے پیراستہ تھے۔ لیکن ان کے وسائلِ معاش فی الحال محض مستقبل کے دستِ غیر مستقل میں تھے۔

دوسرے امرت سر کے رہنے والے ایک انجنیئر خان بہادر شہامت خاں تھے جو علاوہ پُرصحت اور نجیب الطرفین ہونے کے مال و دولت اور جاہ و مرتبت سے مُزیّن تھے۔ اُن کے چہرے میں رعب و داب جسم میں زور و توانائی اور چال میں گویا ایک قسم کی شان و شوکت تھی جس سے دیکھنے والا کہہ اُٹھے کہ یہ شخص اگر انجنیئر نہ ہوتا تو ضرور ایک روز وزیرِ زراعت یا سیاسی جلوسوں کا سرکردہ بنتا۔ مونچھوں پہ تاؤ دیتے ہوئے انہوں نے "فرزندی میں قبول" کئے جانے کا خلوص نامہ اپنے بڑے بھائی سے یہ کہتے ہوئے ڈاک میں ڈالا کہ شہامت قابلِ ملامت ہوگا اگر وہ ایک روز اِس پری کو اپنے شیشے میں نہ اتار لائے۔ اُن کا حافظہ کمزور اُن کا غصّہ تیز اور اُن کا "طبیعی" مزاج صبح و شام متغیر و متلون رہتا تھا۔

تیسرے بمبئی کے ایک مشہور خاندان کے جس میں پردہ کی پابندیاں رفع دفع کردی گئی تھیں ایک نوجوان بیرسٹر تھے ان کے کچھ حالات بجز اِس کے معلوم نہ ہوسکے کہ یہی صاحب اور اُن کی بیوی اِس زوجیت طلبی کے اٹھارہ سال بعد لاہور والوں سے مصوری میں اسٹیفل کی تفریحی طعام گاہ میں رسمی طور پر ملے۔

اِن پیغاموں پر گھر میں آئے دن جب کبھی بیچاری ثروت سب کے درمیان موجود نہ ہوتی یا زبردستی کسی بہانے سے اِدھر اُدھر بھیج دی جاتی گفت و شنید ہوتی۔ علیم الدین اپنی بیٹی کی اتنی جلد شادی کرنے کے مخالف تھے اور نہ یہ چاہتے تھے کہ ان باتوں کا تذکرہ نوجوانوں اور دوسرے عزیزوں کے سامنے ہوتا رہے لیکن بدر النساء اِن فرضی اصولوں کی اصولاً دشمن بنیں۔ اول تو اُن کا خیال تھا کہ شادی میں نہ عجلت کرنی چاہیئے نہ تاخیر بلکہ فقط مصلحتِ وقت کو دیکھنا چاہیئے اور دوسرے مخفی معاملات اگر طشت از بام نہ بھی ہوں تو بعض اوقات اُنہیں خود ظاہر کردینا چاہیئے تاکہ پیغام بھیجنے والوں کے حُسن و قبح پر بخوبی روشنی پڑ سکے۔ اُنہوں نے اپنے نرم دل شوہر کو اِس بات پر راضی کرلیا کہ گو ثروت کی جلدی شادی کرنے کی ضرورت نہیں مگر کم از کم اِن "طالبینِ صادقین" کے ٹھیک ٹھیک حالات ضرور دریافت کئے جائیں۔ ہمارے پاس گنجائش نہیں کہ اس "خُفیہ معاشرتی خدمت" کے عام نفسیات اور خاص رپٹوں پر تنقید کی نظر ڈالیں۔

لیکن جو بات ہمارے نقطۂ نگاہ سے اہم ہے وہ یہ تھی کہ جمیل کا دل روز بروز ان خانگی مباحث کو سُن سُن کر متہیج و مضطرب ہوتا گیا۔ بے اطمینانی نے ملال اور ناآگاہی نے یاس کے ساتھ مل کر اُس پر ہونے والے

واقعہ کی دل سوز بجلیاں گرائیں + کیا اُسے محض اِس بات کا رنج تھا کہ کسی کی طفلی کے دن جس میں وہ بھی شریک بازی رہا ہے ختم ہونے والے ہیں؟ کیا اُسے اِس کی فکر تھی کہ جس کی ساری زندگی کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے کیا جا رہا ہے اُسے ایوانِ مشورت سے بارہ پتھر باہر نکال دیا جاتا ہے؟ یا کیا اُس کی عقل اِس پر ہنس رہی تھی کہ جسے تو سچّی محبت کی نظر سے دیکھتا ہے وہ عنقریب عمر بھر کے لئے کسی اَور سے رسمی طور پر چیپک دی جانے والی ہے اور تُو چپ چاپ بیٹھا اپنے خیالوں میں محو ہے؟ یا کیا اُس کی ننھی آرزو آبدیدہ ہو کر کہہ رہی تھی کہ اگر یہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا تو پھر میرے سارے تخیلات ہیچ اور میرے سارے تصورات قطعی طور پر ملیا میٹ ہو جائیں گے!

شاید یہ سبھی عمل پہلو بہ پہلو دل میں جاری تھے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ اس جذباتی کش مکش پر اُس کی شاعریت وخیال پرستی نے اپنے رنگین آنچل ڈال رکھے تھے۔ جن سے جمیل کو خود بھی اپنی دلی خواہشات کی پوری پوری خبر نہ تھی کہ وہ کیا ہیں اور اُن کے لئے بیرونی دنیا میں کیسے نتیجہ خیز فیصلے سنائے جانے والے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اگر حالات خود مساعدت کرتے اگر بجائے اس کے کہ وہ اتحادِ محبت کی طرف قدم بڑھائے اتحادِ محبت خود اُس کی طرف قدم بڑھاتا اور اِس معاملے میں طرفین کے عزیز واقارب ترغیب دیتے تو وہ اُس مادی ظاہری یگانگت سے بھی انکار نہ کر سکتا۔ جو دنیا والوں کے نزدیک جمیل کی سی روحانی مصاحبت سے کہیں زیادہ قابلِ عمل اور سود مند ہے + لیکن علاوہ اَور باتوں کے ابھی جمیل کی عمر ہی کیا تھی کہ اِس قسم کے سوال اُٹھائے جاتے اور یوں بھی مستقبل مُسکرا رہا تھا کہ تیری قسمت میں وہ کچھ اور وہ سب کچھ ہے جس کا عُرفی الحقیقت تمنائی ہے!

مگر جمیل کو مستقبل کی کیا خبر تھی؟ وہ تو فقط یہ دیکھ رہا تھا کہ بچپن جس کے چمنستان میں وہ اور ثروت ننھی چڑیوں کی طرح اُڑا کئے ہیں وہاں اب اُس کے پیارے آشیانے کے اُوپر شاہین اور باز اور عقاب خوب منڈلاتے پھرتے ہیں اور اُدھر باغبان بھی یہی کہہ رہا ہے کہ یہ رنگین چڑیاں اِن بازوں اور اِن عقابوں ہی کے لئے ہیں + وہ خود ایک ذرا سا پکھیرو تھا اُس میں نہ اپنی ننھی چڑیا کو بچانے کی قوت تھی اور نہ اِن طاقتور شکاری پرندوں کے مقابلے کی تاب +

کہاں تو یہ کیفیت تھی کہ کسی کا نظارۂ جمال جہاں نما ہو رہا تھا اور کہاں اب یہ حالت ہو گئی کہ اُس کے قُرب میں دنیا جمیل کی آنکھوں میں اندھیر ہوتی گئی! کبھی وہ وقت تھا کہ وہ ثروت کی جدائی میں رو کر خوش ہو لیا کرتا تھا اب یہ ساعت بھی آئی کہ اُس کی قربت میں سینے میں ایک ایسی آگ لگی نہ جس کا دھواں آہوں میں نکلتا تھا نہ جس کے شعلے آنسوؤں میں تبدیل ہوتے تھے + نوبت بایں جا رسید کہ یہ اضطرار ناقابلِ برداشت ہو گیا اور

جتنی مسرت جمیل کو یہاں آتے ہوئی تھی اُتنی ہی بے چینی اب یہاں رہنے میں محسوس ہونے لگی!

آخر اک روز اُسے ایک ترکیب سوجھی - اِس ڈر سے کہ اُس کے والد شاید اِس منصوبے سے متفق نہ ہوں اُس نے اپنی والدہ سے کہا کہ وہ لاہور میں خوش نہیں وہاں ایک عجیب بین الاقوامی ماحول ہے جو تعلیم کے سکون میں مخل ہوتا ہے - بہتر ہے کہ اُسے علی گڈھ بھیج دیا جائے + خورشید بیگم بڑی سیانی عورت تھی - اُس کی آنکھ سورج کی طرح چھُپی ہوئی چیزوں پر روشنی ڈالتی تھی - اپنے بیٹے کے لاہور جانے کے بعد جلد اُس نے تاڑ لیا تھا کہ اُس کی غلط انداز نگاہیں وہاں پڑ رہی ہیں جہاں سے انہیں ہٹ جانا چاہئے - پس اگرچہ جدائی ماں کو شاق تھی لیکن اُدھر رشتے ناتے میں ساری عمر کا معاملہ تھا اِس لئے اُس نے جمیل کی تجویز پر بخوشی صاد کیا اور نعیم الدین کے سامنے بیٹے کی بے حد تعریف کی کہ کس قدر حوصلہ مند لڑکا ہے کہ سب عزیزوں کو چھوڑ چھاڑ کر محض اپنی تعلیم و ترقی کے لئے گھر سے اتنی دور جانے کو تیار ہے +

علی گڈھ میں داخلے کا انتظام کر لیا گیا - یہاں کے احباب نے جب اِس سفر کی خبر سنی تو اُن کو رنج و تعجب ہوا + ہم نے احباب کا ذکر کیا ہے مگر فی الحقیقت جمیل کا صرف ایک ہی دوست تھا - جمیل میں دوستداری کا مادّہ ضرور تھا لیکن دوستی بھی اُس کے نزدیک ایک نوع کی محبت تھی جس کا اثر ایک ہی وقت میں صرف دو شخصوں پر حاوی ہو سکتا تھا + یہ دوست اُس کے کالج کا ایک نووارد نوجوان پروفیسر منظور احمد تھا جس سے اُس کی راہ و رسم یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ دونوں میں جلد ایک نہایت گہری دوستی پیدا ہو گئی +

منظور عقل و شکل شرافت و دولت ہر لحاظ سے ایک پسندیدہ نوجوان تھا - ولایت میں تعلیم پائی تھی لہذا مغربی تمدن کی مُہر بھی اُس کی شخصیت پر ثبت تھی - اِس پر طرّہ یہ کہ نہ ناچ رنگ کا شوق نہ شراب جوئے کی مغربی وضع کی عادات +

منظور کچھ عرصے سے جمیل کی طبیعت کے اضمحلال سے غایت درجہ متاثر ہو رہا تھا - جانے سے ایک ہفتہ پہلے اُس نے ایک دن شام کی چہل قدمی کے دوران میں جمیل سے بڑی محبت و ہمدردی سے کہا کہ "جمیل میں تم بھائی بھائی ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کہ ہم سچے اور بے تکلف دوست ہیں - تمہاری خوشی میری خوشی اور تمہارا رنج میرا رنج ہے - کچھ عرصے سے میں تم کو غمگین و ملول پاتا ہوں آخر مجھے کچھ تو بتاؤ یہ کیا ماجرا ہے"؟

جمیل نے چپکے سے جواب دیا "بھائی تم مجھے مسرور نہیں کر سکتے پس اِس ماجرے کے بیان سے حاصل؟ آپ ہماری دوستی میں جو بات مجھے بغایت خوش و مطمئن کر سکتی ہے وہ فقط یہی ہے کہ میں تمہارے لئے کچھ کروں"

کوئی خدمت جو تمہاری خوشی کی کفیل ہوسکے - خدا گواہ ہے کہ میرے لئے اس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں ہو
ہوسکتی کہ تم کو خوش دیکھوں!

منظور نے مسکرا کر جمیل کی طرف دیکھا پھر ذرا سنجیدگی سے کہا "جو کچھ میں چاہتا ہوں افسوس کہ میں
اِس کے قابل نہیں - جمیل بولا "منظور! تم میری نظر میں ہر شے اور ہر شخص کے قابل ہو" منظور نے جمیل
کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "تو میرے لئے معراجِ مسرّت یہ ہے کہ تم اپنی بجائے ایک ایسا رفیق میرے
لئے چھوڑو جو تمہاری طرح صادق اور تمہاری طرح میرا مُشیر کار بنے"!

رخصت کے دن جب احباب و اقربا اسٹیشن پر الوداع کہنے آئے تو جمیل نے حمید اور منظور کا ایک
دوسرے سے تعارف کرا کے کہا کہ "تم جو پہلے سے اک دوسرے کو جانتے ہو در اصل اِس تعارف کے محتاج
تھے کہ دونوں اک دوسرے کو صرف آنکھوں سے نہیں بلکہ دل سے پہچانو" پھر حمید سے کہا "حمید! میری بجائے
اب منظور تمہارا بھائی ہے" اور منظور سے کہا "منظور! اب حمید میری طرح تمہارا رازدار دوست ہوگا"!

بشیر احمد

باقی

اپنے پھول سے

خبر بھی اِس کی ہے کچھ اے گُلِ بہار تجھے؟ — پکارتی ہے تری عندلیبِ زار تجھے!

ترے خیال میں راحت سے بے خبر ہے کون؟ — خبر بھی اِس کی ہے کچھ میں ترے نثار تجھے؟

قرار جس سے ملے کچھ نہ کچھ مرے دل کو — کروں میں اے مری جاں اِس طرح سے پیار تجھے

گر اختیار مقدّر پہ ہو مجھے، دے دوں — جو اختیار مجھے ہیں وہ اختیار تجھے

سجاؤں باغ کے پھولوں سے تیرے گھر بھر کو — پنہاؤں آہ میں اک موتیوں کا ہار تجھے

ہے آرزو کہ ہوں پُوری تری تمنّائیں — یہ حق سے میری دعا ہے کہ دے قرار تجھے

سُرور و لطف کی کلیاں ترے چمن میں کھلیں — دکھائے باغ میں پھر باغباں بہار تجھے

نگہ سے اشک کی مانند اُسے ٹپکنے دے — کسی پہ آہ جو آتا ہے دل میں پیار تجھے

کہاں کہاں ہے جہاں میں ترے لئے چاہت — خبر یہ دیتا ہے میرے نفس کا تار تجھے

کرے ہزار جتن پھر بھی تیری اُلفت میں
لطیف یاد کر اُٹھتا ہے بار بار تجھے

لطیف

اپنے شاعر سے

آج تو نے مجھ سے یہ نہ پوچھا کہ میں جو صبر و تحمل کی پُتلی تھی جس کی سرد مہری جس کی جفا کی شکایتیں ہمیشہ تیرے ورد زبان رہا کرتی تھیں، کیوں اور کس لئے بے اختیار آنکھوں سے آنسو برسانے لگی؟ — آہ بہتر یہی ہے کہ تُو نہ پوچھے۔ یہ آتش نہاں خانۂ دل ہی میں پنہاں رہے۔ یہ سلگے اور ہمیشہ سلگتی رہے مگر اسی طرح کہ اس کا دھواں کبھی عیاں نہ ہو۔ یہاں تک کہ کسی روز یہ دھواں مجسم روح بن کر اس تنِ خاکی کو خیر باد کہہ دے، باغِ حقیقت میں یہ آتش گلزار ہو کر نمودار ہو اور گلستانِ فردوس کے ایک ایسے کونے میں جس کا تصوّر اِن تاریک راتوں کی تنہا مشعل ہے یہ گُل پھول بن کر پھلے پھولے!

صبر و قرار کا دامن ہاتھ سے جاتا رہا اُس وقت جب تُو نے موتیوں کا وہ ہار میری نذر کیا۔ تُو سراپا شوق تھا اور میں مجسّم حسرت۔ تیرے اِن الفاظ نے "مجھے یہ ہار اپنی گردن میں پہنانے کی اجازت دے" میرے رہے سہے ہوش و حواس کھو دیئے! یہ ہدیہ کیسے قبول کروں؟ آہ تو کیا جانے بہتر یہی ہے کہ نہ جانے اُن آرزوؤں اُن تمناؤں کی وسعت کو جو دل کے کسی گوشۂ تاریک میں ہمیشہ کیلئے مدفون کر دی گئیں! تجھے کیا معلوم کہ یہ دل جس پر تُو دنیا جہان کے موتی نچھاور کرنے کو تیار ہے تمام عمر ایک ایسے لمحے کو ترسا کیا جب کوئی اُسے اپنے ہاتھ سے زیادہ نہیں، ایک ننھا سا پھول ہی پیش کرے! جسے دنیا میں ہر شے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے وہ کیا جانے کہ کسی کا پیار سے کچھ "پیش کرنا" کسے کہتے ہیں؟!!

کڑکڑاتے جاڑے کی اُن طویل راتوں میں، جب نیند پلکوں میں آنے کا نام نہ لیتی ہو، جب ایک ایک گھڑی ایک ایک سال معلوم ہوتی ہو، تنہائی میں آہ و زاری، بے قراری اور اشک باری میں وقت تمام ہوتا ہو وہ شباب کا بہترین زمانہ اِسی رنج و محن میں گزر چکا۔ بہتر یہی ہے کہ اب آرزوؤں اور تمناؤں کے مدفن پر پھول چڑھائیں، ہمیشہ اُس کی یاد دل میں تازہ رکھیں اور اُسے ٹھوکر لگانے سے پرہیز کریں۔

اے دوست آ! ہم اسی کوشش میں تمام ہو جائیں! اسی جدوجہد میں بقیہ عمر صرف کر دیں۔ کہ یہ غنچہ جو اِس مدفن کی خاک میں سے چٹکا ہے ہماری آرزوؤں کے خون اور اشکِ حسرت سے اِس طرح سیراب ہو کہ وہ ایک رنگین و لاجواب پھول بن جائے! باغِ جنت کا یہ پھول آپ ہی اپنی نظیر ہو اُس کی نکہت گلستانِ حقیقت کو معطر کر دے اور اُس کی شمیم باغِ جہاں میں چاروں طرف پھیل جائے!!

ہجومِ جلوہ

ہر اک قطرہ ہوا آئینہ ساماں دیکھتے جاؤ
ہجومِ جلوہ ہائے شبنمستاں دیکھتے جاؤ

کیا ہے جلوۂ گل نے چراغاں دیکھتے جاؤ
گلستاں میں بہارِ صبحِ خنداں دیکھتے جاؤ

مرے آئینۂ دل نے محبت سے جِلا پائی
اِس آئینہ میں اپنا روئے تاباں دیکھتے جاؤ

گلستاں میں تمہارے حُسن نے کی نور افشانی
تم اپنے حُسن کا یہ پرتوستاں دیکھتے جاؤ

چمن کا ذرہ ذرہ راہ میں آنکھیں بچھاتا ہے
تمہارے خیر مقدم کے ہیں ساماں دیکھتے جاؤ

شبِ تاریکِ ہستی میں منور کر دیا کیا
تمہاری یاد نے میرا شبستاں دیکھتے جاؤ

میں ہوں موجِ کرم کی گوہر افشانی سے بیگانہ
مرے دریائے نادانی کا پایاں دیکھتے جاؤ

مرا دل پارہ پارہ ہو گیا اندوہِ ہجراں سے
ہوا یوں آئینہ خانہ کا ساماں دیکھتے جاؤ

تمہارے آفتابِ حسن نے کیا نور پاشی کی
مہِ یثرب کا یہ کارِ نمایاں دیکھتے جاؤ

ح ب

حُسنِ عمل

میں اپنی زندگی کے ایام کو ایک عقلمندانہ طریقہ پر یُوں ضائع کرنا چاہتا ہوں کہ ہر صبح مسکراتا ہوا بستر سے اٹھوں۔ آنے والے دن اور اُس کی گوناگوں مصروفیتوں کا عزت و احترام کے ساتھ خیر مقدم کروں - ایک صاف اور پاکیزہ دل کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دوں - ہر کام کرتے وقت خواہ وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو اپنے انتہائی مقصد کو مدِ نظر رکھوں، لوگوں سے ملوں تو اِس طرح کہ ہنسی میرے لبوں پر کھیل رہی ہو اور میرا دل محبت کے نشہ میں چُور رہو۔ انکسار ہمدردی اور خوش اخلاقی ہر دم میری رفیق ہوں۔ میری راتیں اُس خمار آلود تھکن سے آشنا ہوں جو انسان کو میٹھی نیند سلاتی ہے اور میری روح اُس سرُور سے بہرہ اندوز ہو جو اپنے فرائض کو عمدگی کے ساتھ انجام دینے کے بعد حاصل ہوتا ہے!

میں نہیں جانتا کہ دنیا کی نظروں میں میری کیا حقیقت ہے لیکن اپنے تئیں تو یہی سمجھتا ہوں کہ گویا ایک بچہ تھا جو عمر بھر سمندر کے کنارے کھیلتا رہا اور عمدہ عمدہ گھونگے اور سیپیاں چن کر دل لگی کا سامان پیدا کرتا رہا۔ اِس حالت میں کہ صداقت کا بحرِ ناپیدا کنار ایک پوشیدہ مُعمّا بن کر میرے سامنے لہریں مار رہا تھا۔

مجھے اِس دنیا سے ایک ہی دفعہ گزرنا ہے اِس لئے جو کچھ اچھا کام مجھ سے ہو سکے، یا جو نیکی بھی میں کسی ہم جنس کے ساتھ کر سکوں چاہئے کہ اُسے ابھی کر لوں اور غفلت نہ کروں کیونکہ اِس راستے سے میرا گذر پھر نہ ہوگا!

اصل دنیا وہ ہے جو انسان کے دل کے اندر آباد ہے۔ بیرونی دنیا کی سب رنگینیاں اور لطافتیں گویا اِسی اندرونی دنیا کا عکس ہیں۔

سچا کمال یہ نہیں ہے کہ انسان کبھی لغزش نہ کرے بلکہ یہ کہ ہر لغزش میں گر گر کر سنبھلے

(ترجمہ)

محمد رفیع بیگم

سچّی شاعری

مسٹر جارج مور عہدِ حاضر کے انگریزی مصنفین میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے بجائے انگریز مصنفین کے انگریزی مصنفین کی اصطلاح قصداً استعمال کی ہے۔ کیونکہ مسٹر جارج مور اگرچہ انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے ہیں لیکن در اصل وہ آئرلینڈ کے رہنے والے ہیں اور اُس علمی تحریک کے علمبرداروں میں سے ہیں جو انیسویں صدی کے آخر میں آئرلینڈ کے ادبیات کو ترقی دینے کے مقصد سے شروع ہوئی تھی۔ اور جسے عموماً آئرش ادبیات کے احیاء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حال میں اس نامور ادیب نے انگریزی شاعری کا ایک منتخب مجموعہ "خالص شاعری" کے نام سے شائع کیا ہے جس میں مختلف زمنہ کے شعراء کے چیدہ چیدہ کلام کے علاوہ ایک نہایت دلچسپ تمہید کے پیرایہ میں اپنے خیالات شاعری کے صحیح موضوع کے متعلق بیان کئے ہیں۔ نفسِ مضمون کے لحاظ سے وہ شاعری کے دو اقسام قرار دیتے ہیں۔ ایک تو وہ شاعری جس میں شاعر صرف اپنے جذبات و حسیات اور وارداتِ قلبی کا اظہار کرتا ہے۔ اور دوسری وہ جس میں شاعر اپنی قوتِ متخیلہ سے واقعات و اشیا کی اصل حقیقت و ماہیت کو بین و واضح کر دیتا ہے۔ یہ تقسیم در اصل ایک فلسفیانہ تجزیہ پر مبنی ہے۔ دنیا کا کوئی واقعہ لے لیجئے (اور واقعات میں انسان کی اندرونی دنیا کے واقعات بھی شامل ہیں) مثلاً غروبِ آفتاب یا انسانی عمر کا انحطاط۔ اس واقعہ کو ہم دو طرح پر دیکھ سکتے ہیں ایک محض اس واقعہ کی اپنی کیفیت کے لحاظ سے اور دوسرے اُن اثرات کے لحاظ سے جو وہ واقعہ کسی خاص لحظہ میں ہمارے قلب پر وارد کرتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ہر ایک واقعہ فی نفسہٖ ایک مستقل شے ہے جو ہر ایک انسان کے لئے کم و بیش یکساں کیفیت رکھتی ہے۔ گو جو لوگ چشمِ بینا رکھتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت اُس شے کے زیادہ پہلو دیکھ سکتے ہیں لیکن اس واقعہ کا جو اثر کسی خاص انسان کے دل پر ہوتا ہے وہ یکساں نہیں ہو سکتا۔ اور قرینِ قیاس ہے کہ ایک ہی واقعہ دو مختلف شخصوں پر یا ایک ہی شخص پر دو مختلف اوقات میں مختلف بلکہ متضاد اثر پیدا کرے۔ مسٹر جارج مور اِس حقیقت پر انحصار کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ سچّی اور خالص شاعری وہی ہے جس کا موضوع حقائق اور واقعات ہوں اور جو شاعری شاعر کے تغیر پذیر جذبات و کیفیاتِ قلبی کی مظہر ہو وہ سچی شاعری کہلانے کی مستحق نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اول قسم کی شاعری ہر زمانہ اور ہر ملک کے شاعروں کے لئے یکساں تاثیر رکھتی ہے لیکن دوسری قسم کی شاعری کا اثر خیالات کے تغیرات کے ساتھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اور اس نوع کی کوئی نظم یا شعر جو ایک ملک اور ایک زمانہ میں نہایت موثر سمجھی جاتی ہو۔ ممکن ہے کہ دوسرے ملک اور دوسرے زمانہ

نہ صرف بے لطف بلکہ بے معنی تصور کی جائے چونکہ صرف اشیا اور واقعات ہی مستقل ہستی رکھتے ہیں۔ اس لئے اُن کی شاعری ابدی ہے۔ اور چونکہ واردات و موہوماتِ قلبی ناپائیدار اور عارضی موجودات ہیں۔ اِس لئے جس شاعری کا مدار اُن پر ہو اُس کو بقا نصیب نہیں۔

جارج مور کا یہ نظریہ غور و توجہ کے قابل ہے اور اگر مان لیا جائے تو یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اردو زبان کے مشاہیر شعرا کو اِس خاص معیار سے پرکھنے کے بعد جو آرا اُن کے مابین افضلیت کے متعلق عام طور پر قائم کر لی گئی ہیں اُن میں کہاں تک ترمیم کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے تو یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ آج کل کے اُردو شاعروں نے جو مسلک غالب کی تقلید میں اختیار کر لیا ہے۔ وہ غلط مسلک ہے۔ کیونکہ اُن کی شاعری کا انحصار زیادہ تر اُن کے ذاتی تخیلات و محسوسات پر ہوتا ہے جس کا پورا لطف وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جو اُن جیسی ذہنیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا نہال کی جس پیچیدگی و ندرت کو وہ اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ وہ دراصل اُن کی شاعری کے لئے باعثِ نقص ہے۔ خود غالب کا بھی بہت سا کلام جو اُن کی مشکل پسند اور عامیانہ خیالات سے نفورِ طبیعت کا نتیجہ تھا ساقط الاعتبار قرار پائے گا۔ پرانے اساتذہ میں میر تقی کو جو امتیازی درجہ حاصل رہا ہے وہ کم ہو جائے گا۔ کیونکہ اُن کے کلام کی رونق بہت کچھ واردات و کیفیاتِ قلبی پر منحصر تھی البتہ سودا کے پایہ میں کوئی پستی نہیں آئے گی بلکہ شاید کچھ پیشتر سے زیادہ بلند تسلیم کر لیا جائے۔ متاخرین میں آتش کا بازار کسی قدر سرد پڑ جائے گا لیکن میر انیس کی شان میں مطلق فرق نہیں آسکتا۔ مومن خاں کی شاعری بالکل نظر سے گر جائیگی، لیکن ذوق کے ناصحانہ کلام کی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ علیٰ ہذا القیاس داغ کا رنگ پھیکا پڑنے کی بھی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی لیکن "گلزارِ داغ" کو جو فوقیت اب تک رائے عامہ میں حاصل رہی ہے وہ ضرور زائل ہو جائے گی۔ اِن سب اساتذہ کے مقابلے میں ایک اور شاعر زیادہ وقیع تصور کیا جائے گا جسکو اب تک تذکرہ نویس مبتذل و عامیانہ کہا کرتے تھے یعنی نظیر اکبر آبادی کیونکہ اُس کی شاعری تمام و کمال واقعات و اشیا کے مشاہدہ پر مبنی ہے۔ اور خیالات و حسیات کی الجھن سے اُس کی آزاد طبیعت گریز کرنے کی عادی معلوم ہوتی ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ اِن قیاسات کو موجودہ زمانہ تک طول دیا جائے۔ اور آج کل کے مشاہیر شعرا کی بھی مسٹر جارج مور کے خیال کے تحت میں نام بنام تنقید کی جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ اِن دنوں ہر ایک شاعر اپنی اور اپنے طرفداروں کی نگاہ میں نہ صرف اردو بلکہ فارسی کے بھی تمام اساتذہ کا استاد ہے اور اُن میں سے کسی کے حق میں بھی وہ جراتِ ناقدانہ برتنا جو ہمارے اگلے وقتوں کے شعرا کے ساتھ بے خوف و خطر برتی جاسکتی ہے میرے یا کسی اور سست قلم مضمون نگار کے لئے نہایت مخدوش رو یہ ثابت ہوسکتا ہے۔

محمد سعید

تُو اور میں

تو نغمہ چاہتا ہے، فغاں چاہتا ہوں میں
تو چاہتا ہے جو، وہ کہاں چاہتا ہوں میں

چہرہ پہ چاہتا ہے مسرت کی لہر تُو
سینے میں ایک برقِ تپاں چاہتا ہوں میں

تُو چاہتا ہے یہ کہ دہن گل فشاں رہے
جس سے شرر جھڑیں وہ زباں چاہتا ہوں میں

تُو چاہتا ہے دل کو ترے ہو سکوں نصیب
بیتاب دمبدم رگِ جاں چاہتا ہوں میں

تُو چاہتا ہے دیدۂ ظاہر ہو محوِ خواب
باطن میں دیدۂ نگراں چاہتا ہوں میں

شیخِ حرم سے گر تجھے زمزم کی ہے طلب
پیرِ مغاں سے رطلِ گراں چاہتا ہوں میں

تُو چاہتا ہے سایۂ گل ہیں ہوائے سرد
شاخِ چنار شعلہ فشاں چاہتا ہوں میں

تو زندگی کے ساحلِ خاموش پر مقیم
گردابِ زندگی کا سماں چاہتا ہوں میں

دل میں ترے ہے راحتِ پیرانہ کی اُمنگ
جذباتِ تیز و تند و جواں چاہتا ہوں میں

آسانیوں میں ہے تری خودداریوں کا راز
دشواریاں گسستہ عناں چاہتا ہوں میں

منبر پہ تجھ کو جلوۂ واعظ کا اشتیاق
سُولی پہ رازِ حق کو عیاں چاہتا ہوں میں

تو چاہتا ہے دل ہو ترا لالہ زارِ عیش
اُٹھتا ہوا جگر سے دھواں چاہتا ہوں میں

دنیا مسرتوں کی ہے درکار اگر تجھے
بیتابیوں کا ایک جہاں چاہتا ہوں میں

سلیم

صدائے روح

وہ محبت مجھے نہ دے جو یہ نہ جانے کہ تہ خانۂ دل میں پنہاں رہنا کسے کہتے ہیں بلکہ مئے پُرجوش کی طرح ساغر کو توڑ کر فرشِ خاک پر بہ جائے!

مجھے وہ محبت دے جو تیرے اُس بارانِ رحمت کی طرح سرد و پاکیزہ ہو جو پیاسی زمین کو تر و تازہ و شاداب کرتی ہے اور جو ہر کس و ناکس کے گھروندے کو اپنے فیض سے سیراب کر دیتی ہے!

مجھے وہ محبت عنایت کر جو میری روح میں اس طرح تحلیل ہو جائے جس طرح زندگی کا پوشیدہ رس برگِ زیست کے ہر رگ و پے میں پھیل جاتا ہے اور پھولوں پھلوں کی پیدائش کا باعث ہوتا ہے!!

مجھے وہ محبت عطا کر جو دل کو سکون و اطمینان سے معمور رکھتی ہے!!!

یہ یقین کرنا بہت دشوار ہے کہ دنیا کی ہر شے محض بے حقیقت نہیں جب تک کوئی ایسی آنکھ نظر نہ آجائے جو ہماری ہم نظر ہو جب تک کسی کے لبوں سے کوئی ٹوٹا ہوا جملہ کبھی نہ کبھی یہ ظاہر کرنے کو نہ نکلا ہو کہ جس شے کو ہم سب سے بیش قیمت تصور کرتے ہیں وہ کسی اور کے دل کے لئے بھی ویسی ہی بے بہا ہے۔

ہم ایک عجیب مرقع پیشِ نظر کرتے ہیں جب ہم اپنے تصورات کی راہ میں سفر کرتے ہیں ہم برابر بڑھے چلے جاتے ہیں۔ دم لینے سے عاری باہمت و جفاکش سفری!

یہ درست ہے کہ ہم کبھی اپنے نصب العین تک نہ پہنچ سکیں گے۔ بہت اغلب ہے کہ کوئی ایسی جگہ ہی نہ ہو اور اگر ہم صدیوں بھی جیتے رہیں اور ایک نیم خدائی قوت کے مالک ہوں تو پھر بھی ہم اپنے آپ کو اِس مقصد کے نزدیک تر نہ پا سکیں جس کے ہم اختتامِ سفر پر تمنائی تھے۔

اے فانی انسانوں کے محنتی ہاتھو! اے اُن تھک پاؤں جو نہیں جانتے کہ کدھر کو سفر کئے جا رہے ہو!!——تم اپنی قسمت سے خود ناآشنا ہو کیونکہ ایک امید افزا سفر حصولِ مقصد سے بدرجہا بہتر ہے اور سچی کامیابی صرف محنت و مشقت میں ہے!!

(ترجمہ)

شاہ نواز بیگم

نسلِ ہمایوںؒ کی یادگار

رسالہ ہمایوں اگرچہ میاں شاہ دین صاحب مرحوم کے ہمایوں تخلص کی یادگار ہے لیکن ہمایوں تیموریوں کے خاندان میں ہندوستان کا ایک شہنشاہ بھی گزر چکا ہے۔ اس لئے رسالہ ہمایوں کے یادگاری نمبر میں نسلِ ہمایوں کی تاریخی یادگاروں کا تذکرہ موزوں و مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بہادر شاہ کے پہلے ولیعہد۔ تیموری سلطنت کے آخری بادشاہ سراج الدین محمد ابوظفر بہادر شاہ تھے جو ۱۸۵۷ء کے غدر میں قید ہو کر رنگون بھیج دیے گئے۔

بہادر شاہ کے بڑے بیٹے کا نام مرزا دارا بخت تھا جو دستور کے موافق ولیعہد قرار پائے تھے مگر مرزا دارا بخت کا انتقال غدر سے بہت پہلے بہادر شاہ کے وقت میں ہو گیا تھا اور اُن کا مزار درگاہ حضرتِ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی میں واقع ہے

ان کے بعد بہادر شاہ کے ولیعہد مرزا فخرو مقرر ہوئے جن کے صاحبزادہ مرزا فرخندہ جمال آج کل بقید حیات ہیں اور برٹش گورنمنٹ ڈیڑھ سو روپے ماہوار اُن کو پنشن دیتی ہے۔

مرزا دارا بخت ولیعہد اول کے ایک صاحبزادہ مرزا احمد اختر صاحب تھے جو غدر ۱۸۵۷ء میں بالکل جوان تھے اور اُن کی غدر سے پہلے شادی بھی ہو گئی تھی۔ غدر کی مصیبتوں کے بعد مرزا احمد اختر دہلی چھوڑ کر کرانہ ضلع مظفر نگر میں چلے گئے تھے۔ حسن نظامی نے جس وقت مرزا احمد اختر صاحب کو دیکھا تو اُن کی ڈاڑھی سفید ہو گئی تھی اور وہ زرد مٹی کے رنگے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے اُن کو خواجہ غلام فرید صاحب رح ساکن چاچڑاں ریاست بہاول پور نے اپنے سلسلے کی خلافت بھی دی تھی اور ان کی گزر اوقات کتابیں لکھنے پر تھی۔ دہلی کے ہندو کتاب فروش معاوضہ دے کر ان سے کتابیں لکھواتے تھے اور چونکہ مرزا احمد اختر صاحب ہر علم اور ہر فن میں کچھ نہ کچھ دستگاہ رکھتے تھے اس واسطے انہوں نے تقریباً تریپن کتابیں مختلف علوم و فنون کی لکھیں اور اپنی یادگار چھوڑیں۔

مرزا محمد اختر۔ شہزادہ مرزا احمد اختر صاحب کے بڑے صاحبزادہ مرزا محمد اختر صاحب زندہ ہیں اور اعلیحضرت سلطان العلوم میر عثمان علی خاں حضور نظام نے ایک سو روپے ماہوار ان کی پنشن مقرر کر دی ہے

مرزا محمد اختر صاحب اکثر حیدر آباد میں رہتے ہیں اور کبھی اپنے عارضی وطن کرانہ ضلع مظفر نگر میں بھی آ جاتے ہیں ۱۷۔ نومبر ۱۹۲۷ء کو مرزا محمد اختر صاحب دہلی میں مجھ سے ملنے آئے اور باتوں باتوں میں اُن کے والد کی تصانیف کا ذکر آ گیا

مرزا صاحب نے فرمایا کہ والدِ مرحوم نے بہت سی کتابیں لکھیں اور اُن کی گزر اوقات اسی سے ہوتی تھی لیکن بعض چیزیں ایسی بھی اُن کی ہیں جو اب تک یا تو شائع نہیں ہوئیں اور اگر شائع ہوئیں تو اب نایاب ہوگئی ہیں۔

سوانحِ دہلی۔ شہزادہ مرزا احمد اختر صاحب گورگانی نے سنہ ۱۸۹۴ء میں ایک رسالہ سوانحِ دہلی کے نام سے لکھا تھا جس کو نرائن داس جنگلی مل تاجر کتب نے شائع کیا تھا اس رسالہ میں دہلی کے تمام قدیم و جدید انقلابات درج کیے گئے تھے اس کی زبان نہایت صاف اور موثر اور اصلی قلعہ معلیٰ کی زبان تھی۔ سوانح دہلی سے بعض باتیں ایسی بھی معلوم ہوئیں جن کی آج کل اردو پڑھنے والوں کو بالکل واقفیت نہیں ہے اس لئے اس مضمون میں اُن تاریخی یادگاروں کو اقتباس کر کے جمع کیا جاتا ہے۔

جب ہندوستان انگریزوں کو ملا۔ شہزادہ مرزا احمد اختر صاحب نے اپنی کتاب سوانحِ دہلی میں اس عہدنامہ کا اقتباس بھی اردو زبان میں درج کیا ہے جو بہادر شاہ بادشاہ کے دادا شہنشاہ شاہ عالم اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ہوا تھا اور جس عہد نامہ کی رو سے انگریزوں کو بنگال اور بہار کی دیوانی کا حق حاصل ہوا تھا اُس عہدنامہ کا اقتباس شہزادہ صاحب نے اِن الفاظ میں لکھا ہے۔

نقلِ عہدنامہ

عقیدت گزین عبودیت آگین وفادار خادم دلی خیر خواہ اشجع روزگار شریف ابنِ شریف کمپنی انگریزی کی خدماتِ لائقہ اور محبتِ مفرط سے خوش ہو کر مابدولت و اقبال بنگال بہار اڑیسہ کی خدمتِ دیوانی سنہ ۱۱۷۱ بنگلہ کی فصل اول بہار بطور بخشش و جاگیر استمغا کی تفویض کرتے ہیں کوئی اور اس عنایت میں شریک نہیں۔ جو خراج ماہ بماہ دیوان کو آستانہ فلک رفعت مابدولت پر حاضر کرنا چاہیے وہ ان کے لئے معاف کیا جاتا ہے اس خدمت گزارانِ سلطنت کو چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ کا ذمہ دار ہونا پڑے گا جو رقم نواب ناظم بنگال کو پیش کرنی پڑتی ہے۔ کمپنی کو لازم ہے کہ سالانہ رقم مذکورہ ادا کرتے رہیں مابدولت و اقبال کے سنہ ۶ جلوس میں ۸ صفر المظفر کو شرفِ نفاذ پایا۔

اِس عہدنامہ پر ایک نظر۔ اِس عہدنامہ کے الفاظ خاص طور سے قابل توجہ ہیں کہ انگریزی گورنمنٹ کو شاہ عالم بادشاہ نے عقیدت گزین اور عبودیت آگین اور وفادار خادم کے الفاظ عطا کیے تھے اگر آج کوئی تیموری شہزادہ انگریزی گورنمنٹ کو اس عہدنامہ کے الفاظ کے بموجب وفادار خادم یا عبودیت آگین کہہ دے تو شاید اُس کو جیل خانہ جانا پڑے لیکن ایک زمانہ وہ تھا کہ انگریزی گورنمنٹ نے اِن الفاظ کو نہایت فخر کے ساتھ عہدنامہ

میں لکھوایا تھا۔

اور اِس عہد نامہ کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیوانی صرف بہار اور بنگال کی دی گئی تھی اور اُس کے معاوضہ میں چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ خراج انگریزی گورنمنٹ پر لگایا گیا تھا۔

شاہ عالم نے ۱۷۷۳ء سے ۱۸۰۶ء تک حکومت کی اور ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلے نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں اور اُس کو اندھا کر دیا۔

ایک بہت بڑا تاریخی خط

شہزادہ مرزا احمد اختر صاحب نے اپنی کتاب سوانح دہلی میں مکتوبات لارڈ ولزلی سے جناب دفرلی بارلو اڈنی گورنر جنرل ہندوستان مورخہ ۲ جون ۱۸۰۵ء بنام صاحبان کورٹ آف ڈائرکٹرس فورٹ ولیم کلکتہ نقل کیا ہے گورنر جنرل کا نام اردو میں لکھنے کے سبب اچھی طرح سمجھ میں نہیں آیا۔ تاریخ دان حضرات ۱۸۰۵ء کے لحاظ سے اس نام کی اصلاح کر لیں گے اس خط میں چند باتیں نہایت غور طلب ہیں جن کا تعلق ہندوستان کی رعایا سے بھی ہے کیونکہ خط کے یہ الفاظ کہ "عدالت ہائے انصاف خواہ فوجداری خواہ مذہبی دیوانی دہلی اور اُس کے متعلقات کے باشندوں کے لئے شرع محمدی کے مطابق قایم ہوں"۔ اس فقرہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انگریز گورنمنٹ ۱۸۰۵ء میں تحریری وعدہ کر چکی ہے کہ دہلی اور اُس کے متعلقات کے باشندوں کا انصاف شرع محمدی کے موافق کیا جائیگا۔ مگر آج اِس وعدہ پر گورنمنٹ کا عملدرآمد نہیں ہے اور ضرورت ہے کہ مسلمان قوم برٹش گورنمنٹ سے بموجب مذکورہ وعدہ کے قانون شرع محمدی کے رواج کا مطالبہ کرے۔

اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں کو زیادہ فکر فرانس کا تھا مرہٹوں کا زیادہ فکر نہ تھا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گورنر جنرل نے شاہ عالم بادشاہ اور اُن کے خاندان کی عظمت وشوکت اور رعب وداب شاہی کو قایم رکھنے کا وعدہ کر لیا تھا لیکن شاہ عالم کے بعد انگریزوں کے سیاسی عہدہ دار اس وعدہ پر قائم نہیں رہے اور جیسا کہ میں نے کتاب "بہادر شاہ کے مقدمہ" میں اور کتاب "دہلی کی جانکنی" میں تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے پہلے برٹش افسران سیاسی برابر اس کوشش میں تھے کہ تیموریہ خاندان کا شاہانہ اقتدار بالکل نیست ونابود کر دیا جائے۔ اور دہلی میں جو ایک کانٹا بادشاہ کی صورت میں کھٹک رہا تھا اُس کو نکال کر پھینک دیا جائے۔

اور بھی کئی چیزیں اس خط سے معلوم ہوتی ہیں جن کو ناظرین کے غور کرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور وہ تاریخی خط یہ ہے :۔

از گورنر جنرل و کونسل

بخدمت صاحبان کورٹ آف ڈائرکٹرز۔ فورٹ ولیم کلکتہ

۲۔جون ۱۸۰۵ء

حضور پرنور فیض گنجور صاحبان!

گورنر جنرل کونسل حضور کی کمیٹی کو وہ انتظام بھیجتا ہے جو شہنشاہِ فلک بارگاہ شاہ عالم کے آئندہ گزارہ خاندانِ شاہی کی پرورش اور شہنشاہِ موصوف کے کاروبار لائقہ کے انصرام کے لئے سوچا گیا ہے اور جن اصولوں پر انتظامِ مذکور مبنی ہے وہ معرضِ بیان میں آئیں گے۔

اِس گورنمنٹ کی ہرگز یہ خواہش نہیں ہے کہ حضور پرنور کو حریفوں سے محفوظ رکھنے اور پنشن دینے کے عوض میں شاہی اختیارات حاصل کرے اور اُن کے وسیلہ سے ہندوستانی صوبوں اور ریاستوں پر کوئی حکومت جتائے اور شہنشاہِ موصوف کو اُن صوبجات پر جو وسیع سلطنتِ مغلیہ میں شامل تھے یا ہیں بطورِ شہنشاہِ ہندوستان کوئی حق جتائے یا رئیسوں کو تعظیم کرانے سے روکے۔ جو فوائد کہ گورنر جنرل نے شہنشاہ کو دشمنوں کے نرغہ سے نکالنے اور تختِ دہلی پر متمکن کرنے اور اُن کو اور اُن کے خاندان کو حفاظت میں لینے سے سوچے ہیں وہ ہمارے ۱۳ جولائی سنہ گزشتہ کے مکاتبہ سے منکشف ہوگئے ہونگے یعنی مرہٹے بالعموم اور فرانس بالخصوص شہنشاہ کے نام سے بہت سے حق جتاکر اور بہانہ کرکے سلطنتِ انگلشیہ کو خطرہ اور پریشانی میں ڈالتے اگر حضور برابر اُن کے قبضہ میں رہتے۔ خاص کر فرانس تو غضب مخالفت کرتا۔ اس مضمون کے حوالہ کے لئے گورنر جنرل کونسل جناب کی توجہ ہمارے ۱۳ جولائی سنہ گزشتہ کے مراسلہ کے اُس کاغذ کی طرف جس پر نشان الف دیا ہوا ہے اور اس مراسلہ کے نہترویں پیرے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جس میں اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ حضور شاہ عالم کو فرانسیسی اہلکاروں کی حفاظت میں لینے اور اُن کو اُن کی ہدایت پر چلنے کی حالت میں قوت انگریزی کو شکست کرنے کا منصوبہ ہو رہا تھا۔ اب تختِ دہلی کمپنی کے ہاتھ میں آگیا اور اس قسم کے منصوبے اب بڑی دقت میں پڑ گئے ہیں گورنر جنرل اس کے علاوہ اُن مصائب کو نہ دیکھ سکا جو فرانس اور مرہٹوں کے ہاتھ سے شہنشاہ اور خاندانِ تیموریہ پر پڑ گئے ہیں۔ وہ مفلسی، ادبار، شکستہ حالی میں مبتلا ہیں۔ خاص کر معمر بادشاہ کی یہ حالتِ سقیم چشم انسانی سے نہیں دیکھی جا سکتی۔ اس لئے گورنر جنرل شہنشاہِ موصوف کو اپنی حفاظت میں لیکر اُس کی بقیہ زندگی امن و آسائش سے گزروانا چاہتا ہے اصولِ مذکورہ پر خیال کرکے سرکارِ انگریزی نے عنانِ توجہ اس طرف مبذول کی ہے کہ شہنشاہ اور خاندان

شاہی کی پرورش کے لئے ایسا معقول انتظام کیا جائے کہ وہ ہر طرح اپنی عظمت و شوکت رعب و داب شاہی کو قایم رکھ سکیں۔ جائز حظِ زندگی سے بہرہ ور رہیں اور وفادار اور دوست سلطنتِ انگلشیہ کے رہیں جو اُن کے لئے ایک امرِ ضروری ہے۔

خاندانِ شاہی تک انگریزی حفاظت پھیلانے میں ہم کو حضورِ فیض گنجور شاہِ عالم کے بطور شہنشاہِ ہند کے حقوق کی نگہداشت کرنی اور اُن کی حکومت کو رجواڑوں سے تسلیم کرانے میں ہم کو کوئی دقت نہ پڑے اور اس لئے گورنر جنرل کا ارادہ ہے کہ تنخواہ کے ساتھ ہی اختیارات کا تصفیہ محض غیر ضروری ہے۔

گورنر جنرل کونسل نے مفصلۂ ذیل امور پر کاربند ہو کر آیندہ انتظام سوچا ہے۔

کہ دریائے جمنا کے مابین کنارے کے قطعاتِ زمین جس قدر گرد و نواحِ دہلی میں شامل ہو سکتے ہیں خاندانِ شاہی کے قایم رکھنے کی غرض سے دے دیئے جائیں وہ حصصِ زمین رزیڈنٹ دہلی کے چارج میں سمجھے جائیں اور حضور کے نام سے آمدنی جمع کی جائے اور انصاف چکایا جائے۔ اِن قواعد و ہدایات سے جو سرکارِ انگریزی نامزد کرے۔ حضورِ پرنور کو ایک دیوان اور کچھ معمولی اہلکار مقرر کرنے کی اجازت دی جائے کہ وہ دفتر کلکٹری میں موجود رہیں۔ اور تمام آمدنی جمع شدہ اور اخراجات جمع آمدنی کی حضور کو اطلاع دیتے رہیں۔ اور حضور کی دلجمعی کر دیں کہ آمدنی میں کسی قسم کا تغلب ہوا ہے یا نہیں۔ عدالت ہائے انصاف خواہ فوجداری خواہ مذہبی دیوانی دہلی اور اُس کے متعلقات کے باشندوں کے لئے شرع محمدی کے مطابق قائم ہوں۔ عدالتِ فوجداری کوئی حکم جو قیدِ میعادِ کثیر یا سزائے موت پر مشتمل ہو بغیر مرضی حضور عمل میں نہ لایا جائے اور تمام دعووں اور احکامِ مقدمہ کی اطلاع ہر روز حضور کو دی جایا کرے۔ علاوہ جاگیر مذکورہ و دیگر قطعاتِ دور و دراز حضور کی تعجیل طلب ضروریات کو پورا کرنے کے لئے رزیڈنٹ دہلی کے خزانے سے ہر مہینے رقوم ذیل حضور کے خرچ جیب خاص کے لئے دیئے جایا کریں۔

حضورِ پرنور	اسی ہزار روپے
ولیعہد صاحب علاوہ جاگیر	دس ہزار روپے
حضور کے عزیز صاحبزادہ مرزا عزت بخش	پانچ ہزار روپے
حضور کے اور دو نابالغ خورد صاحبزادوں کو فی	پندرہ سو تین ہزار روپے
حضور کے پچاس چھوٹے لڑکے لڑکیوں کو کل	دس ہزار روپے

شاہ نواز خان خزانچی حضور	دو ہزار پانسو روپے
سید رضا خاں قریب حضور و ایجنٹ گورنمنٹ کو	ایک ہزار روپے

میزان کل ـــ ایک لاکھ گیارہ ہزار پانسو روپے

اگر جاگیر حضور کے اخراجات پوری نہ کر سکے یا اُس میں کمی ہو جائے تو حضور کی ذاتِ خاص کی تنخواہ ایک لاکھ تک بڑھائی جا سکتی ہے۔

علاوہ رقومِ مذکورہ بالا دس ہزار روپیہ سالانہ حضور کو چند تیوہار کی غرض سے دیا جائے

وغیرہ وغیرہ . . . .

دستخط

دفرلی بارلو اڈنی

اموراتِ مذکورہ تقریباً سب کے سب منظور ہو گئے۔ حضور کی تنخواہ میں بیس ہزار کی توقیر ہو گئی یعنی ایک لاکھ قرار دی گئی۔ علاوہ اس کے دس ہزار روپیہ سالانہ مرمتِ قلعہ و مکانات کے لئے ملنے لگا۔

خلاصۂ مقصد۔ ان تاریخی اور اہم تحریرات کو موجودہ باشندگانِ ہندوستان نسلِ ہمایوں کی ایک سیاسی یادگار تصور کر سکتے ہیں۔ اور اُن کا اردو زبان کے ممتاز اور شہرۂ آفاق رسالہ ہمایوں میں شائع ہونا یقیناً کارآمد و مفید ہے۔

حسن نظامی

خیالات

ہر شخص اپنے جی میں اپنے تئیں دنیا کا سب سے بڑا عقلمند اور سب سے بڑا مظلوم سمجھتا ہے۔

احسان جو جتایا جائے وہ زائل ہو جاتا ہے۔ جو نہ جتایا جائے اُس کا بدلہ احسان سے بھی نہیں دیا جا سکتا۔

باغبان

آفتاب

آفتاب اے نوعروسِ صبح کے آئینہ دار | اے کہ قبضے میں ترے سررشتۂ لیل و نہار
اے کہ تیری ہر نظر اطرافِ عالم سے دوچار | اے کہ تیرے ساز پر ہستی کے نغموں کا مدار

ذرّے ذرّے کو تجلّی کا پتا دیتا ہے تُو
پتھروں کو چُوم کر ہیرا بنا دیتا ہے تُو

دور سے آتا ہے تُو ہم کو جگانے کے لئے | نامِ غفلت کا زمانے سے مٹانے کے لئے
گُدگُداتا ہے شگوفوں کو ہنسانے کے لئے | خاک سے شبنم کے قطروں کو اُٹھانے کے لئے

دیکھ کر پھولوں کی ناداری تڑپ جاتا ہے تُو
رنگ بن کر عارضِ گلشن میں کھپ جاتا ہے تُو

اے کہ تُو ہے جملہ موجوداتِ عالم کی مُراد | ہاتھ میں تیری شعاعوں کے ہے نبضِ ابروباد
دشمنانِ زندگی سے تو ہے مصروفِ جہاد | تیری کرنیں ہیں عناصر میں نظامِ اتّحاد

حُسنِ لیلائے جہاں پرور ترے محمل میں ہے
تیرے دم سے ولولہ نشوونما کے دل میں ہے

صدقے ہوتی ہے زمیں تیری ادائے ناز پر | بحر سر دھنتے ہیں تیرے شعلۂ آواز پر
ثابت و سیار مفتوں ہیں ترے انداز پر | رقص کرتا ہے نظامِ دہر تیرے ساز پر

سوزِ بیداریٔ عالم کا تری تانوں میں ہے
زمزمہ روئیدگی کا تیرے افسانوں میں ہے

ہاں، دیئے جا تال یونہیں، مُطربِ بزمِ حیات! | وجد میں دن ہے ترے نغموں سے، اور غش میں ہے رات
مایۂ صد فخر ہے فانی جہاں کو تیری ذات | سرخرو رہ تا قیامت اے غرورِ کائنات!

گرم تیرے جام سے ہستی کا مے خانہ رہے
رہتی دنیا تک ترا گردش میں پیمانہ رہے

چھیڑ کچھ باتیں ہمارے ناموراجداد کی ہیں تری چھانی ہوئی گلیاں جہان آباد کی
کچھ تو کیفیت بیاں کر ملت برباد کی تیری نظروں میں تو ہونگی رونقیں بغداد کی
کتنے سکّے تو نے دیکھے ہیں ہمارے نام کے؟
اے مورخ سطوت پارینۂ اسلام کے!

اپنے نقش پا میں تھی شان کلاہ قیصری خانہ زادوں میں تھی اپنے شوکت اسکندری
اپنی آنکھوں سے برستا تھا جلال حیدری ٹھوکروں کی زد پہ رہتے تھے بتان آذری
دنگ تھے ناقوس، گلبانگ اذاں کے سامنے
کوہ جھک جاتے تھے اپنے کارواں کے سامنے

یاد تو ہونگے تجھے وہ دن بھی اے گردوں حشم کلمہ گو جس دور میں تھے صاحب تاج و علم
کتنی سادہ زندگی رکھتے تھے خدّام حرم خشک روٹی جَو کی تھی خوراک ارباب کرم
چتر شاہی تھے سروں پر دلق زیب دوش تھے
آہ جب "فقر و امارت" دونوں ہم آغوش تھے

آفتاب! اے نیلگوں دریا کے تابندہ گہر اے کہ اُڑ جاتا ہے تجھ سے خواب نوشین کا اثر
سچ بتا، پھر بھی کبھی آئے گی کیا ایسی سحر؟ تاج زرّیں جگمگاتا ہوگا اپنے فرق پر
آنکھ کھل جائے گی غفلت سے جہان آباد کی؟
جاگ اُٹھے گی سلطنت غرناطہ و بغداد کی؟

مُسلم خوابیدہ اب بیدار بھی ہوگا کبھی کھا رہا ہے ٹھوکریں، ہشیار بھی ہوگا کبھی؟
بزدلی کے نام سے بیزار بھی ہوگا کبھی جان دینے کے لئے تیار بھی ہوگا کبھی؟
طور سے کیا پھر صدائے لن ترانی آئے گی؟
سچ بتا کیا پھر زلیخا پر جوانی آئے گی؟

مرحبا. اے آفتاب روح پرور مرحبا کیا دیا تو نے جواب امید میں ڈوبا ہوا
جس نے دل کے مُردہ ارمانوں کو زندہ کردیا تیرے قرباں، پھر تو دہرا دے، یہ تو نے کیا کہا؟

"چھٹ رہی ہیں ظلمتیں شب کی سحر ہونے کو ہے
آفتابِ تاجِ مسلم جلوہ گر ہونے کو ہے"

مژدہ اے مسلم! کہ تو ہر رنگ میں پایندہ ہے — بعدِ مردن، گوشۂ تربت میں بھی تو زندہ ہے
پھر تبسم سالبِ نقدیرِ پر رخشندہ ہے — ایک چنگاری ضمیرِ حق میں پھر تابندہ ہے
زندگانی کی سرِ تربت ہوا آنے کو ہے
چرخ سے پھر قم باذنی کی صدا آنے کو ہے

اے کہ تو سرمایۂ پیغامِ ربُ المشرقین — اپنی بربادی پہ کیوں کرتا ہے اتنا شور و شین
خشک ہو سکتی ہے کشتِ خواجۂ بدر و حنین؟ — جس کے ہر ذرے کے اندر جذب ہے خونِ حسینؑ!!
ہو، اگر دستِ عدو میں تیشۂ بیداد ہے
کربلا پر تیرے سقف و بام کی بنیاد ہے

تجھ کو کیا پروا، ہوائے دہر اگر ناساز ہے — حشر تک تائیدِ ربانی تری دمساز ہے
تیرے سینے میں زمین و آسماں کا راز ہے — بر ربطِ جبریل کی تو آخری آواز ہے
شورشِ الحاد سے دل تیرا ڈر سکتا نہیں
صورِ محشر بھی تجھے خاموش کر سکتا نہیں

سبزۂ خوابیدہ وہ انگڑائیاں لے کر اٹھا — صبح ہونے کو ہے، تہ کر غفلتیں، بستر اٹھا
مضطرب ہے بحر، کشتی ڈال دے لنگر اٹھا — تاجِ شاہی منتظر ہے اے مسلماں سر اٹھا
دیکھ رحمت کی گھٹائیں ماہیٔ بے آب ہیں
تیری کھیتی پر برسنے کے لئے بے تاب ہیں

شبیر حسن جوش

قیدی

لندن کے ایک باغ میں گرمیوں کی ایک سہانی صبح کا ذکر ہے۔ پرندے ابھی اپنے بہاریں نغمے گا رہے تھے۔ اور درخت ابھی پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ کہ یکایک ہمارے دوست نے کہا "کہیں مینا بول رہی ہے"۔

کستورے یہاں تھے۔ اور توتی، پھدکیاں بھی اکثر نظر آجاتی تھیں۔ رات کو اُلو بھی بولتا تھا۔ اور سال میں ایک دفعہ کوئل بھی کینٹ اور سرّے کے علاقوں سے بھُول بھٹک کر درختوں کے اِس سرسبز جزیرے میں آ نکلتی تھی۔ مگر مینا ہم نے یہاں کبھی نہ دیکھی تھی۔

ہمارے دوست نے کہا "وہ دیکھو! پھر اُس طرف سے آواز آئی!" وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور گھر کی طرف چل دیا جو پاس ہی واقع تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اپنی جگہ پر بیٹھ کر کہنے لگا "مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ لوگ بھی پنجروں میں جانور رکھنے کے شائق ہیں"۔ ہم نے کہا "یہ بلبل ہمارے باورچی نے پال رکھا ہے"۔

"ناہنجار" اُس کے منہ سے یہ لفظ بے ساختہ نکل گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں کوئی نہایت زبردست احساس بیدار ہوگیا ہے جس کو ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔

یکایک وہ یُوں برس پڑا:-

"میں کسی چیز کو محبوس دیکھ کر برداشت نہیں کرسکتا۔ خواہ وہ پرندے ہوں یا آدمی۔ مجھے اس خیال ہی سے نفرت ہے"۔ پھر ہماری طرف غضب آلود نگاہوں سے دیکھ کر، گویا ہم نے اُس سے یہ باتیں کہلوا کر کوئی فائدہ حاصل کرلیا ہے۔ اُس نے فوراً ہی اپنا سلسلۂ کلام شروع کردیا:-

"چند سال کا ذکر ہے کہ میں جرمنی کے ایک شہر میں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھیرا ہوا تھا جو اُن دنوں تمدنی معاملات کے متعلق کچھ تحقیقات کر رہے تھے۔ ایک دن وہ کسی قید خانے کے معائنہ کے لئے جا رہے تھے کہ اُنھوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے اِس سے پہلے کبھی کوئی قید خانہ نہیں دیکھا تھا۔ اِس لئے میں اُن کے ساتھ چلنے پر راضی ہوگیا۔ اُس دن بھی آج کی طرح مطلع بالکل صاف تھا۔ ہر چیز پر وہی سرد جگمگاہٹ رقص کر رہی تھی جو صرف جرمنی کے بعض علاقوں میں نظر آیا کرتی ہے۔ قید خانہ جو شہر کے عین وسط میں واقع تھا۔ اُن قید خانوں میں سے

تھا جو پینٹن وِل کے نقشے کے مطابق ستارے کی شکل کے بنائے گئے تھے۔ قید خانے کا دستور اور نظام وہی تھا جو سالہا سال گزرے یہاں رائج تھا۔ جرمن اُس وقت بھی اور اس میں شک نہیں کہ اب بھی قیدیوں کو کامل تنہائی کی جانکاہ تعزیر میں مبتلا کرنے کے بیہودہ خیال کو اپنے دل میں جگہ دیئے ہوئے ہیں۔ لیکن اُس زمانہ میں یہ اُن کے لئے ایک نیا کھلونا تھا اور وہ پورے مجنونانہ جوش کے ساتھ اِس پر عمل پیرا تھے۔ یہ اُن کی عادت ہے کہ جس کام کو وہ شروع کرتے ہیں اُس میں ایسا ہی انہماک دکھاتے ہیں۔ میں قید خانے کے متعلق کچھ بیان نہیں کرنا چاہتا۔ نہ یہ کہ ہم نے اُس میں کیا کیا دیکھا جن خوفناک طریقوں اور اصولوں پر ایک ایسا محکمہ چل سکتا ہے اُن سب پر یہاں عمل کیا جاتا تھا۔ بلکہ میں یہ کہنے کی جرات بھی کروں گا کہ انتظام اچھا تھا۔ اور قید خانے کے حاکم نے بھی ہر موقع پر اپنی ذات کے متعلق مجھ پر اچھا اثر ڈالا۔ میں نہیں صرف ایک بات بتانا چاہتا ہوں جسکو میں کبھی نہ بھولوں گا۔ اور جس نے مجھے ہمیشہ کے لئے جانداروں کو اسیر کرنے کا احساس کرا دیا خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان بڑے ہوں یا چھوٹے"

ہمارا دوست یہاں ٹھہر گیا۔ پھر ایک ایسی آواز کے ساتھ جس میں کچھ اور طیش ملا ہوا تھا۔ اور جیسے یہ طیش اُسے اپنی خاموش فطرت کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ اُس نے کہا:۔

"جب ہم نے اُس مقام کو جس کے در و دیوار خاکی رنگ کے تھے اچھی طرح دیکھ لیا۔ تو حاکم قید خانہ نے میرے دوست سے دریافت کیا "کیا آپ ایک دو عمر قیدی بھی دیکھنا چاہتے ہیں؟ میں آپ کو ایک ایسا شخص دکھاؤں گا جسے یہاں رہتے ہوئے ستائیس سال ہو گئے ہیں"۔ مجھے اُس کے الفاظ اب تک یاد ہیں اُس نے کہا "وہ تنہائی کی قید سے کچھ فرسودہ سا ہو گیا ہے"!

جب ہم اس قیدی کی کوٹھڑی کی طرف جا رہے تھے تو انہوں نے ہمیں اُس کی سرگزشت سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی وہ لڑکا ہی تھا کہ ایک فرنیچر بنانے والے نے مددگار کے طور پر اُسے اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ مگر اُس نے نقب زنوں کی ایک ٹولی کے ساتھ مل کر اپنے آقا کو لوٹنے کا ارادہ کیا۔ ڈاکے کے دوران میں اُس نے بدحواسی کے عالم میں ایک ہی ایسا وار کیا۔ کہ کارخانہ دار اُسی جگہ مر گیا۔ قاتل کے لئے موت کا حکم دیا گیا۔ مگر حکومت کی سفارش سے جو اُن دنوں جنگِ سادووا کے خونین نظاروں کو دیکھ دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ اُس کی سزا عمر قید میں تبدیل ہو گئی"۔

جب ہم اُس کی کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا اپنے کام کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گو اُس کی عمر چالیس سال سے کسی صورت میں بھی زیادہ نہ ہو گی لیکن وہ ساٹھ سال سے کم کا معلوم نہ ہوتا تھا۔ اُس کا جھکا ہوا قد اور کانپتا ہوا تباہ شدہ جسم ایک میلے رنگ کی چادر سے جو پوشاک کے بچاؤ کے لئے پہنی جاتی ہے ڈھنپا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ پھیلا پڑ گیا تھا اور اُس میں وہی انداز آ گیا تھا جو عموماً قیدیوں کی شکلوں میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ اُس کے نقوش بالکل بدنما ہو گئے تھے۔ اُس کے رخساروں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی نظر آنے لگی تھیں۔ اُن کا رنگ مجھے بھول گیا ہے ۔ ۔ ۔

مجھے اس میں شک ہے کہ ان میں کوئی رنگ تھا بھی۔ جب ہم ایک ایک کرکے آہنین دروازے سے اندر داخل ہوئے تو اُس نے تعظیم کے لئے اپنی ٹوپی سر سے اتاری جو ان تمام چیزوں کی طرح جو اُس نے پہن رکھی تھیں مٹیالے رنگ کی تھی۔ اُس کے سر میں بھی جس پر اب بہت تھوڑے سے بال نظر آرہے تھے خاک پڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہمارے سامنے سیدھا کھڑا ہوگیا اور مسکین نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ اسی طرح جیسے ایک اُلّو دن کی روشنی کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے کبھی تم نے کسی چھوٹے بچّے کو دیکھا ہے جو پہلی مرتبہ بیمار ہوا ہو۔ وہ اپنی حالت کو دیکھ دیکھ کر کتنا حیران اور پریشان ہوتا ہے بس یہی حالت اُس کی تھی۔ لیکن اُس کی صورت میں ایک غیر معمولی سکنت تھی۔ ہم نے بہت سے قیدیوں کو دیکھا تھا۔ مگر اُن سب میں یہی ایک تھا جس کی طبیعت میں ایک خوفناک حلم تھا۔ جب وہ اپنی کانپتی ہوئی آواز میں ہاں صاحب ۔۔۔۔ نہیں صاحب، کہتا تھا۔ تو اُس کی کمزوری اور نرمی سے عجیب یاس ٹپکتی تھی۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ اُس میں قوّتِ ارادی کی ایک رمق بھی باقی نہ رہی تھی۔"

ہمارا دوست یہاں رُکا۔ اور اپنے دل میں اس نظارے کا تصوّر لانے پر بھی اُس کی پیشانی پر ایک بل پڑ گیا۔ اُس نے کہا:-
"اُس کے ہاتھ میں سخت کاغذ کا ایک ورق تھا جس پر وہ بہرے اور گونگے اشخاص کے لئے ایک خاص طرزِ تحریر میں نئے عہدنامہ کی کچھ عبارت نقل کر رہا تھا۔ جب وہ ہمیں یہ بتانے کے لئے کہ گونگے اور بہرے اسے کس آسانی سے پڑھ سکتے ہیں اپنی انگلیاں کاغذ کے حروف پر پھیر رہا تھا تو ہم نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ ایک چکّی چلانے والے کی طرح گرد آلود ہو رہے تھے۔ کوٹھڑی میں گرد کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ گرد نہ تھی جو اُس کے ہاتھوں پر جمی ہوئی تھی۔ بلکہ انسانی پودے کا وہ فضلہ تھا جو تیج بنتے وقت نکل آتا ہے۔ جب وہ کاغذ اوپر کو اٹھاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی بھنگے کا پر کانپ رہا ہے۔ ہم نے اُس سے پوچھا کہ یہ قاعدہ جس کے مطابق تم لکھ رہے ہو۔ کس کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ اور ہم نے کسی کا نام بھی لیا۔ اُس نے کہا "نہیں، نہیں۔" وہ صحیح نام یاد کرنے کی کوشش کی شدت سے کھڑا کانپ رہا تھا۔ آخر اُس نے اپنا سر جھکا لیا اور دھیمی آواز سے کہنے لگا۔ "آہ! میں نہیں بتا سکتا"۔ پھر یکایک وہ نام اُس کی زبان پر آگیا۔ اُس وقت وہ پہلی مرتبہ اپنی ہیئت میں انسان نظر آیا۔ آزادی کی قدر و قیمت۔ دوسروں سے ہمارے تعلقات کے حقیقی معانی، آوازوں اور نظروں کے ذریعہ سے لمحہ بہ لمحہ ہمارے دلوں کے اختلاط کی غرض کسی بات کو یاد رکھنا اور پھر اُس کے استعمال کی ضرورت، ان سب کو اس سے پہلے میں کبھی نہ سمجھا تھا۔ اُس شخص کے لئے تم جانتے ہو، اپنی زندگی میں یادداشت کے استعمال کا کوئی موقع نہ تھا۔ وہ اُس پودے کی مانند تھا جسے ایک ایسے مقام پر لگایا گیا ہو۔ جہاں شبنم کا گزر تک نہ ہو سکے وہ کیفیت جو محض ایک نام کے یاد آجانے سے اُس کے چہرے پر نمایاں ہوگئی بالکل ایسی ہی تھی جیسے کسی سوکھے ہوئے درخت

پر صرف ایک سبز پتہ باقی رہ گیا ہو۔ سنو! انسان ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ کوئی مخلوق نہیں جو انسان کی طرح مصائب برداشت کر سکے۔"

ہمارا دوست اپنی جگہ سے اُٹھا اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

"اُس کی دنیا بڑی وسیع نہ تھی۔ ایک ہی کمرہ تھا جو زیادہ سے زیادہ پانچ گز لمبا اور چار گز چوڑا تھا۔ وہ اِس میں بائیس سال گزار چکا تھا۔ بالکل بے مونس و بے یار۔ اِن قید خانوں کا انتظام اتنا زبردست ہوتا ہے کہ کوئی پرندہ تک پاس نہیں پھٹک سکتا۔ ذرا سوچو کہ زندگی کی اِس جانکاہ منزل میں سے گزرنے کے لئے اور جسم و روح کا اتحاد برقرار رکھنے کے لئے آدمی کی کتنی قوت صرف ہوتی ہوگی"۔

وہ ہماری طرف مڑ کر کہنے لگا۔

"تم کیا خیال کرتے ہو کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اُس کے ہوش و حواس کو اِس حد تک بھی برقرار رکھا ہوا تھا؟ میں بتاتا ہوں:۔" ابھی ہم اُس کی اِس تحریر کو دیکھ ہی رہے تھے کہ اُس نے ہمارے ہاتھ میں لکڑی کا ایک تختہ دے دیا۔ جو ایک بڑی تصویر کے برابر تھا۔ یہ ایک نوجوان لڑکی کی تصویر تھی جو ایک باغ کے عین وسط میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اور جس کے ہاتھ میں رنگ برنگ کے پھول تھے۔ اُس کے پیچھے ایک چھوٹی سی ندی بل کھاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ کچھ گھاس تھی اور ندی کے کنارے پر ایک عجیب و غریب قسم کا پرندہ بیٹھا ہوا تھا۔ جو پہاڑی کوّے سے مشابہ معلوم ہوتا تھا۔ لڑکی کے ایک طرف ایک درخت تھا جو بھاری بھاری پھلوں سے لدا ہوا تھا۔ ان پھلوں میں ایک ایسا تناسب تھا جو کبھی کسی درخت میں نظر نہیں آیا۔ پھر اِس میں ایک ایسی بات بھی تھی جو تمام درختوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اِن پھلوں میں جان ہے۔ اور وہ انسان کے دوست ہیں۔ لڑکی اپنی گول گول آنکھوں سے سیدھا ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ پھول جو اُس کے ہاتھ میں ہیں وہ بھی ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ تمام تصویر . . . . میں کیا کہوں . . . . ایک معجزہ نظر آتی تھی۔ خام رنگوں کی نمائش سے یہ بالکل قدیم اطالوی مصوری کا نمونہ معلوم ہوتی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کی تکمیل کے لئے مشکلات پر غلبہ حاصل کرنے میں انتہائی جانفشانی سے کام لیا گیا ہے۔ ہم میں سے ایک نے اُس سے سوال کیا کہ کیا اُس نے تصویر بنانا زمانۂ قید سے پہلے سیکھا تھا۔ لیکن اُس غریب کو ہمارا سوال سمجھنے میں غلطی ہوئی اور وہ کہنے لگا نہیں نہیں منتظم صاحب جانتے ہیں کہ میرے پاس کوئی نمونہ نہ تھا۔ یہ میرا اپنا ہی تخیل ہے۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ مگر اُس کی مسکراہٹ شیطان کو بھی رلا دینے والی تھی۔ اُس نے اِس تصویر میں وہ تمام چیزیں رکھ دی تھیں جن کے لئے اُس کی روح بے قرار تھی . . . . . عورت، پھول، پرندے، درخت، نیلا آسمان، بہتا ہوا پانی، اور اپنے وہ

تمام حسیات و جذبات جو اُس کے دل میں اِن تمام چیزوں کی دوری سے پیدا ہوتے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اُس نے اِس تصویر کو اٹھارہ سال میں بنایا ہے۔ اِس عرصے میں وہ اِسے بار بار مٹاتا رہا اور بار بار بناتا رہا۔ اور موجودہ تصویر اُس کا سوواں نقش تھا۔ یہ ایک شاہ کار تھا۔ ہاں۔ وہ ستائیس سال سے وہاں رہتا تھا۔ اُس کو زندہ رکھنے کے لئے اِس جیتی جاگتی موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا تھا۔ جہاں اُس کے حواس معطل پڑے ہوئے تھے۔ دیکھنے۔ سننے سونگھنے اور کسی چیز کو محسوس کرنے کا خیال تک اُس کے حافظہ سے محو ہو چکا تھا۔ اُس کی بھوکی روح کا تصوّر صرف اُس لڑکی کی تصویر رہ گئی تھی جس کی آنکھیں متحیر تھیں اور جس کے ہاتھ میں پھول تھے۔ بیشک یہ تصویر انسانی ولولے اور شوق کی فتح الفتوح تھی۔ اور کمالِ فن کا عظیم ترین اظہار تھا جو تمام عمر میں میرے دیکھنے میں آیا“۔

ہمارے دوست کے چہرے پر مختصر سی مسکراہٹ آئی۔

”انسان کا دل اتنے پردوں میں محفوظ ہے کہ اُس شخص کی مصیبت کا پورا پورا احساس مجھے تب بھی نہ ہوا گو بعد میں میں نے اُسے محسوس کر لیا۔ جب حاکم قید خانہ نے اُس سے اُس کی صحت کی نسبت کچھ پوچھا اور وہ جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس وقت میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ آہ! میں اپنی موت کے دن تک بھی اُن آنکھوں کو نہ بھول سکوں گا۔ وہ حزنِ مجسم تھیں ..... سکوت و تنہائی کی وہ تمام ابدیتیں جو اُس نے گزار دی تھیں اور سکوت و تنہائی کی وہ تمام ابدیتیں جو ابھی قبر تک پہنچنے کے لئے اُسے گزارنی تھیں اُن آنکھوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ اگر اُن تمام آزاد انسانوں کی آنکھوں کی رحم انگیز المناکیاں جن کو میں نے عمر بھر میں دیکھا ہے یکجا جمع کر لی جائیں تو پھر بھی وہ اُن آنکھوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گی۔ میں اُن کی تاب نہ لا سکا، اور جلد ہی اُس کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔ اُس وقت دکھ اور تکلیف کے اُس تقدس کا احساس مجھ میں پیدا ہوا اور اب تک میں اُسے محسوس کرتا ہوں جو کہتے ہیں کہ روسیوں میں باوجود اُن کے وحشیانہ پن کے موجود ہے۔ اُس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم سب کو اُس کے سامنے جھک جانا چاہئے تھا۔ میں بے گناہ اور آزاد تھا۔ مگر اُس کے سامنے اپنا وجود مجھے مقید اور گنہگار معلوم ہوتا تھا۔ جو جرم بھی اُس سے سرزد ہوا تھا۔ مجھے اُس کی کوئی پروا نہیں۔ اُس برباد شدہ انسان کے خلاف ایسا گناہ کیا گیا تھا کہ مجھے اپنی ذات اُس کے پاؤں کی خاک معلوم ہو رہی تھی۔ جب میں اُس کی نسبت خیال کرتا ہوں تو اپنی نوع کے خلاف میرا جوش دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اُس وقت ساری دنیا کے محبوس جانداروں کا درد میرے ایک سینے میں آ کر اُٹھتا ہے“۔

ہمارے دوست نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور پورے ایک منٹ تک وہ خاموش رہا۔ آخر اُس نے کہا۔

"واپسی پر ہم سٹیٹ پارک میں سے گزرے۔ وہاں آزادی کی پوری شان نظر آتی تھی۔ روشنی کافی تھی۔ سیب۔ لیموں۔ انجیر۔ شاہ بلوط۔ صنوبر اور سفیدہ غرض ہر قسم کے درختوں کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ ہر ٹہنی اور ہر پتا خوشی سے چمک رہا تھا۔ پرندے جو آزادی کا نشان ہیں ادھر اُدھر اُڑتے پھرتے تھے۔ اور انہوں نے اپنی نغمہ ریزیوں سے سارے چمن کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ تمام خطہ ایک مسحور سرزمین معلوم ہوتا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے مجھے اُس وقت خیال آیا کہ صرف انسان اور مکڑی ہی دو ایسی مخلوقات ہیں جو دوسرے جانداروں کو اِس طرح عذاب دے دے کر ہلاک کرتے ہیں۔ اور دونوں میں سے پھر صرف انسان ایسا ہے جس کا دل اپنی نوع کو تباہ کرنے پر بھی نہیں پسیجتا۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ تاریخ فطرت کی ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے اور میں تم سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس شخص کی آنکھوں کو اور اُن آنکھوں کے دکھ اور درد کو ہمیشہ کے لئے ایک مرتبہ دیکھ لینے سے، جس طرح میں نے اُنہیں دیکھا اپنی نوع کے متعلق اِس قسم کا خیال تک ہمارے دل سے محو ہو جاتا ہے۔ اُس رات میں ایک قہوہ خانے کی کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا، مختلف قسم کے ساز بج رہے تھے۔ لوگ ہنس رہے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بازار میں سے ہر قسم کے آدمی ـــــ دوکاندار۔ سپاہی۔ تاجر۔ دفتروں میں کام کرنے والے۔ پادری۔ بھیک مانگنے والے۔ خوش رہنے والی عورتیں گزر رہے تھے۔ روشنی کھڑکیوں میں سے چھن چھن کر باہر نکلتی تھی۔ اور درختوں کے پتے گہرے نیلے آسمان کے نیچے جھوم رہے تھے۔ لیکن میں نہ کچھ سنتا تھا نہ دیکھتا تھا۔ میرے سامنے صرف وہ مسکین اور غریب چہرہ تھا۔ اُس کی پُر درد آنکھیں تھیں۔ اُس کے کانپتے ہوئے ہاتھ تھے۔ اور وہ تصویر تھی جو اُس نے اُس جہنم میں تیار کی تھی۔ اور اُس کے بعد جب کبھی میں نے کسی قیدی کو دیکھا ہے یا کسی قیدی کے متعلق کچھ سنا ہے۔ میرے سامنے یہی نقشہ آ گیا ہے۔"

ہمارا دوست خاموش ہو گیا ذرا سی دیر کے بعد وہ اُٹھا اور عذرخواہی کرتا ہوا چلا گیا۔

(کاروان) **منصور احمد**

دل مٹ جائے مگر سچی محبت کبھی نہیں مٹ سکتی۔

محبت وہی ہے جو خیر و ایثار کا رستہ دکھائے۔

حُسن محبت پرست ہے محبت حُسن پرست

لطیف

نامعلوم دنیاؤں کی روشنی

مَیں اپنے رگ و پے میں آنے والی زندگی کو محسوس کرتا ہوں میں اُس جنگل کی طرح ہوں جو ایک دفعہ کاٹ دیا گیا ہو جس کے نئے شگوفے زیادہ توانا و زندہ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں آسمانوں کی طرف چڑھ رہا ہوں۔ آفتاب کی جان بخش شعاعیں میرے سر پر پڑتی ہیں۔ زمین مجھے اپنا رس فراخ دلی سے دیتی ہے۔ لیکن آسمان مجھے نامعلوم دنیاؤں کی روشنی سے منور کرتا ہے۔

تم کہتے ہو کہ روح فقط جسمانی قوتوں کا نتیجہ ہے پھر کیوں میری روح بیش از بیش پر نور ہو رہی ہے جب کہ میری جسمانی طاقتیں زائل ہوتی جا رہی ہیں۔ جاڑا میرے سر پر آن پہنچا لیکن فنا نہ ہونے والی بہار میرے دل میں آ بسی۔ عالم شباب کی طرح اس پیاری گھڑی میں بھی گل و لالہ اور نسرین و نسترن کی شمیم سے اپنی فضائے زندگی کو معطر پاتا ہوں۔ جتنا میں اپنے انجام کی طرف قدم بڑھاتا ہوں اُتنا ہی میں اُن دنیاؤں کے سُریلے اور فنا نہ ہونے والے نغمے سنتا ہوں جو مجھے ہر گھڑی خیر مقدم کا پیغام دیتی ہیں۔ وہ موسیقی سادہ ہے لیکن جادو بھری، وہ اک پریوں کا افسانہ ہے، گذرے وقتوں کا اک قصّہ ہے۔ ایک نصف صدی سے میں اپنے خیالات کا اظہار نظم و نثر میں کرتا رہا ہوں۔ تاریخ، فلسفہ۔ ڈراما۔ عشق و محبت کے افسانے۔ ہجو۔ گیت۔ نوحہ سب کچھ آزما چکا۔ لیکن اس پر بھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرے دل میں جو خزانہ ہے اُس کا اک ہزارواں حصّہ بھی ابھی رونما نہیں ہو سکا!

جب میں قبر کی راہ لوں گا تو میں کئی اور لوگوں کی طرح کہہ سکوں گا کہ میں نے اپنا دن کا کام ختم کر لیا لیکن میں یہ نہ کہہ سکوں گا کہ میں نے اپنی زندگی کو ختم کر دیا۔ میرا دن کا کام دوسری صبح کو پھر شروع ہو گا۔ "قبر اک بند گلی" نہیں ہے وہ اک شاہراہ ہے۔ شام کے دھندلکے میں وہ بند ہو جاتی ہے۔ اور صبح ہوتے پھر کُھل جاتی ہے۔

(از وکٹر ہیوگو)

بشیر احمد بیگم

ننّھا ادیب

تیرے ننھے جی میں کیا آئی کہ اے ننّھے ادیب
کر رہا ہے صفحۂ قرطاس پر گلریزیاں

ہو رہی ہے نوکِ خنجر کی طرح ہر دل کے پار
واہ وا تیرے قلم کی نوک کی یہ تیزیاں

تیری اِن خاموشیوں میں مجھ کو آتی ہیں نظر
تیرے طوفانِ تخیّل کی قیامت خیزیاں

تیرے فکرِ سادہ میں موجود ہیں وہ سب کی سب
برگِ گل میں کی ہیں فطرت نے جو رنگ آمیزیاں

بات کیا ہے جو ترے دل میں سما سکتی نہیں
خامہ تیرا کر رہا ہے کیسی عنبر بیزیاں

جوش کیسا ہے ترے سینے میں آخر موجزن
جس سے پیدا ہیں تری جاں میں یہ شور انگیزیاں

شاہدِ معنی اُدھر اور شوخیاں تیری اِدھر
اُس کی کم آمیزیاں اور تیری بے پرہیزیاں

دیکھنا برہم نہ کر ڈالیں زمانے کو کہیں
تیری دل آرائیاں اور اُس کی دل آویزیاں

منصور احمد



ننھا ادیب

CALCUTTA
ART PG WORKS
LAHORE



محبوبة يرو شلم

غزل الغزلات

پرانے عہدنامے کی الہامی کتابوں میں ایک کتاب حضرت سلیمانؑ سے منسوب کی جاتی ہے اس کا نام غزل الغزلات ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس اسی کتاب کی آیات میں سے کیا گیا ہے۔ یہ عبارت شاعرانہ نازک خیالیوں کی رنگین ترین مثال ہے۔

دیکھ تو ہی خوبصورت ہے اے میرے محبوب! بلکہ دل پسند ہے۔ ہمارا چھتری دار پلنگ بھی سبز ہے۔ ہمارے گھر کے شہتیر سرو ہیں اور ہماری کڑیاں صنوبر۔

وہ میرے محبوب کی آواز! دیکھ وہ پہاڑوں پر سے کودتے اور ٹیلوں پر سے پھاندتے آتا ہے۔ میرا محبوب آہو یا جوان ہرن کی مانند ہے۔ دیکھ وہ ہماری دیوار کے پچھواڑے کھڑا ہے۔ وہ کھڑکیوں میں سے جھانکتا ہے جھنجھریوں سے اپنے آپ کو دکھاتا ہے،

اے میرے کبوترا جو چٹانوں کے دراڑوں میں اور کراڑوں کی آڑ میں چھپا ہوا ہے اپنا چہرہ مجھے دکھا اپنی آواز مجھے سنا کہ تیری آواز شیریں ہے اور تیرا چہرہ دلکش۔

اپنے پلنگ پر رات کو میں نے اُسے ڈھونڈا جسے میرا جی چاہتا ہے۔ میں نے اُسے ڈھونڈا پر وہ مجھے نہ ملا۔ اب میں اٹھوں گی اور شہر کے کوچوں اور گلیوں میں پھروں گی اور اُس کو ڈھونڈونگی جسے میرا جی چاہتا ہے۔ پاسبان جو شہر میں پھرتے ہیں مجھے ملے "کیا تم نے اُس کو دیکھا جس کو میرا جی چاہتا ہے؟ جب میں اُن سے تنگ کر بڑھ گئی تو وہ جس کو میرا دل چاہتا ہے مجھے ملا۔ میں نے اُسے پکڑ رکھا اور اُسے نہ چھوڑوں گی جب تک کہ میں اُسے اپنی ماں کے گھر میں نہ لے جاؤں۔

اے یروشلم کی بیٹیو! میں تمہیں ہرنیوں اور میدان کے غزالوں کی قسم دیتا ہوں کہ تم میری جانی کو مت جگاؤ اور اُسے مت اُٹھاؤ جب تک کہ وہ خود اُٹھنا نہ چاہے۔

میرے ساتھ لبنان سے، اے دلہن میرے ساتھ لبنان سے تو چلی آمانہ کی چوٹی پر سے، سنیر اور حرمون کی چوٹی پر سے شیروں کے رکانوں اور چیتوں کے پہاڑوں پر سے نظر دوڑا۔ اے میری خاتون اے میری بیوی تو نے میرا دل غارت کیا۔ تو نے اپنی آنکھوں میں سے ایک آنکھ سے، اپنے گلے کی ایک زنجیر سے میرے دل کو غارت کیا۔ . . . . تیرا عشق کیا خوب ہے، تیری محبت مے سے کتنی لذیذ ہے

میں سوتی ہوں پر میرا دل جاگتا ہے۔ میرے محبوب کی آواز ہے جو دروازے پر کھٹکھٹاتا ہے۔ میرے لئے کھول میری خاتون، میری جانی، میری کبوتر، میری پاک و پاکیزہ! کہ میرا سر اوس سے تر ہے اور میری زلفیں رات کی بوندوں سے بھری ہیں۔

میرا محبوب سرخ و سفید ہے۔ دس ہزار آدمیوں کے درمیان وہ جھنڈے کی مانند کھڑا ہوتا ہے۔ اُس کا سر ایسا ہے جیسے چوکھا سونا، اُس کی زلفیں پیچ در پیچ ہیں اور کوّے جیسی کالی ہیں۔ اُس کی آنکھیں اُن کبوتروں کی مانند ہیں جو لبِ دریا دودھ میں نہا کے تمکنت سے بیٹھے ہیں اُس کے رخسارے پھولوں کے چمن اور بلسان کی ابھری ہوئی کیاری کی مانند ہیں۔ اُس کے لب سوسن ہیں جن سے بہتا ہوا مُر ٹپکتا ہے۔ اُس کے ہاتھ ایسے ہیں جیسے سونے کی کڑیاں جن میں ترسیس کے جواہر جڑے گئے۔ اُس کے پیر ایسے ہیں جیسے سنگ مرمر کے ستون جو سونے کے پایوں پر کھڑے کئے جائیں۔ اُس کا منہ شیرینی ہے ہاں وہ سراپا عشق انگیز ہے۔ اے یروشلم کی بیٹیو! یہ میرا پیارا یہ میرا جانی ہے۔

یہ کون ہے کہ صبح کی مانند دکھائی دیتی ہے۔ جو چاند کی مانند حسینہ ہے اور سورج کی مانند جمیلہ۔

میں اپنے محبوب کی ہوں اور وہ مجھ پر مائل ہے۔ اے میرے محبوب چل ہم کھیتوں کے درمیان سیر کریں اور گاؤں میں رات کو کاٹیں۔ پھر تڑکے انگوری باغوں میں چلیں اور دیکھیں کہ تاک لہلہا رہی ہے اور اُس کے پھول نکلے ہیں اور انار کی کلیاں کھلیں ہیں۔ وہاں میں اپنی محبت تجھ پر جتاؤں گی۔

جھیل

ہے طلسمِ جزر و مد سے بے خبر سینہ ترا
صاف ہے روئے سحر کی طرح آئینہ ترا

بہ رہا ہے اِس طرح پانی خرامِ ناز سے
ہلکے ہلکے جس طرح پیدا ہوں نغمے ساز سے

ہے یہاں پر شورشِ ہستی کی ہر آواز چُپ
ہو سیاہی رات کی جیسی دمِ پرواز چُپ

اپنی جانب تیری خاموشی بلاتی ہے مجھے
تیرے دل سے صاف یہ آواز آتی ہے مجھے

چھوڑ دے سب کچھ اگر تجھ کو میسر ہے سکوں
شورشِ ہنگامۂ ہستی سے بہتر ہے سکوں

بے حقیقت ہے جہاں کا شور و شر کچھ بھی نہیں
دیکھنے میں گو یہ سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

چھوڑ دے دنیا کی شور انگیز بستی چھوڑ دے
خود غرض بے مایہ انسانوں کی بستی چھوڑ دے

اور بنا لے گھر اک ایسی وادیٔ خاموش میں
سو رہی ہوں ندیاں جس کی حسیں آغوش میں

دن کے ہنگاموں سے تھک کر ہو گئی ہے رات چُپ
ہو دلِ شاعر میں جیسے محشرِ جذبات چُپ

دیکھتی ہے چار جانب آنکھ گھبرائی ہوئی
ہے مناظر پر بظاہر تیرگی چھائی ہوئی

پھر بھی دھندلے سے نظر آتے ہیں ساحل پر پہاڑ
اس طرح کچھ جیسے پہنے ہوں سیہ چادر پہاڑ

ہاں مگر اس وقت چوٹی آنکھ سے مستور ہے
اُتنی ہی تاریک ہے جو چیز جتنی دور ہے

شام سے بیدار ہیں کچھ پھول ساحل کے قریب
نکہت آوارہ ہے اِن پھولوں کی محفل کے قریب

آ رہی ہے کان میں رہ رہ کے جھینگر کی صدا
گویا ہو جاتی ہے چُپ یہ کہہ کے جھینگر کی صدا

اے مسافر! رحمتِ حق کی نشانی ہے یہ جھیل
آدمی کو اک بہشتِ جاودانی ہے یہ جھیل

اے ستارو! اے بہارِ جاودانِ شاعری
ہے تمہارے دم سے تابندہ جہانِ شاعری

دیدہ ور تم کو کیا ہے چرخِ نیلی فام نے
ہیں جہاں بھر کے مناظر سب تمہارے سامنے

دل تمہارا معرفت کے نور سے آباد ہے
نسلِ انسانی کی کل تاریخ تم کو یاد ہے

آہ وہ شے جو فضا میں زندہ رکھتی ہے تمہیں
آسماں پر رات بھر تابندہ رکھتی ہے تمہیں

آدمی کا دل بھی اُس شے کا امانت دار ہے
وہ مئے سرجوش جس سے زندگی سرشار ہے

فرق اتنا ہے کہ حاصل ہے فلک پر گھر تمہیں
رات نے پہنا دیا ہے نور کا زیور تمہیں

اور زمیں پر رینگتے پھرتے ہیں ہم خاکی نژاد
ہیں ہمیشہ سے رہینِ رنج و غم خاکی نژاد

پھر رہے ہو تم مگر ہم قید ہیں مجبور ہیں
دیکھتے ہیں تم کو لیکن تم سے کوسوں دور ہیں

ہے زمیں خاموش بزمِ آسماں خاموش ہے
دم بخود ہے جھیل اور آبِ رواں خاموش ہے

کر رہی ہے غور ہر شے نظمِ موجودات پر
ایک نشّہ کی سی کیفیت ہے طاری رات پر

چپکے چپکے گیت خاموشی کے گاتی ہے فضا
دیکھ کر تاروں کی جانب مسکراتی ہے فضا

درسِ آگاہی یہاں ملتا ہے ہر تمثال سے
پتہ پتہ کہہ رہا ہے یہ زبانِ حال سے

مجھ کو دیکھو مظہرِ شانِ خدا ہے دل مرا
ماسوا میں بے نیازِ ماسوا ہے دل مرا

پڑ رہا ہے مجھ پہ پرتو اُس مقدس ذات کا
دیدۂ بینا ہے جس سے ذرّہ ذرّہ رات کا

پیش کر سکتی ہے یہ شے صرف تنہائی ہمیں
گھیرتے ہیں جب خیالاتِ من و مائی ہمیں

پھوٹتی ہیں نور کی کرنیں دلِ آگاہ سے
ہوتے ہیں اس وقت بندے ہم کلام اللہ سے

ہر بُنِ مو سے نکلتی ہے انا الحق کی صدا
روح کے سانچے میں ڈھلتی ہے انا الحق کی صدا

ایسی حالت میں نقابِ جسم اٹھا دیتے ہیں ہم
موت بھی آئے تو اُس کا منہ چڑا دیتے ہیں ہم

فاخر ہریانوی

نئے سال کا پیغام

(حکمتِ مغرب کا ایک ورق)

چند روز ہوئے ایک عزیز دوست نے شکایت کی تھی کہ جب زندگی کی تکلیفیں، دوستوں کی بے وفائیاں اور رشتہ داروں کی نامہربانیاں یاد آتی ہیں تو سوچتا ہوں کہ دنیا میں زندہ رہنے سے کیا حاصل؟ یہی نا کہ مستعار زندگی کے جتنے دن بھی باقی ہیں وہ انہیں کلفتوں میں کٹ جائیں۔ اگر یہ درست ہے تو پھر جان بوجھ کر آنے والے مصائب کی یاد میں اپنی روح کو تکلیف دینا کہاں کی دانشمندی ہے......"

نہ صرف میرے یہ دوست زندگی کے تاریک پہلو پر نظر رکھتے ہیں بلکہ دنیا کی آبادی کا ⅔ سے بھی زیادہ حصہ زندگی کے روشن پہلو پر نظر ڈالنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ گذشتہ واقعات کی یاد ہی سب سے بڑا زہر ہے جو ہماری جسمانی و روحانی مسرت کی شیرینیوں کو بالکل تباہ کر دیتا ہے۔ اسی لئے آؤ نئے سال سے تمام گذشتہ نقصانات اور رنج و غم کو دل سے بھلا دیں۔

نیا سال برکت و سعادت کا پیغام اپنے ساتھ لایا ہے۔ اپنی بگڑی زندگی کو نئی امنگوں سے استوار کریں۔ کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ہم گزرے ہوئے واقعات، کھوئی ہوئی دولت، اقربا کی مفارقت یا محبت کی تلخکامیوں کے ہتھوڑوں سے زندگی کے خوبصورت قصر کو قبل از وقت مسمار کر دیں۔

عزیز دوست مجھ سے مت کہو کہ دنیا میں کسی قسم کی کامیابی یا مسرت حاصل کرنے کا وقت گذر گیا۔ مجھے مت سناؤ کہ تم بیمار ہو یا تمہاری روح افکارِ دنیا سے زخمی و گھائل ہو چکی ہے۔ روح عطیۂ ایزدی ہے، دنیا کی کوئی طاقت اُسے کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا سکتی۔ یہ تمہارے ادنیٰ خیالات ہیں جو تمہیں بیمار و مضمحل بنائے رکھتے ہیں۔ اپنی روح کو، اپنے دل کو مجبور کرو کہ وہ تمہارے لئے صحت و امید اور مسرت و شادمانی حاصل کرے۔ ہر وقت صحت اور خوشی کے بلند و پاکیزہ خیالات و جذبات کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دینے سے نئے سال کے چند مہینوں میں دنیا کے کامیاب اور خوش مزاج آدمیوں میں تمہارا شمار ہو سکتا ہے۔

کھوئے ہوئے روپے کا خیال دل سے بھلا دو۔ اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو فراموش کر دو، حوادثِ دنیا کے زخم اور گذشتہ

ناکامیوں کو بالکل نظر انداز کردو۔ عزیز و اقربا کی اموات کا غم مٹائے نہیں مٹتا ——— یہ بالکل درست ہے لیکن پیارے دوست یہ رنج و غم خدا کی طرف سے اِس لئے ہمارے پاس آتے ہیں کہ ہم بنی نوع انسان کے ساتھ زیادہ تلطف اور زیادہ مہربانی سے پیش آنا سیکھ جائیں۔ ایسا نہ کرنے کی بجائے اگر اُن سے مشتعل اور ناراض ہوں تو سمجھ لینا چاہئے کہ ہم میں اور ادنیٰ جانوروں میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہ ناانصافی اور کمزوری ہوگی اگر ہم یہ کہہ دیں کہ خدا نے ہمیں اِس نقصانِ عظیم کی سختیاں برداشت کرنے کے لئے منتخب کرلیا ہے۔

ایک بالغ نظر معلّم[1] کے متعلق مشہور ہے کہ اُس نے اپنے شاگردوں کے سامنے کسی بہترین خیال کے اظہار کے لئے ڈیڑھ ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا۔ جس خیال پر انعام عطا کیا گیا وہ یہ تھا:" انسان اِس بات پر ناراض ہے کہ خدا نے گلاب کے ساتھ کانٹے پیدا کئے ہیں، برعکس اس کے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ خدا کا شکر یہ ادا کیا جائے کہ اُس نے کانٹوں کے ساتھ گلاب پیدا کیا ہے" ——— زندگی کی نصف تلخیاں اُس وقت کافور ہوجاتی ہیں جب ہم دنیا کو اس کے کانٹوں سمیت خوشی و مسرت کا گہوارہ سمجھنے لگیں۔

ایک اُداس و غمگین چہرہ، مرجھائی ہوئی صورت، ایک کڑھنے والا دل اور چڑچڑا مزاج اس بات کی دلیل ہے کہ تم اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ یہ چیزیں تمہاری کمزوریوں کا بدیہی ثبوت ہیں۔ اور اِس بات کی مظہر کہ تمہیں اپنے گرد و پیش کے حالات پر قابو پانے کا سلیقہ ہی نہیں۔ اِس لئے آج ہی عہد کرو کہ تم اِن تمام برائیوں سے نجات حاصل کرنے کی سعی کروگے ——— خود حکومت کرنا سیکھو، اپنے دشمنوں کو دل کے تخت پر بٹھا کر اُن کے غلام مت بنو، اقلیمِ دل کی زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لو۔

میں یہ بھی سننا نہیں چاہتا کہ تم بوڑھے ہوچکے ہو ——— عمر کے سالوں کی تعداد ایک ڈراونے بھوت کی طرح ہے، اس تعداد کو نظر انداز کردو بڑھاپا کسی اور کے در پر دھرنا دے کر بیٹھ جائے گا۔

اپنے کھانے میں اعتدال پیدا کرو، تازہ پانی سے روزانہ غسل کرو۔ خوب ورزش کرو۔ لیکن بلاناغہ۔ کوشش کرو کہ سر سے پاؤں تک، تمہاری رگ رگ میں، زندگی کے آثار پائے جائیں۔ صبح و شام صرف پانچ پانچ منٹ تک اپنے پھیپھڑوں کو خوب پھیلاؤ اور سانس لیتے وقت صدقِ دل سے یقین کرو کہ تم صحت، فرزانگی اور کامیابی کے سانس لے رہے ہو۔

ہر وقت یہ امید رکھو کہ صحت تمہیں ضرور میسر ہوگی۔ ایسی چیزیں یکدم حاصل نہیں ہوسکتیں۔ تمہارے تصور

---

[1] میری مراد ڈوائیٹ ایل موڈی سے ہے۔

میں صرف یہی بات رہنی چاہئے کہ یہ بالکل عارضی توقف ہے۔ اور اُسے کامل طور پر حاصل کرنے کے لئے ہر وقت متوقع رہو۔ جسمانی ایذاؤں کو یہ کہہ کر بھلادو کہ ایک دفعہ جاکر پھر واپس نہیں آسکتیں اور کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اِس خیال کو دماغ میں جاگزین نہ ہونے دو کہ تم مستقل طور پر بیمار رہو۔ کسی سے مت کہو کہ تم دائم المرض ہو۔

فرانس کے نوجوان علم کیمیا کے مطالعہ میں مصروف ہیں اس امید پر کہ شاید کسی دن سونا بنانے کا راز اُنہیں معلوم ہو جائے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ تم اپنے دل اپنی روح اور اُس کی لامحدود قوتوں کا مطالعہ کرو۔ تمہاری کامیابی کے نتائج دنیا کے بڑے سے بڑے کیمیادان کی امیدوں سے عظیم تر ثابت ہونگے اور تم ایک ایسا قابلِ رشک طلسم سیکھ جاؤ گے کہ دنیاوی راحت و آرام اور دولت و تنعم کے غیر مختتم ذخیرے تمہارے قدموں کے نیچے ہونگے۔

اپنے بدن کو جواہر رکھنے والی چاندی کی ڈبیہ، دل کو مخمل کا استر اور اپنی روح کو ایک بیش بہا جواہر خیال کرو۔ اِس ڈبیہ کو ہر وقت چمکیلا اور گرد و غبار سے محفوظ رکھو لیکن اس بات کو کبھی فراموش نہ کرو کہ اِس ڈبیہ کے سب سے گرانقدر جواہر کو معصیت و گناہ کے زنگ سے بچانا تمہاری زندگی کا سب سے پہلا فرض ہے۔

آج پہلی تاریخ ہی سے اِس بات کو ذہن نشین کرلو کہ تم عدیم المثال کامیابی کے قصر فلک بوس کے سنہری دروازے میں کھڑے ہو، ایک مکمل اور شاندار سال تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔ ایک سال کے عرصہ میں تمہیں اپنی صحت کو دوبارہ حاصل کرنے کے علاوہ دولت، اطمینانِ قلب اور سرمدی مسرتوں کو بھی اپنے قبضہ میں لانا ہے۔

دوستو! بڑھو، اور اِن چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے اپنی تمام قوت صرف کردو۔ خدائے واحد نے اُنہیں تمہارے لئے پیدا کیا ہے اپنا حصہ ضرور حاصل کرو۔

محمد ضیاء الدین شمسی

وجدانیات

اُن کو درپیش ہے تقریبِ سفر کیا ہوگا — بیٹھ بھی جاؤں اگر خاک بسر کیا ہوگا

موت ہے موت مجھے دردِ جدائی کا خیال — میرے اللہ جدائی کا اثر کیا ہوگا

میرا گھر کاہے کو ہے ایک سیہ خانہ ہے — شمع گر رہ نہیں گھر میں تو گھر کیا ہوگا

دلِ وحشت زدۂ ہجر پہ کیا گزرے گی — وہ تسلّی مجھے دیتے ہیں مگر کیا ہوگا

اُن کے جانے سے پریشان نظر رہتی ہے
کوئی بتلائے مجھے اہلِ نظر کیا ہوگا

عابد علی عابد

کلامِ گرامیؔ

(غیر مطبوعہ)

عشوہ در پردہ ستمہاست کہ با ما مے کرد — صبر فرمود حیا، شوق تقاضا مے کرد

غمزہ را رخصتِ خونریز دہد تا چہ کند — جور نا کردنش آں بُود کہ گویا مے کرد

تار تار است گریبانِ شکیبم امشب — کیست گستاخ کہ آں بندِ قبا وا مے کرد

ہانگوئیم کہ فردا بتر ست از امروز — وائے امروز کہ سر در سرِ فردا مے کرد

کارِ امروز بفردا مگذار اے غافل — وائے آں ابلہ کہ سر در سرِ فردا مے کرد

نعرہ ہا بر زدم آں آفتِ جاں برنگرفت — گریہ سر کردم و دُزدیدہ تماشا مے کرد

من بخود گم شدہ ام گم شدہ را مے جویم — حیف منصور چہ گم کرد کہ پیدا مے کرد

کرد در نقطۂ دل خامۂ اُستادِ ازل — نقشِ صنعت کہ بایں گنبدِ مینا مے کرد

ساقی آں بادہ کہ از خُمکدۂ وحدت ریخت — نشۂ بیخودیِ عشق دو بالا مے کرد

کارِ ما بود گرہ در گرہ از گردشِ چرخ — چشمِ ساقیست کہ از کار گرہ وا مے کرد

ذرہ ام رقص کناں خیمہ بخورشید زند — قطرہ ام شور باندازۂ دریا مے کرد

زیرِ لب خندۂ خوش داشت گرامیؔ در نزع

جاں بجاناں دہد و قطرہ بدریا مے کرد

گرامیؔ مرحوم

موت

موت منڈلا رہی تھی ۔ ہاں گاؤں کے ارد گرد چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی ۔

چپکے چپکے رات کی تاریکی میں وہ یہاں آئی تھی ۔ غم کے اونچے اونچے سیاہ پہاڑوں کو پھلانگتی ہوئی ۔ خون کی سرخ ندیوں کو چیرتی ہوئی اور جلتے ہوئے آنسوؤں کے دریاؤں کو عبور کرتی ہوئی وہ چلی آئی تھی ۔ اُس کی راہ میں آہوں کے جھکڑ چلتے تھے ۔ الم انگیز نالوں کے بادل گرجتے تھے اور خون کے آنسوؤں کی بارش ہوتی تھی لیکن وہ چلی آئی ۔ اپنی پُرسکون رفتار سے زیرِ لب مسکراتی ہوئی وہ چلی آئی ۔ اُس کی تفرقہ پرداز طبیعت کو روح اور جسم میں تفرقہ ڈلوانے سے بڑا لطف آتا تھا ۔

اُس نے کئی بڑے بڑے دروازوں کو کھٹکھٹایا لیکن ہر بار زہریلے نشتروں سے اُس کے پاؤں زخمی ہوئے ۔ ایک ہرے بھرے سایہ دار درخت کے نیچے کھڑی ہو کر وہ ہنسی ۔ "کیسے بیوقوف لوگ ہیں" ۔ لوگ کہتے تھے کہ اس درخت پر بجلی گر گئی ۔ لیکن یہ تو موت کی ہنسی تھی ۔ اُف اُس کا تبسم بھی کس قدر خوفناک تھا ۔

ایک بے در کا جھونپڑا ۔ آہ ایک بے در کا جھونپڑا! اُس نے اپنا سر آگے کی طرف جھکایا اور پھر مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو گئی ۔ کوئی بادشاہ ہو یا فقیر سب کا اُس کے دل میں بس ایک ہی درجہ تھا ۔

غریب آدمی مسافرت پر جانے کے لئے اپنے بچوں سے رخصت ہو رہا تھا ۔ موت نے کہا "آہا غربت ، یہ مجھے اور بھی مرغوب ہے" کیا ہوا میں اُس کے پیچھے جاؤں گی ۔

دبے پاؤں وہ اُس کے پیچھے ہو لی ۔ جس جس راستے سے وہ گزرا وہ بھی گزرتی گئی ۔ اُس کی رفتار ریل گاڑیوں سے بہت تیز تھی ۔

لڑکی نے گھر کو صاف کر کے کونا کونا مٹی سے لیپ دیا ۔ بار بار اُس کے کانوں میں اپنے باپ کی آواز گونجتی تھی "میری سلیقہ مند بیٹی" ۔ وہ ہنستی ہوئی چکی چلاتی تھی کہ میرا باپ اب جلد واپس آنے والا ہے ۔ وہ گیت گاتی تھی ۔ افلاس کے دنو اب رخصت ہو جاؤ کیونکہ میرا باپ اب آنے والا ہے ۔ کیا ہوا گائے کم دودھ دینے لگی ہے ۔ اب اُسے پیٹ بھر کے چارا ملے گا کیونکہ میرا باپ اب آنے والا ہے ۔ میرے ننھے بھائیوں کے کپڑے پھٹ گئے ہیں ۔ اور وہ سردی میں ٹھٹھرتے ہیں ۔ لیکن میں کیوں غم کروں کہ میرا باپ اب آنے والا ہے ۔ اُس نے کہا مدت گزر گئی ہمیں کسی نے محبت کی نظروں سے نہیں دیکھا میرے بھائی لوگوں کی گھرکیاں سنتے ہیں ۔ لیکن میں غم کیوں کروں کہ میرا باپ اب جلد آنے والا ہے ۔

ہر روز لڑکی، دل میں نئی نئی امنگوں کو لیے ہوئے اُٹھتی لیکن انتظار کے دن مایوسی میں تبدیل ہوتے گئے۔ اُس نے دعا مانگی اور کہا۔ اگر میرا باپ خیریت سے آجائے تو میں خانقاہ میں دیا جلاؤں گی۔

وطن کی محبت نے کمزوری اور ناتوانی کو بھلا دیا۔ وہ آگیا اپنے گھر میں وہ آگیا مگر روح اب جسم سے رخصت ہورہی تھی۔ لڑکی نے باپ کی صورت دیکھتے ہی سر پیٹ لیا۔ "میرے خدا میں کیا سوچ رہی تھی اور یہ کیا ہوگیا"۔

اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اُس کی زبان اور اُس کے ہونٹوں سے خون پھوٹ رہا تھا اور اُس کی گردن پیچھے کو ڈھلک گئی تھی۔ بیٹی اُس کے سینے سے لپٹی ہوئی پوچھ رہی تھی میرے باپ کس نے تمہارا یہ حال بنا دیا۔ وہ کچھ نہ بولا۔ لیکن اُس کی نیم مردہ آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔

باپ کا اشارہ سمجھ کر لڑکی نے بچوں کو اُس کے پاس بلانا چاہا۔ "میرے ننھے بےکس بھائیو آؤ آخری بار اپنے باپ سے مل لو۔ بچے چیخیں مارنے لگے اُنھیں موت کے گھونگروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ موت اُن کے باپ کے اردگرد رقص کر رہی تھی اور وہ اُس کے پاؤں کے گھونگروؤں کی دھیمی دھیمی آواز سُن رہے تھے۔ وہ زیر لب مسکرائی، ننھے بچوں کا دل توڑنے میں اُسے خاص راحت ہوتی تھی۔ وہ رقص کرتی رہی۔ ہاں اُس کی تفرقہ پرداز طبیعت کو روح اور جسم میں تفرقہ ڈلوانے سے بڑا لطف آتا تھا۔ آج کی رات آخری تھی اور وہ مطمئن تھی۔

لڑکی رو رہی تھی اُس کے رونے میں قیامت کا درد تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آنسوؤں کے اِس سیلاب میں اُسکا دل اور جگر بھی پگھل کر بہ جائے گا۔ اُس نے کہا، "میرے باپ تم اِن چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر کہاں جاتے ہو۔ کیا اب ہمیشہ کے لئے تم اُنھیں لوگوں کے طعن و ملامت کے لئے چھوڑ جاؤ گے۔ میرے بھائی بہت نازوں سے پالے گئے تھے کون اب اِن کے ناز اُٹھائے گا۔ میرے باپ میرا سب مان تیرے ہی ساتھ تھا۔ اب میں ہمسایوں کے طعنے سنوں گی اور ہر ایک کی ملامت سہوں گی۔ کوئی محبت سے میرا نام لے کر اب مجھے نہ پکارے گا۔ اور کسی کی آواز سُن کر میں خوش ہوکر ہنستی ہوئی اپنے گھر کی چوکھٹ سے باہر نہ جھانکوں گی۔ میرے باپ ہم کتنے بےکس ہو جائیں گے"۔

وہ کچھ نہ بول سکتا تھا۔ لڑکی نے کہا میرے باپ مجھے صرف ایک دفعہ بتا دے کہ تجھے کس نے ایسا بےبس کر دیا وہ خاموش رہا۔ اب روح جسم سے آخری بار گلے مل رہی تھی۔ موت رقص کرتی رہی وہ خوش تھی کہ اب روح جسم کو الوداع کہہ رہی ہے۔ روح پرواز کر گئی مرنے والے کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو آخری قطرے ڈھلک کر مٹی میں مل گئے۔

موت آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ اُس کی بیٹی زمین پر گری پڑی تھی اور اُس کے معصوم بچے سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ وہ اُن کے قریب سے مسکراتی ہوئی گزر گئی۔ چپکے چپکے وہ چلی گئی ―― کسی اور جسم اور کسی اور روح میں تفرقہ ڈالوانے کے لئے وہ چلی گئی۔

ز۔ ب

جامِ صہبائی

(۱)

نیرنگِ طلسمِ زندگی کو پایا
آلودۂ غم ہر اک خوشی کو پایا
تسکین ہے اگر تو وہ فرزانوں میں اثرؔ
سرچشمۂ بےخودی اسی کو پایا

(۲)

رو رو کے عبث شکوۂ بیداد نہ کر
اے تنگ جہاں رنج کو برباد نہ کر
ہمت سے ہے رزمگہِ ہستی میں وفا
کھا زخم پہ زخم اور فریاد نہ کر

(۳)

دشوار نہیں ہے اب مشکل میری
مشکل سے مراد ہو گئی حاصل میری
دشواریِ راہِ طلب سے ہمت ہے اثرؔ
خوش ہوں کہ بہت کٹھن ہے منزل میری

(۴)

بیگانۂ عقل و ہوش ہوتا جاتا ہوں
طوفان میں بے خرد و بے ہوش ہوتا جاتا ہوں
تقدیر کو کوستا ہوں ہنگامے میں
جب سوچتا ہوں تو خموش ہوتا جاتا ہوں

اثرؔ صہبائی

شاعر کی دُعا

اے خدا! اے زمینوں اور آسمانوں کے بادشاہ! کائنات کے ذرے ذرے میں تیرے حسنِ ابدی کا پرتو نظر آرہا ہے اور تیری شانِ جمالی ایک نغمۂ خاموش کی صورت میں تمام موجودات پر چھا گئی ہے۔ پہاڑ، دریا، سمندر، درخت، سورج، چاند ستارے سب تیری پرستش میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی رحمت سے میرے بے قرار دل کو اسی نغمۂ خاموش کی چادر سے ڈھانپ دے تاکہ میں تیری تسبیح پڑھوں، تیری قدوسیت کے گیت گاؤں، اور میرے اشعار تیری حمد کے ترانے بن کر بہنے لگیں۔

اے ذوالجلال میں رازِ آفرینش پر غور کرتا ہوں اور حقیقت کی گہرائیوں میں اُس کی تلاش میں مصروف ہوتا ہوں تو تیری عظمت میرے دل پر چھا جاتی ہے اور میں مجسّم حیرت بن جاتا ہوں، اپنے کرم سے حقیقت کو بے نقاب کر کے اُس راز کو مجھ پر آشکار کر دے تاکہ میرے زمینی نغموں میں آسمانی عظمت اور وقار پیدا ہو جائے اور اس تیرہ خاکدان کے رہنے والوں کو روحانی زندگی کے سرچشمے سے نزدیک کر سکوں۔

اے خالقِ کائنات! میرے دل کی کھیتی میں تو نے **عشق** کا بیج بویا ہے اور آبِ حسن سے اُس کی آبیاری کی ہے اب اُسے آزادی کی ہوائیں جلد نشوونما دیں تاکہ وہ ایک بلند درخت بنے اور فرشتۂ شعر اُس کی شاخوں میں بیٹھ کر آسمانی زندگی کے نغمے بلند کرے اور بھولے بھٹکے انسانوں کو سیدھے راستے پر چلنے کے لئے آمادہ کر دے۔

اے معبودِ حقیقی! ہر حال میں **صداقت** میرا اشعار بنائیو اور **حقیقت** میرے کلام کا جوہر۔ شخصی زندگی کا بیان ہو یا اجتماعی زندگی کی داستان، مناظرِ قدرت کی تعریف ہو یا مظاہرِ کائنات کی توصیف، حقیقت اور صداقت کے سررشتہ کو میرے ہاتھ سے نہ جانے دیجیو۔ میری عزتِ نفس اور پاکیزگیٔ قلب کو قائم رکھیو تاکہ میرا قلم جادۂ حقیقت سے انحراف نہ کر سکے۔ حقیقت کو میری آنکھوں میں جلوہ گر کیجیو تاکہ مجھے پست سے سروکار رہے اور نیست سے دھوکا نہ کھا سکوں۔ میرا کلام ایک آئینہ ہو جس میں صداقت کی رعنائی منعکس ہو، میرا سخن ایک ساز ہو جس سے حقیقت کے نغمے بلند ہو ہو کر فضا کو معمور کر رہے ہوں۔

الٰہی! **محبت** تمام فضائلِ انسانی کا منبع ہے مجھے اس کے بیان کرنے کی توفیق عنایت کیجیو، تاکہ میرے اشعار

دنیا جہاں کے لئے پیغامِ رحمت ہوں ۔ اور انسانی آبادیوں میں بسنے والوں کو حیاتِ حقیقی سے آشنا کر سکیں ۔

سبز درختوں اور خوشنما پھولوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں میں آبشاریں اور جوئباریں کس آزادی سے اپنے موسیقی سے لبریز نغمے بلند کر رہی ہیں! میرا دل بھی سبز و شاداب پہاڑوں کی مانند ہے جس سے چشمے پھوٹ پھوٹ کر آنکھوں کے رستے بہ رہے ہیں - یہ میرے اشعار ہیں ۔ اے قادرِ مطلق! انہیں آبشاروں اور جوئباروں کی آزادی و موسیقی سے لبریز کر دیجیو ۔

اے رحمن و رحیم! تاریک راتوں میں چاند کی روشن مشعل کو آسمان پر نمودار کر کے تو ساکنانِ خاک کے لئے نور کی چادر بچھا دیتا ہے ۔ میرے کلام کو مشعلِ مہتاب کی مانند نورانی بنا دیجیو، تاکہ جب آدم کے بیٹے مصائب و تکالیف کی تاریکی سے دوچار ہوں تو اُس کے مطالعہ سے اُن کا اضطراب اور بے قراری آرام اور سکون سے بدل جائیں ۔

جب تاریک رات گھنگھور گھٹا کی طرح عالم پر چھا جاتی ہے اور آہستہ آہستہ کائنات کو اپنی سیاہ چادر میں لپیٹ لیتی ہے، تو آفتابِ جہاں تاب کی شمشیر ظلمت کے پردوں کو چاک چاک کر کے مشرق سے ظاہر ہوتی ہے اور اِس خطۂ خاک میں نور کی نہریں بہا دیتی ہے ۔ اے دونوں جہانوں کے بادشاہ! میرے آتشیں نغموں کو سورج کی تلوار بنائیو ۔ تاکہ جب ظلم کی تاریکی انسانی بستیوں کا احاطہ کرلے تو یہ تلوار اس کے کثیف پردوں کو چاک کر کے عدل کے جمالِ جہاں آرا سے فضا کو نورانی بنا دے ۔

اے کون و مکان کے خالق! تو دیکھتا ہے کہ مغرب کی تہذیب نے کس طرح عالم کو مسخر کر رکھا ہے! مادی تمدن کے تجملات نے انسان کو اپنی حقیقت سے بے بہرہ کر دیا ہے، اشرف المخلوقات اقتصادی نشار کے باعث ایک مشین بن کر رہ گیا ہے ۔ اقوامِ عالم بوقلموں کی طرح رنگ بدل رہی ہیں ۔ ایک غلامی کا طوق گلے سے اتارتی ہیں ۔ دوسری کا پہن لیتی ہیں، مشرق کی روحانیت جو اب تک تیری مخلوقات کی زندگی کا سرمایہ رہی ہے حرفِ غلط کی طرح مٹی جا رہی ہے! ممکن ہے کچھ عرصے کے بعد حقیقتِ انسانی ان روز افزوں تکلفات کے پردوں میں ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جائے ۔ اور فرزندِ آدم محض بناوٹ اور تصنع کا ایک پُتلا بن کر رہ جائے ۔ اے خدا! میرے سرود میں وہ آگ بھر دے جس کے شعلے کوہِ آتش فشاں کی مانند فضا میں بلند ہو کر مشرق کے لئے زندگی کا آتشیں پیغام ثابت ہوں اور اِس آدمیت سوز تہذیب کو جلا کر خاکستر کر دیں ۔

میری ملت اور میرا ملک مملکتِ حیات کی صدود سے باہر نکل چکے ہیں، انواع و اقسام کی غلامی نے انہیں پابزنجیر کر رکھا ہے، باہمی معرکہ آرائیوں میں وہ اپنے قویٰ کو مضمحل کر رہے ہیں۔ وہ کھاتے ہیں۔ سوتے ہیں اور چل پھر سکتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ زندہ ہیں۔ لیکن حقیقت میں زندگی اُن سے کوسوں دور ہے! اے نیست سے ہست کرنے والے خدا! میرے اشعار میں وہ حرارت پیدا کر دے جو ان کے دلوں کو گرما سکے، ان کی مردہ رگوں میں خونِ حیات کا دورہ پیدا کر سکے، اور اُن کو عزت و آبرو کی آزاد زندگی بسر کرنا سکھا سکے۔

اے زمین و آسمان کے مالک! مختلف لوگ تیری بارگاہ میں مختلف آرزوئیں لیکر آتے ہیں، کوئی تخت و تاج کا خواستگار ہے، کوئی جاہ و منصب کا طلب گار، کسی کو اولاد کی ہوس ہے کسی کو زر و مال کی خواہش۔ میری آرزو ہے کہ مجھے اسرارِ حیات سے آگاہی بخشیو اور اُن کی نغمہ سرائی کی طاقت عطا کیجیو۔ تاکہ میرے اشعار بقائے دوام کی دولت سے مالا مال ہوں اور صحرائے ایام میں ایک ایسے سربفلک مینار کی طرح قائم رہیں جو انقلاباتِ زمانہ کے بادو باراں سے ہمیشہ مامون رہے۔ اور مسافرانِ حیات کے لئے چراغِ ہدایت کا کام دے۔

محمد اکبر منیر

غزل

وہ خود بیتاب ہونگے غفلتِ صبر آزما کب تک
نہ پوچھا جائے گا ہم سے ہمارا مدعا کب تک

تجھے محرومیوں نے بھی نہ دی تعلیمِ خودداری
ہوس تاثیر کی لے بیری آہِ نارسا کب تک

بس اب اُٹھ ہمتِ مردانہ میری دستگیری کر
ہوائے التجا کب تک تقاضائے دعا کب تک

تری بیگانہ خوئی سے بڑھی جاتی ہے مایوسی
مری پرسش کو آئے گی نگاہِ نارسا کب تک

بتا اے چارہ گر اس سعیِ لاحاصل سے کیا حاصل
خجل ہوتی رہے گی درد سے میرے دوا کب تک

کسی کی بے نیازی ہے کچھ ایسی مانعِ جرات
نگاہیں دیکھئے کرتی ہیں عرضِ مدعا کب تک

کبھی تو اُس رخِ روشن کو رخصت ہو بشارت کی
رہے مایوس تیرے گیسوؤں کا مبتلا کب تک

غزل کا لطف ہے وابستہ طرزِ کہن وحشت
خیالِ خاطرِ اصحابِ جدت آشنا کب تک

رضا علی وحشت

معارف

(۱)

مرغِ طوبیٰ نشیں کا دام ہے زیست؟ دل کی بے تابیوں کا نام ہے زیست؟
یا خرابات ہیں زمان و مکاں؟ اور شرابِ خودی کا جام ہے زیست؟

(۲)

جوہرِ دل کی بے نقابی ہے؟ یا عناصر کی کامیابی ہے؟
اصل دل ہے کہ زیست کیا معلوم؟ کون سی چیز اکتسابی ہے؟

(۳)

قلبِ مضطر کا اضطراب کہیں؟ یا اسے سحرِ نان و آب کہیں؟
زیست کی اصل کیا ہے کیا جانیں؟ زیست کو آب یا سراب کہیں؟

(۴)

فرق ہے زیست اور ہستی میں بے خودی اور خود پرستی میں
زیست ہستی کا ہے قیام امینؔ اس "زمان و مکاں" کی بستی میں

(۵)

محوِ حیرت ہوں دیکھ کر دل کو یہ شعور اور پارۂ گِل کو!
حسنِ لیلیٰ کا ہے ظہور امینؔ جس نے چمکا دیا ہے محمل کو

(۶)

کوئی سمجھے ہوئے ہے، طور ہے دل کوئی کہتا ہے 'عینِ نور ہے دل'
رازِ دل اہلِ دل ہی جانتے ہیں پرتوِ مہرِ ذی شعور ہے دل

(۷)

اُس سے ہم بے نیاز ہو نہ سکے! یہ کرشمے یہ ناز ہو نہ سکے!
اور سب کچھ ہوئے امینؔ لیکن غزنوی سے ایاز ہو نہ سکے

"امین حزیں"

محبّت کے گمشدہ الفاظ

(۱)

کوہِ قاف کی رشکِ ارم وادیوں میں ایک بے رحم پری رہتی تھی۔ وہ لالہ و یاسمن کے پھولوں سے زیادہ حسین لیکن اُس زہریلے ناگ سے کہیں زیادہ شریر تھی جو لمبی لمبی گھاس میں چھپ کر راہ چلتے لوگوں پر حملہ کرنے کے لیے ہر وقت مستعد و آمادہ رہتا ہے۔ اِس پری نے ایک وسیع و عریض مملکت کے لوگوں سے اِس بات کا انتقام لینا چاہا کہ فرمانروائے ملک کی دخترِ بلند کی سالگرہ کے موقع پر وہ لہو و لعب میں اتنے مشغول ہوئے کہ اُس کا شکریہ تک ادا کرنا بھول گئے۔ یہ ملک کہاں واقع تھا، کہانی اس بارے میں کچھ نہیں بتاتی ــــ غالباً اُس کے حدود اس ملک سے ملتے تھے جس کے خیاط شہزادیوں کی بیش قیمت قباؤں پر چاند اور ستارے مزین کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

پری اس سوچ میں تھی کہ آیا اُن خبیث روحوں اور شیاطین کو ہزاروں کی تعداد میں بھیج کر اس ملک کو تباہ و غارت کر دے جو اُس کے حکم سے فلک بوس محلات اور پھوس کے جھونپڑے جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔ یا گلاب اور موتیا کے پھولوں کو رنگینی اور تعطر سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دے۔ یا ملک کی تمام خوبصورت لڑکیوں کو کریہ منظر بوڑھی عورتوں کی شکل میں تبدیل کر دے۔ پورب اور پچھم، اُتر اور دکن کی تند ہواؤں سے تمام عالی شان عمارتوں اور سرسبز درختوں کو سطحِ زمین کے برابر کر دینا بھی اُس کے حیطۂ اقتدار میں تھا۔ اُس کے ایک اشارۂ ابرو پر جوالا مکھی پہاڑوں کے شرار سے چشم زدن میں تمام سرزمین کو آتش رقیق سے ڈھانپ سکتے تھے۔ اور روشنی بخشنے والا سورج آنکھ بند کر کے اُس ملک سے گزر سکتا تھا تاکہ اُس کی سنہری کرنیں اس منسوب ملک کے کسی گوشہ میں اپنا نور نہ بکھیر سکیں۔ لیکن بد باطن پری نے اِن ہولناک سزاؤں سے بھی زیادہ شدید انتقام لیا اور ایک مشاق چور کی طرح جو اطمینان کے ساتھ کسی صندوق سے گرانمایہ جواہر انتخاب کر رہا ہو اُس نے مرد اور عورتوں کے دلوں سے پانچ سماوی الفاظ محو کر دیئے۔

"مجھے تم سے محبت ہے"!!

یہ سزا دے کر اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور مسکرائی لیکن مسرتِ انتقام کا یہ خندۂ زیرِ لب شاید اُس کے خبثِ نفس سے بھی زیادہ بھیانک ہوتا اگر مبدأ فیاض نے اُسے سب سے زیادہ خوبصورت اور گلفام ہونٹ نہ عطا کیے ہوتے۔

(۲)

پہلے پہل اُس بدنصیب سرزمین کے مرد اور عورتوں کو اس سختی اور ظلم کا پوری طرح احساس نہ ہوا۔ وہ اتنا ضرور محسوس کرتے تھے کہ کسی بات کی اُن میں کمی ہے۔ لیکن یہ نہ بتا سکتے تھے کہ وہ کیا چیز ہے۔ خوبصورت وکشادہ بازاروں میں جب مہ جبین لڑکیاں اپنے منگیتروں سے ملتیں۔ یا نئی بیاہی ہوئی دلہنیں خلوتکدوں میں اپنے محرم راز شوہروں سے ہم کلام ہوتیں تو کچھ کہتے کہتے رک جاتیں پھر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اجنبیت سی محسوس کرنے لگتے وہ ایک رسمی جملہ زبان سے نکالنے کی آرزو کرتے لیکن انہیں یاد نہ آتا تھا کہ وہ جملہ کیا تھا عشق وشباب کی امنگوں سے معمور عشاق حیران ومضطرب تھے لیکن اپنے اضطراب کے متعلق کسی سے سوال نہ کرسکتے تھے کیونکہ کچھ ایسے بُرے طریق سے اُن نایاب الفاظ کو اپنے حافظہ سے خارج کرچکے تھے کہ اب اُنہیں یہ بھی نہ سوجھتا تھا کہ کسی سے سوال بھی کریں تو کیا کریں۔ پھر بھی اِس وقت تک اُن کی تکلیف زیادہ پریشان کن ثابت نہ ہوئی تھی کیونکہ اُن کے علاوہ بہت سے الفاظ تھے جو ایک دوسرے سے سرگوشی کی آوازیں کہہ سکتے تھے اور اظہارِ محبت کے اور بہت سے طریق انہیں معلوم تھے۔

افسوس! ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک قسم کا رنج وملال اُن کے حساس دلوں پر محیط ہوگیا۔ بیسیوں طور پر اب وہ ایک دوسرے کی دلجوئی کرتے اور بیسیوں طور پر ایک دوسرے کو پیارے ناموں سے پکار کر محبت کی دلگداز زبان میں باتیں کرتے تھے۔ اس امر کا اظہار کہ اُن کے بوسوں میں تمام دنیا کی فرحت ولطافت موجود تھی، اُن کے دلوں کو مطمئن نہ کرسکتا تھا۔ اور اِس بات کی قسم کھانا کہ میاں، بیوی کے لئے اور بیوی شوہر کے لئے جان تک دے دینے کو تیار تھی یا ایک دوسرے کو "میری روح"۔ "میری مسرت" یا "میرے دل افروز خواب"! کہہ کر پکارنا اب سعیٔ لاحاصل تھا۔ وہ بلا تامل ایسے لفظ کے بولنے اور سننے کی ضرورت محسوس کرتے تھے جو تمام دیگر الفاظ سے زیادہ دلآویز اور زیادہ شیریں تھا۔ جب اُن کے حافظہ میں اُس لفظ کی انگبینی کا خیال آتا تو اُن پر جانکنی کی سی حالت طاری ہوجاتی کیونکہ وہ اب اچھی طرح جان چکے تھے کہ اُن میں سے اب کوئی بھی نہ اُس لفظ کو زبان سے نکال سکے گا اور نہ کانوں سے سن سکے گا۔

اظہارِ جذبات کی اس بے مائگی کا لازمی نتیجہ آپس کے جھگڑے تھے۔ شوہر بیوی کے حسن وشباب اور نسائیت کی جملہ دلفریبیوں کے ہوتے ہوئے بھی زندگی کی مسرتوں کو ادھورا خیال کرتا تھا اور بیوی، شوہر کے ہونٹوں کی گرمی محسوس کرنے کے باوجود اُس سے ایک ایسی چیز کی طالب تھی جو نہ تو اُس کا خاوند نہ وہ خود جانتی تھی کہ کیا ہے اور نہ اُس مطلوبہ چیز کا نام بتا سکتی تھی۔ اب وہ ایک دوسرے کو سرد مہری کا ملزم گردان رہے تھے۔ پھر ایک دوسرے کو

پیماں شکن کہتے اور اظہارِ الفت وتلطف کو تصنع کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ اُس کا اظہار اُس طریق پر نہ ہوتا تھا جس طریق پر وہ چاہتے تھے کہ ہونا چاہئے۔

شہر کے شاداب خیابانوں میں مستِ شباب گل رخوں کے جمگھٹوں کی بجائے اب ویرانی ہی ویرانی نظر آتی تھی۔گلاب کی رنگینی، یاسمین کی بو اور سرو کی سربلندی میں کوئی جاذبیت نہ تھی۔چاند موجود تھا پر بے نور، چشموں میں پانی تھا لیکن برودت سے معرا۔حسن کی شوخیاں اور عشق کی گرمیاں سرد پڑگئی تھیں۔موسیقی کے روح گداز نغموں کی مقناطیسیت اور چنگ ورباب کی سحر آفرینیاں باطل ہوچکی تھیں۔جب دو پیکرِ محبت،جنہیں قسامِ ازل نے زندگی بھر کے لئے ایک دوسرے سے وابستہ کردیا تھا۔حریر واطلس کے زرنگار پردوں کی اوٹ میں بیٹھ کر گفتگو کرتے تو انہیں ایک قسم کی بیگانگی سی محسوس ہونے لگتی۔مخمل ودیبا سے منڈھی ہوئی کرسیاں جن کے نرم ونازک پہلو ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوئے تھے، اب علیحدہ علیحدہ پڑی رہتی تھیں۔اور دنیا کے نادر ونایاب جواہر سے مزین کمرے محبت ومودت کے افسانوں کی بجائے اب خشک گفتگو اور بے رس قہقہوں سے گونج رہے تھے۔

کیا محبت کے بغیر زندگی کا کوئی لطف ہے؟ یہ بدنصیب ملک جو پری کی نگاہِ خشمگین کے عتاب میں تھا اگر جنگ کے خوفناک شعلوں یا کسی متعدی وبا سے برباد ہوجاتا تو ہرگز اتنا غمگین، اتنا اداس اور اتنا ویران نہ ہوتا جتنا کہ ان پانچ سماوی الفاظ کے بھول جانے سے ہورہا تھا

(۳)

اسی مملکت میں ایک شاعر رہتا تھا جس کی حالت بہ نسبت تمام دیگر افراد کے زیادہ قابلِ رحم تھی۔اس لئے نہیں کہ وہ اپنی محبوبہ کو مسروقہ الفاظ سنانے یا اُس کے دلفریب لبوں سے وہی الفاظ سننے کے لئے مضطرب وبیقرار تھا۔اُس کی کوئی محبوبہ نہ تھی البتہ وہ موسیقی کی دیوی کا پرستار تھا۔اُس کی تمام مصیبت کا سبب یہ تھا کہ وہ ایک نظم کو اختتام تک پہنچانے سے معذور تھا جو اس نے بدطینت پری کے تکمیلِ انتقام سے ایک روز پیشتر شروع کی تھی لیکن اتفاق کی بات کہ اُس نظم کی ٹیپ انہیں الفاظ پر ختم ہوتی تھی "مجھے تم سے محبت ہے" اور اس نظم کو کسی دوسرے طریقہ سے ختم کرنا ناممکنات سے تھا۔

شاعر نے کئی بار تیوری چڑھائی، پھر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہنے لگا "کیا میں دیوانہ ہوگیا ہوں؟" اُسے کامل یقین تھا کہ اس بند کو شروع کرنے سے پیشتر وہ الفاظ اچھی طرح اُس کے حافظہ میں محفوظ تھے جنہیں وہ "ٹیپ" میں لانا چاہتا تھا۔وہ ہر بار اپنے دماغ پر زور دیتا اور فضا کی تاریکیوں میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کچھ دیکھنے کی کوشش

کرتا تھا۔ وہ پہروں انہیں فراموش شدہ الفاظ کو سوچتا، بلند آواز سے انہیں پکارتا ــــــــــ وہ صرف انہیں الفاظ کو استعمال کرنا چاہتا تھا جن میں شہد کی حلاوت حسن کی لطافت اور موسیقی کا ترنم موجود تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس لابدی اور مہلک جملہ کو کہاں تلاش کرے۔ اُس کا دماغ اِس معمہ کو حل کرنے سے یکسر قاصر تھا ــــــــــ اپنی نظم کو بار بار گاتا اور نامکمل بند تک پہنچ کر خاموش ہو جاتا۔ اُس کے دل میں بے چینی اور بے کلی کی ٹیسیں اُٹھتیں۔ آہ! ناتمام نظم کا عذاب اور دکھ اُس پر سکراتِ موت کی سی حالت طاری کر دیتا تھا ــــــــــ اب وہ دیوانوں کی طرح جنگل کے کنارے شفاف اور مصفا پانی کے چشموں کو تک رہا تھا جہاں پریاں حسبِ معمول ستاروں کی روشنی میں رقص کرنے آتی تھیں۔

(۴)

موسم بہار کی ایک سہانی صبح کو وہ ایک درخت کی پھولوں سے لدی ہوئی ٹہنیوں کی چھاؤں میں بیٹھا تھا کہ شریر پری نے اُسے دیکھا اور شاعر کی محبت اُس کے دل میں پیدا ہوگئی ــــــــــ پریاں اپنے دستور کے مطابق کسی رسم و رواج کی پابند نہیں ہوتیں ــــــ ایک تیتری کی سی عجلت کے ساتھ جب وہ گلاب کے پھول کو چومتی ہے، پری نے اپنے خوبصورت لبوں کو شاعر کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ اُس وقت شاعر اپنے انہماک کے باوجود پری کے سانس کی خوشبو اور اُس کے نرم و نازک جسم کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ زمین کی گہرائیوں میں نیلم اور یاقوت اس طرح چمک رہے ہیں جس طرح شبِ دیجور کی سیاہی میں چرخِ چنبری پر ستارے چمکتے ہیں۔ دوسرے لمحہ میں پری اور شاعر سونے اور الماس کی رتھ میں سوار تھے جسے پردار سفید گھوڑوں نے آن واحد میں زمین سے کھینچ کر فضا کی بلندیوں پر اُڑنا شروع کر دیا۔ پھر وہ عرصہ دراز تک ایک دوسرے سے بڑی محبت کرتے رہے۔ اب اُنہیں اپنے لطیف تبسّم اور شیریں بوسوں کے سوا کچھ یاد نہ تھا۔ اگر وہ ایک لمحہ کے لئے اپنے منہ علیحدہ کر کے ایک دوسرے کی خوبصورت آنکھوں کی طرف دیکھتے تو اُن کا مطلب اِس کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ اتصالِ لب کے علاوہ محبت کی دلچسپیوں میں مزید اضافہ کرنے کا یہ دوسرا طریق تھا۔ بہشتِ ارضی کی زہرہ جبین حوریں کاسنی ساٹن کے لباس میں ملبوس، ہاتھ میں ہاتھ دیئے اپنے وجد آور رقص سے اُنہیں محظوظ کرتیں۔ اور اُن کے ساحرانہ لحنوں کی تانیں غائبانہ موسیقی کی آوازوں کے ساتھ مل کر اِن وابستگانِ محبت کے دلوں میں موجِ سرور بن کر اُتر جاتیں۔ ماتحت پریاں کو کناری مخمل کا لباس زیبِ تن کئے نیلی ٹوکریوں میں برف جیسے سفید پھل رکھ کر لاتیں جن کی خوشبو سفید گلاب اور کسی نیک دل پری کے طاہر و باکر جسم سے بھی زیادہ دلاویز ہوتی۔ کبھی کبھار پری کو زیادہ خوش کرنے کے لئے شاعر اپنا بربط بجا کر ایسے خوبصورت اشعار گاتا جنہیں اُس کا بلند پرواز تخیل ایسے مواقع کے لئے غیر فانی الفاظ کے قالب میں منتقل کر سکتا تھا +

اگرچہ وہ ایک پری تھی لیکن اُس کے کان ابھی تک ایک خوبصورت مرد کی روح کی گہرائیوں تک پہنچنے والے گیتوں سے قطعًا نا آشنا تھے۔ جب شاعر گاتے گاتے خاموش ہو جاتا اور پری اُس کے تنفس کو اپنے کان کی لو سے چھو کر سیاہ بالوں میں سے گزرتے ہوئے محسوس کرتی تو اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ آتشِ محبت میں گُھلی جا رہی ہے۔

اب اُن کی زندگی ایک سرمدی لطف و نشاط معلوم ہوتی تھی۔ بہت دن گزر گئے لیکن کوئی ایسا حادثہ پیش نہ آیا جو اُن کی خوشی و مسرت میں خلل انداز ہو سکتا۔ لیکن پھر بھی پری کسی وقت اُداس اور غمگین ہو جاتی۔ جب اُس کا شاعر اپنی شاعری و موسیقی کے معجزات اُس کے سامنے پیش کرتا تو وہ اپنے ہاتھ رخساروں پر رکھ کر بڑی محویت سے سنتی۔ پھر اپنے خیالات میں غرق ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی۔

"اے ملکہ" شاعر اسے مخاطب کر کے کہتا "وہ کون سی چیز تمہیں ملول و مضمحل بنا دیتی ہے۔ اس سے زیادہ تمہیں کس چیز کی خواہش ہے۔ دنیا کی ہر آسائش ہمیں میسر ہے اور پھر اس تمام سامانِ تعیش و تنعم کے ہوتے ہوئے تم کہ اتنی با اختیار اور اتنی خوبصورت ہو، کیوں اُداس رہتی ہو؟"

پہلے پہل تو اُس نے کوئی جواب نہ دیا لیکن جب وہ مصر ہوا تو آہ بھر کر کہنے لگی "افسوس! جو دوسروں کو کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے بالآخر خود بھی اُسی مصیبت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پیارے شاعر میں اس لئے اُداس ہوں کہ تم نے مجھ سے کبھی نہیں کہا "مجھے تم سے محبت ہے۔""

شاعر نے ان الفاظ کو دہرانے کی بجائے خوشی کا ایک نعرہ لگایا کیونکہ اپنی غیر مکمل نظم کا اختتام اُسے معلوم ہو گیا تھا۔ اب پری کا اُسے نیلم و یاقوت کی سرزمین اور سوسن و نرگس کے چمنستانوں میں روکنے کی کوشش کرنا سعی لاحاصل تھا۔ وہ شاداں و فرحاں زمین پر واپس آ گیا جہاں اُس نے اپنی نظم مکمل کر کے شائع کر دی جس کی وساطت سے متوب ملک کے مرد اور عورتوں نے اُن سماوی اور الہامی الفاظ کو دوبارہ حاصل کر لیا جو مدت ہوئی وہ اپنے دماغوں سے فراموش کر چکے تھے۔

شہر کے پُر بہار گلزاروں میں اب پھر پہلی سی رونق اور چہل پہل تھی زرتار پردوں کے پیچھے خشک گفتگو کی بجائے محبت سے لبریز نغمے گونجتے تھے اور یہ شاعری ہی کا فیضان ہے کہ دل محبت سے سرشار ہیں اور عشاق ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں کہتے جو شاعروں نے اپنے بے پناہ اشعار میں نہ گائی ہو۔

(ملخص)

محمد ضیاء الدین شمسی

کلامِ جگر

ہے کوئی بات آج ہونے کو
جی بہت چاہتا ہے رونے کو

آنکلنا نہ تم کہیں سے اِدھر
کوئی بیٹھا ہے جان کھونے کو

کون ہوگا شریکِ شادی و غم
کوئی ہنسنے کو ہے نہ رونے کو

کٹ گئی ساری رات آنکھوں میں
ہم سے کیا پُوچھتے ہو سونے کو

ہو چکی بازپرس بھی آخر
ہوگیا، جو رہا تھا ہونے کو

وہ بشر بھی عجب بشر ہے جگر
فرض سمجھے جو رونے دھونے کو

(۲)

عمر بھر تو درد و غم سہتے ہیں ہم
مَوت آتی ہے تو مر رہتے ہیں ہم

ناخدا کوئی نہ کوئی غمگسار
اِک سمندر میں پڑے بہتے ہیں ہم

پوچھتا ہے کون دردِ زندگی
کون سنتا ہے اگر کہتے ہیں ہم

سوچ لیتے ہیں مآلِ زندگی
شدّتِ غم میں بھی چُپ رہتے ہیں ہم

سرگزشتِ مرگ اِسے ہمدم نہ جان
داستانِ زندگی کہتے ہیں ہم

راز اپنا بھی نہیں کُھلتا جگر
کچھ نہیں معلوم کیا کہتے ہیں ہم

جگر۔ بریلوی

ابکارِ افکار

جب تک ہم جستجو نہ کریں ہم نہیں جان سکتے کہ ہماری ذات میں کیا کیا جوہر پنہاں ہیں۔
لوگ موتیوں کے لئے سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ لگاتے ہیں کیونکہ موتی ساحل پر نہیں ملتے۔
اُن پہاڑوں میں جو بظاہر بالکل بے برگ وگیاہ اور سنگلاخ ہوتے ہیں بعض اوقات قیمتی دھاتیں چُھپی ہوتی ہیں۔

جاؤ، اپنے دل کے ژرف وعمیق سمندر میں غوطہ لگاؤ۔
اے لوگو! اُس کی شور انگیز لہروں سے بہت نیچے، نیچے گہرائیوں میں جہاں سکوت اور سکون کا دور دورہ ہے تمہیں نایاب جواہر اور بے بہا موتی ملیں گے۔

تفکر اور تدبر کی کان کو کھودو
سونا تلاش کرنے والوں کی طرح استقلال پیدا کرو
انہیں چٹانوں اور سنگ ریزوں کے نیچے تمہیں وہ دولت ملے گی جس سے تم مالا مال ہو جاؤ گے۔

ہر انسان کے دل میں کائنات کے بے پایاں سمندر کا عکس پڑتا رہتا ہے۔
اور گو دنیا اُن کی آب وتاب کو مٹا دیتی ہے مگر ڈھونڈنے سے دل کی گہرائیوں میں نور اور حسن کے موتی مل ہی جاتے ہیں۔

ایلا ویلر ولکاکس

زندگی کی مثال

میں یہ سطور لکھ رہا ہوں اور اپنی کھڑکی کے باہر اوپر سے تلے تک اِن چیزوں کو علی الترتیب دیکھتا ہوں۔
بادل - پہاڑی - مکان - دیوار - سڑک - دریا۔

زندگی کوئی بادل نہیں ہے۔ کیونکہ بادل کی ہستی ہلکی دھند کے سوا کچھ نہیں۔

زندگی کوئی پہاڑی نہیں ہے۔ کیونکہ پہاڑی دور ہی سے خوبصورت نظر آتی ہے۔ حالانکہ زندگی قریب اور عزیز ہے۔ اور دور و نزدیک سے اُس کا منظر یکساں طور پر دل کش ہے۔

زندگی کوئی مکان نہیں ہے۔ کیونکہ مکان کو استقلال ہے اور زندگی ایک ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ بہت سی زندگیاں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ مگر مکان وہیں کھڑا رہتا ہے۔

زندگی کوئی دیوار نہیں ہے کیونکہ دیوار ایک حد ہے۔ اور زندگی غیر محدود ہے۔ اُس کی کوئی حد نہیں۔

زندگی کوئی سڑک نہیں ہے۔ کیونکہ زندگی میدانوں میں گھومتی پھرتی ہے۔ اور وہاں جاتی ہے جہاں اور نہیں گئے۔ وہ ایک پرندے کی طرح جھاڑیوں میں اُڑتی پھرتی ہے۔ اور ایک ہرن کی طرح جنگل میں چوکڑیاں بھرتی ہے۔

زندگی ایک دریا ہے ہمیشہ ایک حالت میں رہتی ہے۔ مگر پھر بھی بدلتی ہے۔ گزرتی ہے مگر پھر بھی موجود رہتی ہے۔ سیال ہے مگر پھر بھی دیواروں اور مکانوں سے زیادہ دیر باقی رہنے والی ہے۔ بہتی ہے مگر پھر بھی رہتی ہے۔ رفتنی ہے مگر پھر بھی اِس میں ایک ابدیت ہے۔

"دریائے زندگی" بہت عمدہ مثال ہے۔ یہ دریا ہی ہے جس کو فطرت نے ناپائداری بھی دی ہے اور استقلال بھی۔

فرینک کرین

وہ سو رہی ہے

واٹرلو کی جنگ سے چند سال قبل ہمپ سٹیڈ میں ایک نوجوان خاتون اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر کچھ لکھ رہی تھی۔ یہ اینا لیٹیشیا باربالڈ تھی۔ اور جو کچھ اُس نے لکھا وہ یہ ہے:۔

میں جانتی نہیں ہوں اے زندگی تو کیا ہے ۔۔۔ لیکن یہ جانتی ہوں وہ دن بھی آرہا ہے
تجھ سے مجھے جدا جب ہونا پڑے گا آخر ۔۔۔ تیرے فراق میں دل کھونا پڑے گا آخر
کب اور کس طرح ہم اے میری جاں ملے تھے ۔۔۔ اک راز ہے یہ اب تک ہم تم کہاں ملے تھے
اے زندگی مگر یوں دنیا میں ہم رہے ہیں ۔۔۔ یک جان اور دو قالب ہو کر بہم رہے ہیں
دنیا کے رنج اٹھائے اور راحتیں بھی دیکھیں ۔۔۔ آرام بھی اُٹھائے اور کلفتیں بھی جھیلیں
تیری رفاقتیں جب آتی ہیں یاد اے جاں ۔۔۔ تیری محبتیں جب آتی ہیں یاد اے جاں

اُس دم تری جدائی ہوتی ہے شاق مجھ کو
بے شک رُلائے گا خوں تیرا فراق مجھ کو
صدمہ نہ یہ کبھی میں لے جاں اٹھا سکوں گی
ڈھارس نہ اپنے دل کی ہرگز بندھا سکوں گی
لیکن نہ بھول جانا اک آرزو مری تم
یہ بات یاد رکھنا اے میری زندگی تم
ہو کوچ جب تمہارا دنیا سے جاوداں کو
چپکے سے چھوڑ جانا اِس جسم ناتواں کو

واٹرلو کی جنگ کے چند سال بعد مسز بار بالڈ پھر اپنے کمرے میں بیٹھ کر کچھ لکھ رہی تھی اور جو کچھ اُس نے لکھا وہ یہ ہے:-

"تم کون ہو؟"

"کیا تم مجھے نہیں جانتیں؟ کیا تم میری منتظر نہ تھیں"؟

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"میرے ساتھ آؤ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔"

"راستہ تاریک ہے!"

"ہاں مگر اس پر بہت لوگ چل چکے ہیں"

یہاں وہ ٹھہر گئی۔ ایک گھنٹے کے بعد لوگوں نے دیکھا۔ کہ وہ سو رہی ہے۔ وہ اُس تاریک راستے پر پڑلی تھی جس سے تمام بنی نوعِ انسان کو گزرنا ہے۔

منصور احمد

محبّت

نیکی میں سچا حُسن اور سچّی محبت دونوں بیک وقت جلوہ پاش ہوتے ہیں۔

میرا دل زندگی میں دنیا بھر کی مخالفت کا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن محبت میں تیری بے اعتنائی کو برداشت نہیں کر سکتا۔

لطیف

تجلّیات

تاروں میں حُسن ہے نہ ہے خورشید و ماہ میں — کچھ ہے اگر تو دیکھنے والی نگاہ میں

منزل کی آرزو میں نہ ہے اضطرابِ شوق — منزل کو دیکھتا ہوں ہر اک سنگِ راہ میں

کچھ سوجھتا نہیں ہے وفورِ جمال سے — بجلی سی کوندتی ہے تری جلوہ گاہ میں

بزمِ خیال میں کوئی جلوہ فروز ہے — عالم سحر کا ہے مری شامِ سیاہ میں

کس کی ضیائے حُسن سے روشن ہے کائنات — کس کی ضیائے حسن ہے خورشید و ماہ میں

یادِ گناہ و اشکِ ندامت میں لطف ہے — ورنہ نہیں ہے خاک بھی لذت گناہ میں

للہ سہل کر مری دشواریٔ حیات — اے آرزوئے مرگ ہوں تیری پناہ میں

بزمِ شراب تک جو رسائی نہ ہو سکی — خاموش ہو کے بیٹھ رہے خانقاہ میں

دنیا کے خیر و شر پہ نظر ڈالتا ہوں میں — راتوں کو چھپ کے منزلِ پُرنورِ ماہ میں

یہ زندگی حیات ہے یا موت ہے حیات — گذری تمام عمر اسی اشتباہ میں

میں بھی حریفِ برقِ تجلائے طور ہوں — دل میں مرے وہی ہے جو تیری نگاہ میں

اِس جبر پر بھی ہے اُسے احساسِ اختیار — اک انفعال سا ہے دلِ عذر خواہ میں

زندہ دلی کے ساتھ مٹا زندگی کا لطف — لذّت ثواب میں نہ مزا ہے گناہ میں

جس آہ میں اثر ہی نہیں ہے وہ آہ کیا — وہ آہ کیا اثر ہی نہیں ہے جس آہ میں

اکبر کو ایسے منزلِ مقصود مل چکی
بیٹھا ہے پاؤں توڑ کے کمبخت راہ میں

جلال الدین اکبر

خیالاتِ زرّیں

بادل اور لہریں

اے ماں! لوگ جو اوپر بادلوں میں رہتے ہیں مجھے پکارتے ہیں۔ کہ

"ہم صبح جاگنے کے وقت سے دن کے ختم ہونے تک برابر کھیلتے رہتے ہیں۔ ہم سنہری صبح سے، ہم روپہلی چاندنی سے کھیلا کرتے ہیں!

میں پوچھتا ہوں "لیکن میں تم تک اوپر کیسے پہنچوں"؟

وہ جواب دیتے ہیں "زمین کے کنارے پر آجاؤ۔ پھر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بڑھاؤ تو تم اوپر بادلوں میں اٹھا لئے جاؤ گے۔

میں کہتا ہوں "میری ماں میرے لئے گھر پر میری راہ تک رہی ہے۔ میں کیونکر اُسے چھوڑ کر آجاؤں؟ اس پر وہ مسکراتے ہیں اور تیرتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ لیکن اے ماں! میں اس سے بھی ایک زیادہ مزیدار کھیل جانتا ہوں۔ میں بادل بنوں گا اور تم چاند۔ میں دونوں ہاتھوں سے تم کو ڈھانپ لوں گا اور ہمارا کوٹھا ہمارا نیلا آسمان ہو گا۔

لوگ جو لہروں کے درمیان رہتے ہیں مجھے پکارتے ہیں کہ ہم صبح سے رات ہونے تک گانا گاتے ہیں ہم برابر چلے جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ہم کہاں کہاں سے گزر رہے ہیں۔

میں پوچھتا ہوں۔ "لیکن میں کیسے تمہیں آملوں؟" وہ مجھے بتاتے ہیں کہ سمندر کے کنارے آجاؤ اور اپنی آنکھیں خوب بند کرلو تو تم خودبخود لہروں پر اٹھا لئے جاؤ گے۔

میں کہتا ہوں میری ماں یہ چاہتی ہے کہ میں شام کو گھر پر رہوں میں کیسے اُسے چھوڑ کر جا سکتا ہوں"؟ پھر وہ مسکراتے ہیں اور ناچتے ہوئے گزر جاتے ہیں لیکن میں اس سے ایک زیادہ مزیدار کھیل جانتا ہوں میں لہریں بن جاؤنگا اور تم ایک اجنبی کنارہ ہو جانا۔ میں بہے جاؤں گا بہے جاؤں گا۔ اور یونہی ہنستے ہوئے ہنسی کے ساتھ اپنے تئیں زور سے تمہاری گود میں ڈال دوں گا۔

اور دنیا میں کوئی شخص بھی نہ جاننے پائے گا کہ ہم دونوں کہاں ہیں؟

سوداگر

اے ماں تو سمجھ لے کہ تجھے گھر پر رہنا ہے اور مجھے پردیس میں دور دور سفر کرنا ہے۔ یہ خیال کر کہ میری کشتی گھاٹ پر لدی ہوئی تیار کھڑی ہے۔ اب اچھی طرح سوچ لے اے ماں اور پھر بتا کہ جب میں وطن کو لوٹوں تو تیرے لئے کیا کچھ لاؤں۔

اے ماں کیا تو سونے کے ڈھیروں کے ڈھیر لینا چاہتی ہے! وہاں سنہری ندیوں کے کنارے کھیتیاں سنہری فصلوں سے بھری پڑی ہیں۔ اور جنگل کی سایہ دار راہ میں چمپا کے سنہری پھول زمین پر بچھے پڑے ہیں۔ میں اُن سب کو تیرے لئے سینکڑوں ٹوکریوں میں جمع کروں گا۔

اے ماں! کیا تو بڑے بڑے موتی لینا چاہتی ہے خزاں کی بوندوں کی طرح بڑے بڑے؟ میں سمندر پار ہو کر موتیوں کے جزیرے کے کنارے پہنچ جاؤں گا۔

وہاں نور کے تڑکے ہلکے ہلکے موتی چراگاہ کے پھولوں پر کانپ رہے ہوتے ہیں۔ موتی گھاس پر گرتے ہیں اور موتی ہی سمندر کی آوارہ لہروں کے قریب ریت پر بکھرے ہوتے ہیں۔

میرے بھائی کو گھوڑوں کی ایک جوڑی ملے گی جو پروں کے زور سے بادلوں میں اُڑی چلی جائے گی۔

ابا جان کے لئے میں ایک جادو کا قلم لاؤں گا جو بغیر اُن کے جانے خود بخود لکھتا رہے گا۔

تمہارے لئے اے ماں میں ضرور وہ صندوقچی اور ہیرا لاؤں گا جس کے لئے سات بادشاہوں نے اپنی سلطنت کھو دی!

تصنیف کا فن

تم کہتی ہو کہ ابا جان بہت سی کتابیں لکھتے ہیں لیکن جو وہ لکھتے ہیں میں نہیں سمجھتا۔

وہ کل ساری شام تم کو پڑھ کر سناتے رہے۔ لیکن کیا تم کو واقعی سمجھ میں آیا جو انہوں نے سنایا؟ کتنی پیاری کہانیاں اے ماں تم ہم کو سنا سکتی ہو! مجھے حیرت ہے کہ ابا جان ایسا کیوں نہیں لکھ سکتے۔ کیا انہوں نے اپنی ماں سے کبھی دیووں اور پریوں اور شہزادیوں کی کہانیاں نہ سنی تھیں؟ کیا وہ اُن سب کو بھول چکے ہیں؟

کئی بار جب وہ غسل کرنے میں دیر کر دیتے ہیں تو تم سو سو دفعہ جا کر انہیں بلاتی ہو تم انتظار کرتی ہو اور کھانا اُن کے لئے گرم رکھتی ہو لیکن وہ لکھے جاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔

ابا جان ہمیشہ کتابیں بنانے کا کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔

اگر کبھی میں ابا جان کے کمرے میں کھیلنے کو جاتا ہوں تو تم آ کر مجھے بلا لیتی ہو کہ "تم کیسے شریر بچے ہو!" اگر میں ذرا سا شور بھی مچاتا ہوں تو تم کہتی ہو "کیا تم نہیں دیکھتے کہ ابا جان اپنا کام کر رہے ہیں؟" بھلا ہمیشہ یونہی لکھتے اور لکھتے رہنے میں کیا مزا ہے؟ جب میں ابا جان کا قلم یا پنسل اٹھا کر انہیں کی طرح اُن کی کتاب پر ا ب ت ج چ ح خ لکھتا ہوں تو اے ماں! تم مجھ سے ناراض کیوں ہو جاتی ہو؟ تم ایک بات بھی نہیں کہتیں جب ابا جان لکھتے ہیں۔ جب میرے ابا جان کاغذ کے کاغذ سیاہ کر دیتے ہیں تو اے ماں! تم کو ذرا بھی بُرا نہیں لگتا لیکن اگر میں کاغذ کا ایک ورق لے کر بھی ایک ناؤ بنانے لگوں تو تم کہتی ہو کہ "بچے! تم کس قدر ستاتے ہو!"

ابا جان کے کاغذ کے دونوں طرف کالے کالے نشان لگا کر دستے کے دستے برباد کر دینے کو تم کیا سمجھتی ہو؟

میرے بچے

جب میں تجھے رنگین کھلونے لا کر دیتی ہوں میرے بچے! تو میں جان لیتی ہوں کہ بادلوں میں اور پانیوں پر ایسی رنگ آمیزیاں کیوں ہیں اور پھول یوں رنگا رنگ کس لئے ہیں۔ جب میں تجھے رنگین کھلونے دیتی ہوں میرے بچے!

جب میں گاتی ہوں تا کہ تو ناچے کود ے تو میں ٹھیک جان لیتی ہوں کہ پتیوں میں موسیقی کیوں ہے اور موجیں کس لئے گوش بر آواز زمین کے دل کو اپنی ہم آہنگ آوازوں سے بلاتی ہیں۔ جب میں گاتی ہوں کہ تو ناچے کودے!

جب میں تیرے حریص ہاتھوں کی طرف میٹھی چیزیں لاتی ہوں تو میں جان لیتی ہوں کہ پھول کے پیالے میں شہد کیوں ہے اور پھل اندر ہی اندر شیریں رس سے کس لئے بھرا رہتا ہے۔ جب میں میٹھی چیزیں تیرے حریص ہاتھوں کی طرف لاتی ہوں!

جب میں تیرا منہ چومتی ہوں تا کہ تو مسکرائے میرے پیارے! تو میں ٹھیک جان لیتی ہوں کہ وہ خوشی جو آسمان سے صبح کی روشنی بن کر بہ نکلتی ہے کیا ہے اور وہ مسرت کیا ہے جو نسیم بہار میرے روح و رواں کے لئے اپنے ہمراہ لاتی ہے جب میں تجھے چومتی ہوں کہ تو مسکرائے!

گلچیں

سوز و ساز

پروانہ کر کے ہمتِ مردانہ جل گیا
دل دیکھ کر یہ جرأتِ پروانہ جل گیا

دیکھا چراغِ خانۂ آزر نے کیا کیا؟
بھڑکی وہ آگ اُس سے کہ بتخانہ جل گیا

جلتا ہے کس لئے دلِ بے مدّعا مرا
وحشت ہے سینہ کوب کہ ویرانہ جل گیا

جلنے میں لخت لخت کو سبقت کا شوق تھا
اِس دل کا ذرّہ ذرّہ حریفانہ جل گیا

اے برقِ حسن اب بھی وہی بے قرار یا؟
بس اب وہ دل وہ عشق کا کاشانہ جل گیا

ممکن نہیں کہ بھول سکوں یہ حکایتیں
دفتر ہی گر مرے غمِ دل کا نہ جل گیا

ہر لختِ دل میں آتشِ غم ہے شرارہ بار
ہو کر ورق ورق مرا افسانہ جل گیا

آخر کھلا کہ سوز سے نا آشنا تھی شمع
اپنے ہی دل کی آگ سے پروانہ جل گیا

حامد علی خاں

جادوئے بنگالہ

ٹیگور کا سحرِ حلال

تارک الدنیا

دنیا کو ترک کرنے کا خیال اُس کے دل میں مدت سے بس رہا تھا۔

آدھی رات کو اٹھ کر اُس نے کہا "اب وقت ہے کہ میں گھر بار سے ہمیشہ کے لئے منہ موڑ لوں اور خدا کی تلاش میں نکل جاؤں۔ میں نے اپنی عمر بے کار کھو دی، آہ کس نے اب تک مجھے میرے اِس ارادے سے باز رکھا؟"

جواب میں خدا کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی "میں نے"، لیکن اُس نے یہ آواز نہ سنی۔

سامنے پلنگ پر اُس کی بی بی اُس کے بچے کو چھاتی سے لگائے اطمینان کی گہری نیند میں بے خبر سو رہی تھی۔

تارک الدنیا نے کہا "تم ہو کون جنہوں نے اب تک مجھے احمق بنائے رکھا؟"

آواز آئی "خدا"، لیکن اُس نے یہ آواز نہ سنی۔

بچہ خواب میں چلایا اور اپنی ماں کی چھاتی کے ساتھ چمٹ گیا۔

خدا کا حکم تھا "نادان ٹھہر، اپنے اِس خیال سے درگزر" لیکن اب بھی اُس کے کان سماعت سے محروم رہے۔

خدا کی آواز تاسف میں دب گئی ــــــ "آہ میرا بندہ مجھ سے روگرداں ہو کر میری تلاش میں کیوں بھٹکتا پھرتا ہے؟"

میرا دل لرز جاتا ہے

تیری ایک نگاہ، اے حسین عورت! شاعروں کے ساز کے نغموں کی تمام دولت کو سمیٹ سکتی تھی۔

لیکن اُن سے تعریفیں سننے کا شوق تجھے نہیں، اِس لئے میں تیری تعریف کرتا ہوں۔

دنیا کے مغرور سے مغرور سر کو تو اپنے قدموں پر رکھوا سکتی تھی۔

لیکن جو تجھے محبوب ہیں —— دولت و شہرت سے محروم —— اُن کی پرستش کرنے کو تو اس پر ترجیح دیتی ہے، اِس لئے میں تیری پرستش کرتا ہوں۔

تیرے خوبصورت ہاتھوں کا مس شاہانہ ساز و سامان کی زینت کا باعث ہو سکتا تھا

لیکن اِن ہاتھوں سے تو اپنے گھر کو صاف کرنے کے لئے جھاڑو دینے کا کام لیتی ہے۔ اس لئے میرا دل لرز جاتا ہے۔

گداگر

"جو تم اپنی خوشی سے دو مجھے قبول ہے، میں اور کچھ نہیں مانگتا"

"ہاں، ہاں، اے سیر چشم گداگر! تمہیں کون نہیں جانتا؟ جو کچھ کسی کے پاس ہو تم وہ سب کا سب مانگتے ہو"

"کوئی گرا پڑا پھول ہو تو میں اُسے اپنے دل میں بساؤں گا"

"لیکن اگر کانٹے ہوں تو؟"

"میں برداشت کروں گا"

"ہاں، ہاں، اے سیر چشم گداگر! تمہیں کون نہیں جانتا؟ جو کچھ کسی کے پاس ہو۔ تم وہ سب کا سب مانگتے ہو"

"اگر صرف ایک دفعہ تم اپنی محبت بھری نگاہیں اُٹھا کر میرے چہرے پر ڈال دو تو میری روح قیامت تک اِس شیریں لمحے کی یاد میں سرشار رہے گی"

"لیکن اگر صرف قہر آلود نگاہیں ہوں تو؟"

"میں اُنہیں اپنے دل میں پیرا تا رہوں گا"

"ہاں، ہاں، اے سیر چشم گداگر! تمہیں کون نہیں جانتا؟ جو کچھ کسی کے پاس ہو تم وہ سب کا سب مانگتے ہو"

حامد علی خاں

محبّت کی آواز

میرے پیارے دوست! میرے تنہا رازدار! میں تجھے کیا بتاؤں رات میں نے کیا خواب دیکھا!

میں اور تُو باہم بیٹھے تھے محبت تیری گفتگو اور میری نگاہ میں جلوہ پاش تھی۔ پھر مجھے نہیں معلوم کیا ہوا۔ تُو کھڑکی کی طرف لپکا میں چلاّتی رہ گئی لیکن تُو باد و باران کے اک ہیبت ناک طوفان میں نیچے کو کود پڑا اور ایک ابلق گھوڑے پر جو بجلی کی طرح فضا کو چیرتا چلا جاتا تھا تُو سوار ہو لیا۔

میرا دل سینے میں دھڑکنے لگا۔ قریب تھا کہ میں بے حس و حرکت ہو کر گر پڑتی کہ اتنے میں کسی نے زور سے آواز دی کہ دیکھ اِس سرکش گھوڑے کا رام کرنا تیرے بس میں ہے!

میرے پیارے دوست! میں تجھے کیا بتاؤں رات میں نے کیا خواب دیکھا!

میری اچھّی دلبر! میری سچی رہبر! فطرت میری تیری محبت کی دشمن نکلی، زمانے نے اک طوفانِ بے تمیزی برپا کردیا۔ اپنے جوش میں مجھے ہوش نہ رہا میں اپنے جذبات کے اسپ تیز گام پر سوار ہوا اور میں نے اُسے فضائے آسمانی کی بے انتہا وسعت میں دوڑا دیا کہ کسی اور سرزمین کا رُخ کروں۔ میں بھول گیا کہ میرا نصیبہ کہاں ہے اور میرا کار منصبی کیا ہے۔ اپنی جولانیوں میں میں نے تیری چیخ پکار سُنی جو محبت کے شیریں ساز کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی چلی آتی تھی۔ اِس پُرسوز آواز نے راکب و مرکب دونوں کو تامل و توقف کا پیام دیا۔ میرا گھوڑا اور میں دونوں زمین پر اُتر آئے۔ ہم رستہ نہ جانتے تھے۔ سو اگر تیری آواز نہ آتی تو میں راہِ راست سے بھٹک جاتا اور اگر تیری محبت عنان گیر نہ ہوتی تو میرے جذبات مجھے تباہ و برباد کر دیتے۔

اب اے میری پیاری رہبر! اب اے میری سچی دلبر! زندگی کے دشوار گزار سفر میں مجھے تنہا نہ چھوڑ دینا۔ میں خادم ہوں تو مخدوم، سوا اے جانِ تمنا! اب مجھ سے منہ نہ موڑ لینا۔ بلکہ ایثار و نیکی کے اُس کوہستانی رستے میں جس کے سنگریزے پھول بن بن کر تیری قدم بوسی کر رہے ہیں میری رہنما بن جانا! میری دلربا بن جانا!!

لطیف

محفلِ ادب

"مراۃ العروس" اور "چند پند" کی سرگزشت

پچھلے دنوں اورنگ آباد کے رسالۂ اردو میں ایک نہایت لطیف مضمون "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی" شائع ہوا ہے۔ جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی۔ اے کا یہ مضمون طرزِ تحریر کی جدّت اور اندازِ بیان کی شگفتگی سے مالامال ہے۔ مولانا مرحوم کی زندگی کے جہاں اور بہت سے دلچسپ واقعات اس میں موجود ہیں وہاں اُن کی دو مشہور معروف کتابوں "مراۃ العروس" اور "چند پند" کی سرگزشت بھی لکھی ہے کہ یہ کتابیں کیونکر معرضِ وجود میں آئیں اور کس طرح مقبول ہوئیں۔ اس واقعہ کو ہم بجنسہٖ یہاں نقل کرتے ہیں۔ مولانا خود فرماتے ہیں۔

"اب رہے ہماری تصنیفات پر انعام، وہ تو اللہ میاں نے چھپر پھاڑ کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی کہتا بھی کہ مراۃ العروس پر تم کو انعام ملے گا تو میں اُس کو دیوانہ سمجھتا۔ اصل یہ ہے کہ یہ کتاب میں نے اپنی لڑکی کے لئے لکھی تھی، وہی پڑھا کرتی تھی۔ میاں بشیر کو "چند پند" لکھ دی تھی۔ میں اُس زمانے میں تعلیمات کا انسپکٹر تھا، دورے پر نکلے تھے، بال بچے ساتھ تھے، ایک جگہ ٹھیرے تھے کہ مسٹر کیمپسن ڈائرکٹر تعلیمات کا ڈیرہ بھی قریب میں آلگا۔ شام کا وقت تھا، میاں بشیر اپنی ٹٹوانی پر سوار ہوکر ہوا خوری کو نکلے۔ اُدھر سے ڈائرکٹر صاحب آ رہے تھے۔ میاں بشیر نے جھک کر سلام کیا، صاحب ٹھیر گئے پوچھا "میاں تمہارا کیا نام ہے" انہوں نے نام بتایا، پھر پوچھا "تمہارے والد کون ہیں" انہوں نے میرا نام بتایا۔ پھر پوچھا یہ کہو میاں کیا پڑھتے ہو، انہوں نے کہا "چند پند" ڈائرکٹر صاحب سمجھے تھے کہ اردو کی پہلی یا دوسری کہے گا۔ چند پند کا نام سُن کر پریشان ہوئے کیونکہ اس عجیب و غریب نام سے اُن کے کان ناآشنا تھے۔ کہا یہ ہمیں اپنی کتاب دکھاؤ گے" بشیر نے کہا جی ہاں ابھی لاتا ہوں۔ ہمارے آپا کی بھی کتاب دیکھیئے گا۔ انہوں نے کہا "اُس کتاب کا کیا نام ہے؟" انہوں نے کہا "مراۃ العروس" یہ دوسرا نیا نام تھا، صاحب نے کہا "ہاں وہ بھی لاؤ" میاں بشیر ٹٹوانی سے کود بھاگتے ہوئے ڈیرے میں آئے۔ اپنا جزدان کھول "چند پند" نکالی۔ اس کے بعد اپنی بہن کے جزدان پر قبضہ کیا۔ اُس نے جو دیکھا کہ بشیر جزدان ٹٹول رہا ہے تو دوڑتی ہوئی گئی سامنے بہن، بشیر مراۃ العروس لے کر بھاگا۔ یہ اُس کے پیچھے بھاگی دونوں میں بڑی دھینگا مشتی ہوئی۔ خوب رونا پیٹنا ہوا بشیر بہن کو دھکا دے۔ کتاب لے یہ جا وہ جا۔ بہن صاحبہ نے دل کا بخار آنسو بہا کر نکالا۔ میاں بشیر نے دونوں کتابیں لے جا صاحب کے حوالے کیں۔ انہوں نے الٹ پلٹ کر کچھ پڑھا اور بشیر سے کہا "ہم یہ کتابیں لے جائیں۔ کل بھجوا دیں گے۔" انہوں نے کہا "لے جایئے کل ہم کو

چھٹی رہے گی" میں جو ڈیرے میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قیامت مچ رہی ہے۔ لڑکی نے رو رو کر آنکھیں لال کر لی ہیں میاں بشیر ڈرے سہمے ڈیرے کے ایک کونے میں دبکے بیٹھے ہیں۔ میرا اندر قدم رکھنا تھا کہ فریاد کی صدا بلند ہوئی۔ صاحبزادی نے رو رو کر اس طرح واقعہ بیان کیا جس طرح کسی عزیز کے مرنے کا کوئی بین کرتا ہے۔ میں نے بشیر کو بلایا وہ ڈرے کہ کہیں ٹھکائی نہ ہو جائے پہلے ہی سے بسورنا شروع کیا۔ وہ دبے جاتے تھے اور بہن شیر ہوئی جاتی تھی۔ آخر بڑی مشکل سے معلوم ہوا کہ ایک انگریز دونوں کتابیں لے کر چلا گیا۔ میں نے جا کر سائیس سے پوچھا کہ وہ انگریز کون تھا تو معلوم ہوا کہ سامنے جو ڈیرے پڑے ہیں اُن میں وہ اُترے ہیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ بھلا ڈائرکٹر صاحب کو بچوں کی کتابوں سے کیا کام۔ خیر لڑکی کو دلاسا دیا کہ میں لا دوں گا۔ نہیں تو دوسری لکھ دوں گا۔ اُس نے کہا میں لوں گی تو وہی کتاب لوں گی۔ بڑی مشکل سے اُس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ اب فکر ہوا کہ صاحب سے پوچھوں تو کیونکر پوچھوں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ صاحب کا مطلب اِس طرح بچوں کی کتابیں منگوانے سے کیا ہو سکتا ہے۔ غرض اسی کشمکش و پیچ میں صبح ہو گئی۔ کوئی سات بجے ہونگے کہ صاحب کا چپراسی آیا اور کہا کہ صاحب سلام بولتے ہیں۔ وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحب بیٹھے "مراۃ العروس" پڑھ رہے ہیں۔ سلام کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ صاحب نے کہا "مولوی صاحب آپنے ایسی مفید اور دلچسپ کتابیں لکھیں اور طبع نہ کرائیں۔ اگر کل آپ کا لڑکا مجھ کو نہ ملتا تو شاید کوئی بھی اِن کتابوں کو نہ دیکھتا، اور چند ہی روز میں بچّوں کے ہاتھوں یہ کتابیں پھٹ پھٹا کر برابر ہو جاتیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں "مراۃ العروس" کو سرکار میں پیش کر دوں۔ آج کل گورنمنٹ ایسی کتابوں کی تلاش میں ہے جو لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں داخل ہو سکیں۔" میں نے کہا "آپ کو اختیار ہے۔" یہ کہہ کر میں چلا آیا۔ صاحب نے وہ کتاب گورنمنٹ میں پیش کر دی۔ وہاں سے انعام ملا۔ یہاں شیر کے منہ کو خون لگ گیا۔ اوپر تلے کئی کتابیں گھسیٹ ڈالیں۔ جو کتاب لکھی اُس پر انعام، جو لکھا گیا پسند کیا گیا۔ غرض ہم مصنف بھی بن گئے اور ڈپٹی کلکٹر بھی ہو گئے۔

فتح

خوفناک جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ فوجیں جان پر کھیل کر حملوں پر حملے کر رہی تھیں۔ دونوں طرف کے بادشاہ اپنی اپنی فوج کو جوشیلے الفاظ سے ابھار رہے تھے۔ لحظہ بہ لحظہ صدہا سورما کام آرہے تھے لیکن اِس کی کسے خبر تھی۔ افادۂ قومی کے سامنے کسی مخصوص ہستی کی کون پروا کرتا ہے۔ یک بیک ایک تیر بادشاہ کے سینہ کے پار ہوا۔ اُس کا جسم بے حس و حرکت ہو گیا فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ ہزاروں سپاہی اِدھر اُدھر بھاگ نکلے لیکن بہتوں کو فاتح سپاہ نے جا گھیرا۔ وہ گرفتار کر لئے گئے حکم ہوا کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ جو سپاہی اپنے ہتھیار ڈال کر بادشاہ کے سامنے سربسجود ہوگا وہ قید کی زندگی سے آزاد کر دیا جائیگا۔ مفتوح فوج کے لئے یہ حکم باعثِ مسرت بھی تھا اور باعثِ حزن و ملال بھی۔ یہ حکم جہاں اُن کو امید کی جھلک دکھا رہا تھا۔ وہاں اُن کی

خودداری کو جو ٹھیس لگا رہا تھا اُس کا اندازہ کچھ وہ خود ہی کر سکتے تھے۔ لیکن کوئی چارۂ کار نہ تھا

فاتح بادشاہ کی فوج آراستہ تھی۔ شان و شوکت کا کیا کہنا۔ سپاہی زرق برق وردیوں میں قطار در قطار ہر دو جانب مؤدب کھڑے تھے۔ اور مفتوح فوج کا ایک ایک سپاہی سر جھکائے آہستہ آہستہ زمین بوسی کے لئے داخل ہو رہا تھا۔ سینکڑوں یہ ذلت گوارا کر کے آزاد ہو گئے۔

آخر میں ایک نوجوان کی باری آئی اُس کے چہرے پر خوف کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ سر اونچا کئے بادشاہ کے سامنے آیا۔ اُس کی صورت دیکھتے ہی بادشاہ کی تیوری پر بل آگیا۔ لیکن پھر بھی اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اے بہادر سپاہی جلد اپنا کام انجام دے اور آزاد ہو۔" اِدھر اُس کے آس پاس کے دونوں سپاہیوں نے بھی اُسے اشارہ کیا۔ "جلد ہتھیار ڈال دو۔ اور زمیں بوس ہو کر چلتے بنو۔" مگر اُس نوجوان کا سر ٹس سے مس نہ ہوا۔ بادشاہ اُس کی یہ حالت دیکھ کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا لیکن پھر بھی اُس نے ہنستے ہوئے کہا "اے بہادر طفل۔ جلدی کر۔ دیر نہ کر یہ تیرے حق میں مفید نہ ہوگا۔" اس نوجوان نے متانت کے لہجہ میں کہا "بادشاہ سلامت یہ آپ کا خیال ہے۔ میں اپنے ضمیر کے خلاف کسی کے آگے نہیں جھکتا۔ خوف سے کسی کے آگے سر جھکانا بزدلوں کا کام ہے۔ اور میں بزدل نہیں ہوں۔" بادشاہ کا چہرہ غیض و غضب سے تمتما اُٹھا۔ اُس نے کرخت آواز سے کہا "کیا بکتا ہے۔ ہوش میں آ۔ میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ اگر میرے حکم کی تعمیل میں ایک منٹ کی بھی دیر کی تو تیرا سر زمین پر لوٹتا نظر آئے گا۔

نوجوان جوں کا توں بے خوف و ہراس کھڑا تھا۔ اُس نے پھر اُسی اطمینان اور سنجیدگی کے لہجہ میں کہا "ایک بار نہیں ہزار بار میرا سر تن سے جدا کر دیا جائے۔ مگر میں شکست تسلیم نہیں کر سکتا۔ تمہارے آگے سر جھکا نہیں سکتا۔ شکست میرے لئے ناممکن ہے۔"

بادشاہ کو اور ضبط کی تاب نہ رہی۔ اُس نوجوان کو خبر بھی نہ ہونے پائی کہ ایک اشارہ میں جلادوں نے اُس کا کام تمام کر دیا۔

فتح و نصرت کا ہر طرف چرچا تھا جشن شادی کا موقع آیا۔ بادشاہ کا محل آراستہ کیا جا رہا تھا۔ فوج اپنی مرضی کے مطابق خوشیاں منا رہی تھی۔ بادشاہ نے ایسے دشمن پر فتح پائی تھی جسے وہ بہت دنوں سے زیر کرنے کی فکر میں تھا۔ در اصل اُس کو سب سے زیادہ خوشی ہونی چاہئے تھی۔ لیکن وہ اِس چہل پہل میں خاموش گوشۂ تنہائی کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ چُپ چاپ اپنے سونے کے کمرہ میں جا لیٹا۔ اُس نوجوان بہادر کی شجاعت اور دلیری کا نقشہ اب بھی اُس کی آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ اُس نے سرِ دربار اُس کا سر تو قلم کر ادیا لیکن اُس کے دل میں یہ خیال رہ رہ کر چٹکیاں لے رہا تھا۔ "فتح کا فخر میرے لئے عبث

ہے۔فتح میری نہیں ہوتی بہادری پر کوئی فتح پا ہی نہیں سکتا،

"سرسوتی"

أَأَنتَ رَبِّيَ

کیا تو میرا خدا ہے (قرآنِ مجید)

میں نے زمین سے پوچھا "کیا تو خدا ہے؟" زمین نے جواب دیا "نہیں"

میں نے سمندر اور اُس کی گہرائیوں سے پوچھا۔ اور انہوں نے کہا کہ ہم خدا نہیں ہیں جس کی تو تلاش کر رہا ہے"۔

میں نے ہوا کے جھونکوں اور تاروں بھرے آسمان سے پوچھا۔ مگر انہوں نے جواب دیا کہ "تو غلطی پر ہے۔"

میں نے چاند سورج اور ستاروں سے پوچھا مگر سب نے نفی میں جواب دیا۔

پھر میں نے اپنے جسم کے اعضا سے پوچھا "کیا تم مجھے خدا کی راہ بتا سکتے ہو؟" وہ یک لخت چیخ اُٹھے کہ اُسی نے تو ہمیں بنایا ہے۔"

آخر کار میرے دل نے گواہی دی "تیرا خدا اور تیری روح کا مالک تجھی میں تو ہے"۔

اگسٹائن

"نظام کالج میگزین"

شمسی اور قمری سال

سنہ وسال کے حساب کے بغیر دنیا میں کسی متمدن قوم کا کام نہیں چل سکتا۔ انسان کا فطری سال شمسی ہے اور فطری مہینہ قمری ہے۔قمری مہینوں کے فطری ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مہینے کے لئے شاید دنیا کی ہر زبان کا لفظ چاند کے نام سے مشتق ہے۔عربی میں مہینہ کو شہر کہتے ہیں۔کلدانی میں سہرا چاند کا نام تھا۔فارسی کا ماہ۔ہندی کے ماس اور چاند دونوں کا مرادف ہے۔انگریزی کا منتھ صاف صاف مُون کا فرزند ہے۔اِس سے بھی واضح دلیل یہ ہے کہ مہینوں کے ایام ساری دنیا میں ہفتوں پر منقسم ہیں۔وجہ یہ ہے کہ چاند کی حالتوں میں ہفتہ وار نمایاں امتیاز ہوتا رہتا ہے۔

فطری سال کے شمسی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ "سال" کے ناموں کو ہر زبان میں نہیں تو کم از کم عرب اور ہندوستان کی بولی میں بارش سے خاص تعلق ہے۔ہندی کا برش اِس کی برشا کال سے خاص مناسبت رکھتا ہے۔عربی کا عام (برس) اگرچہ بارش کے معنے نہیں دیتا مگر عوم (تیرنا) کو پانی سے خاص تعلق ہے۔یہود کا پہلا مہینہ نیسان ہے اس کا قدیم نام ابیب

تھا، (ع ب ب) کو سامی زبانوں میں پانی سے خاص ربط ہے۔ چنانچہ اباب پانی ہی کو کہتے ہیں۔ ابرنیسان ہماری فارسی زبان میں بہت مشہور ہے۔ سال کے بارہ مہینے فرض کرنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ دونوں برساتوں کے درمیان عموماً بارہ ہی مہینے گزرا کرتے ہیں۔

"معارف"

شعر کی وجہ تسمیہ

کلام موزوں کو شعر کہنے کی وجہ ابو عبداللہ قاسم بن سلام بغدادی امام لغت ونحو وتاریخ حسب ذیل بیان کرتے ہیں:-

یعرب بن قحطان بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام کی عمر چارسو سال کی تھی، یعرب کہے جانے کی وجہ یہ تھی کہ طوفانِ نوح کے بعد زبانِ عربی اُن کی ذات سے منتشر اور شائع ہوئی، اساجع عرب کے اندر اثنائے کلام میں موزوں مصرعے خود بخود چُست ہوجاتے ہیں۔ یعرب نے اُس کو اپنی طباعی اور فطانت سے دریافت کیا۔ اور موزوں غیر موزوں میں فرق پیدا کرکے یہ دو شعر کہے۔

ما الخلق الا لاب و ام   حذین جهل او حذین علم

مابین خلق رائع وحلم   فی مرج طوراً وطوراً هم

ایک مجمع میں جب اکابرین قوم جمع تھے تو یعرب نے یہ دونوں شعر پڑھے۔ چونکہ اُن لوگوں نے کبھی کلام موزوں سنا نہ تھا، کہنے لگے ماھٰذا الترتیل الذی کنا شعرنا بك تقوله یعنی یہ کس قسم کی ترکیبِ کلام ہے کہ ہم نے تمہاری زبان سے پہلے نہیں سُنی۔ یعرب نے جواب دیا

وانا ایضاً ماشعرت به من نفسی قبل یومی هذا میں نے بھی اس سے پہلے کبھی ایسا کلام نہیں کہا

چونکہ یعرب نے بغیر تعلیم وتعلم کے کلام موزوں محسوس کرلیا اس لئے اس کا نام شعر ہوا۔ ایسے کلام کے مصنف کا نام شاعر رکھا گیا اور کلام کا نام شعر۔

"نگار"

تبصرہ

جمالِ ہمنشیں۔ خاتونِ اکرم صاحبہ مرحومہ کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مرحومہ کی ادبی قابلیت نسوانی دنیا میں مسلّمہ ہے۔ گو انہوں نے آغازِ شباب ہی میں انتقال کیا لیکن اُن کے خیالات میں پختگی اپنی پوری شان سے جھلک رہی ہے۔ ان کے مضامین متانت اور سنجیدگی کی جان ہیں۔ اُن کے اندازِ تحریر میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ فلسفۂ زندگی کو اِس خوبی سے حاصل کیا ہے کہ بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ فانی زندگی۔ تغیراتِ زندگی۔ نیرنگیٔ زمانہ وغیرہ مضامین نہایت عمدہ ہیں۔ مسلمان لڑکیوں کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیئے۔ اور اِن سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ کتاب کی ظاہری شکل و صورت بھی نہایت دلفریب ہے، اعلیٰ درجہ کے آرٹ کاغذ پر چھپی ہوئی ہے حجم ۸۸ صفحات اور قیمت بارہ آنے ہے۔ دفتر عصمت دہلی سے ملتی ہے۔

دشینت اور شکنتلا۔ یا مثنوی سحر۔ ملک کے مشہور ہندو ادیب جناب اقبال ورما صاحب سحر ہتگامی کی دلکش تصنیف ہے۔ شکنتلا کا افسانہ کالیداس کی شاعری کا شاہ کار ہے۔ اِس سے پہلے بھی بعض شعرا نے شکنتلا کے اردو تراجم نظم میں کئے ہیں مگر انہوں نے کالیداس کی خصوصیات کو نظر انداز کر کے اُسی روش کو اختیار کیا ہے جو قدیم شعرا نے مثنوی کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ اِسی لئے اُن سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ قصہ سنسکرت سے ماخوذ ہے، بلکہ ہندو تخیل اور معاشرت کو چھوڑ کر اُسے بالکل ایک ایرانی رنگ دے دیا ہے۔ اِس کے برخلاف حضرتِ سحر کے مرد و زن۔ گل بوٹے۔ چرند پرند۔ اداب و اخلاق۔ رسم و تمدن سب ہندوستان کے ہیں۔ اور اُن کی اصلیت اور دلفریبی میں مطلق فرق نہیں آیا۔ امید ہے کہ ہمارے ناظرین اِس محنت کی داد دیں گے۔ قیمت آٹھ آنے ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

معارف النغمات اس بیش بہا دلچسپ کتاب میں نغمات ہند کے عملی علمی اصول مفصل طور پر بیان کئے ہیں۔ یہ اردو میں اپنی نوع کی پہلی جامع کتاب ہے۔ شروع میں ہندوستانی موسیقی کی مختصر تاریخ ہے۔ اُس کے بعد زمانۂ حال کی طرزِ موسیقی پر روشنی ڈالی ہے اور قدیمی موسیقی سے اُس کا موازنہ کیا ہے۔ حصۂ اوّل سُر ادھیائے میں موسیقی سے بحث کی ہے۔ اور حصہ دوم راگ ادھیائے میں راگوں اور راگنیوں کو ایسی وضاحت سے الگ الگ قلمبند کر دیا ہے کہ تھوڑی سی رہنمائی سے باجے یا ستار پر اُنہیں بجایا جا سکتا ہے۔ دوسری جلد میں ہندوستان کے مشہور ماہرینِ موسیقی کی یادگار چیزیں جمع کی گئی ہیں۔ راجہ محمد نواب علی خاں صاحب تعلقدار اکبر پور ضلع سیتا پور نے اس کتاب کی تالیف سے اردو زبان اور موسیقی کی ایک بھاری خدمت ادا کی ہے۔ جو اُنہیں کا کام تھا

قیمت پانچ روپے فی جلد جنابِ مصنف سے ذیل کے پتے سے طلب فرمائیں "کورٹ ویکیسل منصل قیصر باغ لکھنؤ"

اٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا

یادگارِ عالمِ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر - بشیر احمد - بی، اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر { حامد علی خاں - بی، اے
منصور احمد

فہرستِ مضامین

نمبر ۲	بابت ماہِ فروری ۱۹۲۸ء	جلد - ۱۳

تصویر:- قدیم مشرقی مصوری کا ایک نادر نمونہ

جہاں نما

دنیا کی سب سے بڑی کتاب

انسان کے معمولی قد سے بھی بڑی یہ ایک اٹلس ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ طول اور عرض کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ یہ اٹلس امسٹرڈم کے تاجروں کی طرف سے چارلس دوم شاہِ انگلستان کو بطورِ تحفہ دی گئی تھی اور آج کل لنڈن کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ نقشوں پر عبارت لاطینی حروف میں لکھی گئی ہے اور نقشوں کی پیمایش اُس زمانے کے لحاظ سے تعجب انگیز طور پر صحیح ہے۔ یہ تحفہ چارلس کو اُس وقت ملا تھا جب برطانیہ کی شخصی حکومت کو زوال ہُوا اور ندرلینڈز میں اُسے دوستانہ پناہ ملی +

جاپانی رسم الخط کی تبدیلی

جاپانی زبان کے رسم الخط میں ایک مکمل انقلاب کا اندیشہ ظاہر کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ قدیم طرزِ تحریر تعلیم کے لئے سدِ راہ سمجھا گیا ہے۔ جامعۂ ٹوکیو کے استاد علم اللغات نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ملکی رسم الخط میں بچے چھ سال کی عمر سے پہلے لکھ پڑھ نہیں سکتے حالانکہ لاطینی حروف کو وہ چار برس کی عمر سے بھی پہلے بڑی آسانی سے پہچاننے لگ جاتے ہیں وزارتِ تعلیم نے ایک مجلس اس امر پر غور کرنے کے لئے قایم کی ہے جو تحقیقات کے بعد جاپانی حروف کی بجائے لاطینی حروف کو قبول کرنے کے متعلق اپنا فیصلہ سنائے گی۔ اگر جاپانی حروفِ ابجد کی خصوصیات اور مشکلات کو دیکھا جائے تو اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ لاطینی حروف کے استعمال سے ترقیِ تعلیم میں ایک انقلاب رونما ہو جائے گا +

بے اندازہ دولت

کچھ دن ہوئے حکومت ترکی نے سٹاک ہالم کے ایک جوہری مسٹر جین جانسن کو دولتِ عثمانیہ کے خزانوں کی قیمت کا تخمینہ کرنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ مسٹر جانسن کا بیان ہے کہ میں سابق سلطان کے روایتی خزانوں کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ میں نے اس سے پہلے جواہرات کا ایسا نادر و نایاب مجموعہ کبھی نہیں دیکھا۔ نیلم۔ یاقوت، ہیرے اور موتیوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ بعض ہیرے غیر معمولی طور پر سُرخ اور نیلے رنگ کے ہیں۔ ایک

خنجر ہے جس کا سارے کا سارا دستہ نیلم کے صرف ایک ٹکڑے سے تراشا گیا ہے ۔

بعض موتی حیرت انگیز طور پر بڑے ہیں، خصوصاً وہ جو سلطان کی ایک عجیب وغریب قسم کی دستار پر لگے ہوئے ہیں ۔ قیمتی اشیاء کے اس حیرت انگیز مجموعہ میں سب سے بے بہا سونے کی وہ کرسی ہے جسے بیس ہزار موتیوں اور یاقوت ونیلم کے کئی ہزار ٹکڑوں سے مزیّن کیا گیا ہے ۔ دنیائے مشرق کا یہ بے مثال خزانہ جس کے متعلق سینکڑوں افسانے مشہور ہیں قسطنطنیہ کے شاہی حرم میں محفوظ ہے ۔ اور اگر کوئی اس کو دیکھنا چاہے تو اُسے متعدد دروازوں میں سے گزرنا پڑتا ہے جن کی پاسبانی مسلح سپاہی کرتے ہیں ۔ آخری دروازہ کانسی کا بنا ہوا ہے اور اس قدر بوجھل ہے کہ اِس کے کھولنے کے لئے تقریباً آٹھ آدمیوں کی طاقت درکار ہے ۔

ایک قابل ذکر ہندوستانی فلم

ہندوستان کی تہذیب ، تاریخ اور افسانوں کو سینما کے ذریعہ سے دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے آج تک جتنی کوششیں بروئے کار لائی گئی ہیں اُن سب سے بڑھ چڑھ کر ایک اور کوشش آج کل زیرِ غور ہے جو غایت درجہ دلچسپ ہے یہ فلم ہندوستان میں تیار کی جائے گی جس کا قصّہ ایک ہندوستانی تصنیف ہوگا اور تمام ایکٹر بھی ہندوستانی ہوں گے صرف اُس کے تیار کرنے میں اہتمام ایک انگریز مسٹر بروس ولف کا ہوگا جو نگرانی کے لئے ہندوستان آرہے ہیں ۔

افسانہ جس کا نام "شیراز" ہے، مسٹر نرنجن پال کی تصنیف ہے ایکٹروں میں مشہور ہندوستانی ایکٹر مسٹر ہمنسورائے اور دوسرے وہ تمام ایکٹر ہوں گے جنہوں نے "نورِ ایشیا" کے خوبصورت اور عظیم الشان فلم میں حِصّہ لیا تھا۔ "شیراز" وہ شخص ہے جس نے باوجود بصارت سے محروم ہونے کے "تاج محل" کا خاکہ تیار کیا ۔ دوسری قابلِ ذکر نقلیں شہنشاہ شاہجہان اور اُس کی بیگم ممتاز محل کی ہوں گی ۔

جرمنی کی یو۔ ایف ۔ اے کمپنی اس فلم کو یورپ ، مصر، فلسطین اور شام میں تقسیم کرے گی اور برٹش انسٹرکشنل فلمز تمام مقبوضاتِ برطانیہ میں پھیلائینگی ۔ اس لئے یقین کیا جاتا ہے کہ یہ فلم امریکا کے سوائے ہر جگہ پیش ہو سکے گی ۔

گھڑیوں کے ڈائل

گھڑیاں بنانے والوں میں مشہور ہے کہ جیسی گھڑیاں آج کل رائج ہیں اس قسم کی پہلی گھڑی ہنری وِک نے

۱۳۷۰ء میں شاہ فرانس چارلس پنجم کے لئے بنائی تھی جس کا لقب دانشمند تھا۔ اور چارلس حقیقت میں بہت سی باتوں میں دانش مند ثابت ہوا۔ اُس نے انگلستان سے ملک کا وہ بہت سا حصہ واپس لے لیا جسے ایڈورڈ سوم نے فتح کیا تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے فرانس کے لئے اور بھی بہت سے مفید کام کئے۔ گو اُس کی ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ نہ کی گئی تھی پھر بھی اُس کی عقل و دانش کی شہرت تھی اور اس شہرت کو قائم رکھنے کے لئے وہ ضروری سمجھتا تھا۔ کہ لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ وہ کتابی علم سے بے بہرہ ہے۔ اس معاملہ میں وہ حساس بھی بہت واقع ہؤا تھا۔

بادشاہ نے ہنری وک سے کہا "گھڑی وقت تو ٹھیک دیتی ہے۔ لیکن" ——— وہ چاہتا تھا کہ اُس میں کوئی نقص بتائے مگر یہ ایک ایسی چیز تھی جس کے متعلق اُسے کوئی واقفیت نہ تھی "اس کے ہندسوں میں ایک غلطی ہے"۔

وک نے پوچھا "حضور کہاں"؟

بادشاہ نے کہا "اس کے چار کے ہندسے کی بجائے چار ایکے ہونے چاہئیں"۔

وک نے کہا "حضور آپ اس معاملہ میں غلطی پر ہیں"۔

بادشاہ نے کڑک کر کہا "مجھ سے کبھی غلطی نہیں ہوئی اس کو مٹا دو اور صحیح کر کے لکھو!"

بادشاہ کا حکم تھا، غلطی درست کر دی گئی اور اُس دن سے آج تک ۴ کے ہندسے کو بجائے IV کے IIII لکھا جاتا ہے +

امریکا کی فلک بوس عمارات

امریکا میں بعض عمارات اس قدر بلند ہیں کہ انہیں فلک بوس کہنا بے جا نہ ہوگا۔ نیویارک کی مشہور عمارت ایکوی ٹیبل بلڈنگ کی چھ منزلیں ہیں۔ اس میں ہر وقت تقریباً بارہ ہزار آدمی رہتے ہیں۔ اور ہر روز کم از کم ایک لاکھ ستائیس ہزار آدمی اس میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

۱۹۱۳ء کی خوفناک آتشزدگی کے بعد یہ ۱۹۱۵ء میں دوبارہ تعمیر ہوئی تھی۔ اُس وقت سے لے کر آج تک پھر اس میں کوئی حادثہ رونما نہیں ہؤا۔ اس میں ترپستھ لفٹ لگے ہوئے ہیں جن کے ذریعہ سے روزانہ بانوے ہزار انسان اوپر چڑھتے اور نیچے اُترتے ہیں اور یہ لفٹ اس چڑھنے اور اترنے میں ایک سال کے اندر دو لاکھ پچھتر ہزار میل کا فاصلہ طے کر لیتے ہیں۔

اس عمارت کی آبادی انگلستان کے قصبہ وارک کے برابر ہے اور یہ دو کروڑ ساٹھ لاکھ مکعب فٹ جگہ گھیرے

ہوئے ہے۔ اس کے مکینوں کو ہر روز تریسٹھ ہزار خطوط اور پارسل موصول ہوتے ہیں۔ اور اٹھاسی ہزار پارسل اور خطوط باہر بھیجے جاتے ہیں۔

اس کی پانچ ہزار کھڑکیاں ہیں اور دس ہزار دروازے۔ اور بدرجۂ اقل پندرہ ہزار بجلی کی بتیاں اس میں لگی ہوئی ہیں ٭

مسیح الملک حکیم اجمل خان کی وفاتِ حسرت آیات

ماہِ جنوری کا "ہمایوں" طبع ہو چکا تھا جب ہمیں خبر ملی کہ حکیم اجمل خاں اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھار گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اس صدمۂ جانکاہ کا اثر صرف اُن کے اعزہ ہی تک محدود نہیں بلکہ اس میں تمام عالمِ اسلام اور ہندوستان کی متحدہ قومیت یکساں طور پر شریک ہے۔ مسیح الملک کی وفات کسی ایک فرد قوم کی وفات نہیں۔ اُن کی شخصیت کے اُٹھ جانے سے ہم نے ایک عظیم الشان طبیب، ایک زبردست رہنمائے قوم، ایک حقیقی محبِّ وطن اور ایک بے مثال ادیب کھو دیا۔

طبِّ یونانی جو بظاہر سکرات کے عالم میں تھی مرحوم ہی کی مسیحائی سے از سرِ نو زندہ ہوئی۔ طبیہ کالج دہلی اُن کی مہتمم بالشان خدمات کی روشن ترین مثال ہے جو محض اُن کے عدیم النظیر ایثار پر قائم تھا اور رہے گا۔ مسیح الملک کے یونانی دواخانے کا تمام منافع جو ہر سال لاکھوں روپے ہوتا ہے اس کالج کی سُود و بہبود کے لئے وقف ہے۔

قوم کو اُن کی وفات سے ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ اور ممکن نہیں کہ اُن کی جدائی کا داغ کبھی ہمارے دلوں سے مٹ سکے ٭

عالمِ خیال

کس کے خوابیدہ تخیّل کی تب و تاب ہوں میں
جو نہ شرمندۂ تعبیر ہو وہ خواب ہوں میں

جو لبِ ہستیٔ مطلق پہ بن آئے نہ رہا
غمِ ہستی کا وہی نالۂ بے تاب ہوں میں

چشمِ عنقا سے جو انجامِ دو عالم پہ گرا
وہی آنسو ہوں وہی گوہرِ نایاب ہوں میں

ذرّہ ذرّہ میں عیاں ہے غمِ پنہاں میرا
سوزِ خورشید ہوں داغِ دلِ مہتاب ہوں میں

کیا کرے جانے یہ آزادگی و خود بینی؟
جس کا بندہ ہوں اب اُس سے بھی عنان تاب ہوں میں

آہ کس کس نے زمانے میں مٹایا مجھ کو
ہمہ تن شکوۂ بے مہریٔ احباب ہوں میں

حامد علی خاں

مبادئ سیاسیات

تمہید

سیاسیات کی تعریف اور اُس کا تعلق دیگر ہم جنس علوم کے ساتھ

سیاسیات کی اہمیت۔ آج کل کے زمانہ میں جب تعلیم اور تعلّم کی ہر طرف ترقی نظر آتی ہے اور جب چند در چند اسباب کی بنا پر امیر اور غریب، بڑا اور چھوٹا، عورت اور مرد، سب کے سب معاملاتِ عامہ میں دلچسپی لینے لگے ہیں جب روز نئے نئے اخبارات اور رسالے نمودار ہوتے ہیں، جب دنیا میں طرح طرح کی لڑائیوں اور جھگڑوں معاشری اور معاشی بین الاقوامی تغیرات اور انقلابات کا ذکر سننے میں آتا ہے، تو سب سے زیادہ جو لفظ ہمارے گوش زد ہوتا ہے وہ لفظ سیاسیات ہے۔ اور جو اصطلاحیں اور نو ساختہ الفاظ ہم سنتے ہیں اُن میں اکثر کوئی نہ کوئی سیاسی پہلو ضرور رہتا ہے۔ یوں تو کسی علم یا کسی اصطلاح، مادی شے یا غیر مادی تخیل کی تعریف یا تعارف اس سے بھی ضروری ہے لیکن جب چند الفاظ ایسے سننے میں آئیں جو زباں زدِ خاص و عام ہوں تو اُن کی تعریف از بس لازمی ہو جاتی ہے۔ عوام کے تخیل میں جو معنے کسی خاص لفظ کے ہوتے ہیں وہ اکثر و بیشتر اصل مفہوم سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں، لہذا جب کسی علم یا فن کی ماہیت دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو تجسس کرنے والے کا اول ترین فرض یہ ہے کہ پہلے صحیح مفہوم خود سمجھ لے اور پھر دوسروں پر ظاہر کرے۔

انسان کی اجتماعی حیثیت۔ سیاسیات میں ایک مخصوص عمرانی ادارہ سے بحث کی جاتی ہے جس کو مملکت کہتے ہیں۔ انسان کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک انفرادی حیثیت یعنی وہ حیثیت جو اس کو بطور ایک فردِ واحد کے حاصل ہے اور دوسرے اجتماعی حیثیت یعنی وہ حیثیت جو اُسے بطور رُکنِ معاشرۃ کے حاصل ہے جس طرح انسان اپنی انفرادی حیثیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسی طرح یہ بھی قطعاً ناممکن ہے کہ وہ ایسی زندگی بسر کرے جس میں دیگر افراد کو دخل نہ ہو علاوہ خاندانی تعلقات کے جو ہر انسان کو اپنے ماں باپ یا اپنے بیوی بچوں سے ہوتے انسانی فطرت اس کی مقتضی ہے کہ وہ دیگر افراد سے بھی گہرے تعلقات پیدا کرے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب رابنسن کروسو کو پہلی مرتبہ جزیرے میں

ایک انسان کا پاؤں نظر آیا ہوگا۔ تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی ہوگی، گو اُس نے اپنی زندگی کچھ ایسے قالب میں ڈھال لی تھی جس میں وہ انسانوں کی جگہ اپنے طوطے اور بکری ہی سے دل بہلایا کرتا تھا، اور گو اُس کو قطعی معلوم نہ تھا کہ جس شخص کے پاؤں کا نشان بنا ہؤا ہے وہ کون ہے۔ لیکن وہ محض انسان ہونے کی وجہ سے اس جستجو میں لگ گیا کہ اُس دوسرے انسان کا فوراً پتا لگائے۔ بہرحال ایک شخص کو نہ صرف اپنی ذات کے متعلق فرائض و حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ بلکہ رکنِ معاشرہ کی حیثیت سے بھی وہ اپنے اقوال و افعال کا ذمہ دار ہے۔

جہاں تک محض انفرادی ذمہ داری کا تعلق ہے۔ یعنی جہاں تک انسان صرف اپنی ذات کی خدمت کرتا ہے۔ کھاتا ہے، پیتا ہے۔ آرام کرتا ہے، وہاں تک اُس کا علمِ سیاسیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ سیاسیات کا میدان صرف اُس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان کا ذکر بطور رکنِ معاشرہ کے کیا جائے۔

ترتیب و تنظیم ۔ معاشرت کے قیام اور استحکام کے واسطے کسی نہ کسی قسم کی تنظیم و ترتیب کی ضرورت ہے۔ اگر تنظیم و ترتیب نہ ہوگی۔ تو انسانی مجموعے میں توحد کی کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ تہذیب کے معنے یہی ترتیب کے ہیں اگر نام نہاد معاشرہ میں کسی قسم کی تنظیم نہ ہوگی تو وہ مجموعۂ افراد سے زیادہ وقعت نہیں رکھے گا۔ اور اُس میں اجتماعی کیفیت مفقود ہوگی۔ اس اجتماعی کیفیت کے واسطے یہ لازم ہے کہ اُس میں ایک شخصیت ایسی ہو (خواہ وہ شخصیت مفرد ہو یا مرکب) جس کے احکام ہر ایک فرد عام طور پر مانے۔ اور اگر کوئی شخص ایسا ہو جو ماننے سے انکار کرے تو اس کو مجبور بھی کیا جا سکے۔ گویا کہ اس شخصیت کا حکم ہی قانون کا مرتبہ رکھتا ہو۔ اس منظم جماعت کے قیام کا انحصار کلیتہً اس اصول پر ہوگا۔ معاشرۂ سیاسی کی کیفیت ایسے وقت ممکن ہے جب اس میں ایک حاکم شخصیت اور محکوم جماعت ہو اور اس کے واسطے ایک خاص قسم کی تادیب کا ہونا بھی لازمی ہے جس کے بغیر حقیقی سیاسی زندگی کا وجود ناممکن ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ادارہ جس میں ایک شخصیت کو کلیتہً یہ حق حاصل ہو کہ وہ اپنے من مانے احکام صادر کرے، اور کوئی شخص انہیں تسلیم کرنے سے منکر ہو تو اُس کو جو جی چاہے سزا دے، ایسے ادارے میں آزادی کا فقدان ہوگا۔ لیکن ہم کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب تک ہر ایک فرد ہر دوسرے فرد کی خواہشات اور رجحانات و میلانات کا کماحقہٗ خیال نہ رکھے گا اُس وقت تک اُس کی خواہشات، رجحانات اور میلانات کی اسی طرح دیگر افراد بھی پروا نہ رکھیں گے۔ جس کے باعث ملک میں ابتری اور کشاکش پھیل جائے گی۔ دوسروں کی آزادی کا خیال رکھنے کے یہ معنے ہیں کہ ہر ایک فرد ایک خاص حد تک پابند ہو جائے۔ اور منظم پابندی کا نام ہی تادیب ہے۔ اسی لئے تنظیم اور ترتیب اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک پابندی اور تادیب نہ ہو اور جس طرح انسانی آبادی مملکت کے قیام

کے لئے لازمی اور ضروری ہے اسی طرح یہ عنصر بھی اس کا جزو لاینفک ہے۔ یہ نظم تا دیبی کیفیت ہر ایک مملکت میں حکومت کے ذریعہ سے قایم کی جاتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت چند احکام صادر کرتی ہے۔ جس کو قانون کہتے ہیں اور ان احکام کی پیروی بالجبر لوگوں سے کراتی ہے۔

سیاسیات کی تعریف اور اقسام۔ بہرحال اس نسبتاً پیچیدہ ادارہ یعنی مملکت سے جس علم کا تعلق ہے اور جس میں حکم دینے والے اور محکوم کے باہمی تعلقات کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں اگر حکومت ایک مرکب جماعت ہو تو اس کے اجزا کے مابین تعلق اور اگر حاکم ایک فرد واحد ہو تو اس کے فرائض و حقوق کا بیان کیا جاتا ہے اور جس میں فی نفسہٖ مملکت کے حقیقی مقاصد اور اُن کے حصول کے طریقوں پر غور کیا جاتا ہے اس علم کو سیاسیات کہتے ہیں۔

اس تعریف کے دو پہلوؤں میں تفریق بالکل عیاں ہے۔ ایک طرف تو سیاسیات میں مجرد مملکت کی ابتدا اس کے خصوصیات، اس کے مقاصد، نیز اصولِ حکومت و اصولِ مدافعت پر بحث ہوتی ہے۔ اور دوسری جانب اس امر پر غور کیا جاتا ہے کہ مختلف ممالک اور مختلف زمانوں میں کس قسم کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ اُن کے مقاصد کیا تھے۔ اُن مقاصد کے حاصل کرنے کی کیا تدبیریں اختیار کی گئیں۔ آیا تصوری یا مثالی مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا یا اُن سے گریز کیا گیا، آج کل مختلف مملکتیں کس طرف جا رہی ہیں۔ اور اُن کا راستہ سیدھا ہے یا اُن میں کسی قسم کی کجی پائی جاتی ہے۔ ان دونوں تخیلات کے درمیان بہت بڑا بُعد ہے، ایک میں نفسِ مملکت پر بلا کسی خاص ملک کے حوالہ کے بحث کی جاتی ہے۔ اور دوسرے میں نتائج کا واقعات پر انطباق کیا جاتا ہے۔ ہم ان کو سیاسیاتِ نظریہ اور سیاسیاتِ منطبقہ کہیں گے۔

طرزِ استدلال۔ اسی سلسلے میں یہ بیان کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیاسیات پر غور کرنے اور سیاسی نتائج اخذ کرنے کے متعدد طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ جتنے علوم دنیا میں اس وقت تک معلوم ہوئے ہیں اُن کی تقسیم دو شقوں میں ممکن ہے۔ اُن میں سے وہ علوم جن سے تجربہ کے بعد نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ یعنی وہ جن کا تعلق ہیولاتِ قدرتی و طبعی سے ہے اُنہیں علومِ متعارفہ کہتے ہیں۔ لیکن جس علم کا تعلق انسان کی دماغی کیفیات، عادات و تعلقات سے ہے اُس میں کسی قسم کے ارادی تجربہ کی گنجائش نہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا عمل بنایا جائے جس میں ارادتاً انسانی فطری خصوصیات کا آزادانہ تجربہ کر کے استناج کیا جا سکے۔ جب تجربہ کا دروازہ مسدود ہو گیا تو دو ہی عملی طریقے باقی رہتے ہیں ایک یہ کہ تجسس کرنے والا خود اپنے دماغ پر زور ڈال کر نفسِ مملکت کے آغاز اس کے ارتقا اور اس کے مقاصد پر غور کرے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ دنیا کے گذرے ہوئے اور موجودہ دساتیر کا مقابلہ کر کے ایسے نتائج اخذ کرے جو اس کو سیاسی تحقیقات میں مدد دے سکیں۔

مفصلہ بالا بیان سے خود بخود اس اعتراض کا جواب مل جائیگا جو بعض مرتبہ سیاسیات پر کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ

سیاسیات کو مدون علم کا رتبہ حاصل نہیں۔ اگر مدون علم کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح ریاضی و طبعیات و دیگر ہم جنس علوم میں ہم چند اشیا پر ایک خاص عمل کر کے چند عالمگیر نتائج پر پہنچ جاتے ہیں تو یقیناً سیاسیات کو مدون نہیں کہا جا سکتا۔ انسانی عادات و اطوار دماغی کیفیات یا فطری خواص، جغرافی اثرات اور تاریخی روایات میں اتنا عظیم الشان تنوع پایا جاتا ہے کہ اِن کے متعلق کسی کلیّہ کا قیام ناممکن ہے۔ جو سیاسی ادارہ ایک قوم کے لئے مفید ہوگا وہ ممکن ہے کہ دوسری قوم کے لئے مضر ہو۔ اور اغلب ہے کہ اتنا مفید نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نہایت ممتاز سیاسیین سیاسی استدلال کے تاریخی یا مقابلتی طریقے کو بے کار سمجھتے ہیں۔ تاریخی طرزِ استدلال تو وہ ہے جس میں ایک ہی ملک یا ایک ہی قوم کی درجہ بدرجہ سیاسی ترقی اور مختلف طرز ہائے حکومت پر جو اِس ملک میں قائم ہوئے غور کیا جائے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس قوم یا ملک کے سیاسی مقاصد کیا سے کیا ہو گئے اور اِن مقاصد کی کس حد تک تکمیل کی گئی۔ یہ طرزِ استدلال درحقیقت مقابلتی طرز کا ایک شعبہ ہے جس میں ایک ہی ملک کے مختلف زمانوں کے طرز ہائے حکومت اور مختلف ممالک کے موجودہ دساتیر کا مقابلہ کر کے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ کسی خاص ملک یا کسی خاص حصۂ دنیا کی سیاسی روش کیا ہے۔ اور اس کو مدِنظر رکھ کر آیندہ کی بابت کوئی خیال قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن علما نے اس طرزِ استدلال کی تنقید کی ہے اُن کا قول ہے کہ یہ طریقہ نہایت مغالطہ آمیز ہے۔ مقابلہ ہم جنس اشیا یا ادارات کا کیا جاتا ہے غیر جنس کا نہیں اور جب مکان یا زمان میں اصولی تبدیلی پیدا ہو گئی تو پھر مقابلہ کیسے ممکن ہے۔ اسی بنا پر بعض کا خیال ہے کہ جب تک کوئی مجموعۂ افراد تمدن کی ایک مخصوص حد تک نہ پہنچ جائے اُس وقت تک اُس کے افعال دائرۂ سیاسیات میں نہیں آ سکتے اور اُن سے کوئی سیاسی استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ غالبیّت دونوں اصولوں میں موجود ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ زمان یا مکان کا لحاظ کئے بغیر محض مقابلے یا کسی اور طرزِ استدلال کے ذریعہ سے ایسے کلیّے قائم کئے جا سکتے ہیں جو ہر ایک حالت پر جاری ہوں یقیناً وہ غلطی پر ہیں، اسی طرح بنی نوعِ انسان کی ایک خاص مجموعی حیثیت ہے، اور اُس کے ایک حصّہ کے سیاسی تجربات سے یقیناً دوسرا حصّہ فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

تاریخ سے تعلق ۔ یہ بحث ہمیں ایک دوسرے موضوع کی طرف لے جاتا ہے یعنی علمِ سیاسیات کا دیگر ہم جنس علوم کے ساتھ کیا تعلق ہے یوں تو مختلف مصنفوں نے اس مبحث پر بہت کچھ طبع آزمائیاں کی ہیں اور سیاسیات کا تعلق علومِ متعارفہ مثلاً علمِ ہندسہ۔ ریاضی، کیمیا اور طبعیات تک سے بتایا ہے۔ لیکن اختصار کو مدِنظر رکھ کر یہاں اس کا تعلق محض ہم جنس علوم سے دکھایا جائے گا۔ مفصلۂ بالا بیان سے سیاسیات کا تعلق علمِ تاریخ کے ساتھ تو معلوم ہو گیا ہوگا۔ ایک بہت بڑے فرانسیسی سیاسی کا قول ہے کہ تاریخ انسانی زندگی کا علم ہے[1] اور اسے سیاسی استدلال میں

---

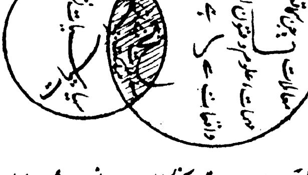
[1] موسیو دے لاندر M. Deslandres جن کے مقولے کو پروفیسر جے۔ ڈبلیو گارنر J. W. Garner نے اپنی کتاب "تمہید سیاسیات" باب ۱ میں نقل کیا ہے۔

اولین رتبہ حاصل ہے۔ یہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ علومِ متعارفہ اور عمرانی علوم اس لحاظ سے مختلف ہیں اُن کے لئے کوئی معمل یا تجربہ خانہ تیار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ہم مجبور ہیں کہ بنی نوعِ انسان کے قدیم تجربوں ہی سے فائدہ اٹھائیں اور تاریخ تجربہ خانہ یا معمل کی اس کمی کو پورا کرتی ہے وہ بے حد و بے شمار واقعاتِ انسانی، احساسات، دوستیوں اور دشمنیوں، جنگ اور صلح، عروج اور زوال، علمی و فنی ترقی کا ایک ناپیدا کنار بحرِ ذخار ہے، اور نہ صرف عالمِ عمرانیات کو بلکہ جتنے علوم دنیا میں ہیں سب کے محققوں کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑتی ہے۔ سیاسیات بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں اور بہت سے سیاسی کلیات ایسے ہیں جو مختلف ممالک کے دستوری تغیر و تبدل اور نظم و نسق کے انقلابات سے منتج کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ کل تاریخ سیاسیات ہی ہے یا کل سیاسیات تاریخ سے ماخوذ ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں ایک طرف نظری سیاسیات میں ہمیں تاریخ سے بہت ہی کم مدد ملتی ہے۔ وہاں دوسری جانب سیاسی استدلال کے لئے اکثر تاریخی واقعات بیکار ثابت ہوتے ہیں اور سیاسی محقق کو صرف ان ہی واقعات پر اکتفا کرنا پڑتا ہے جو ترتیبِ حکومت، اور تنظیمِ مملکت کے متعلق ہوں[۱]

معاشیات سے تعلق۔ سیاسیات کا تاریخ سے جس قدر لگاؤ ہے اُس سے شاید کچھ ہی کم سیاسیات اور معاشیات کا تعلق ہے۔ جس طرح سیاسیات میں حاکم و محکوم کے باہمی ربط پر بحث کی جاتی ہے اُسی طرح معاشیات کا اُن کے کسبِ معاش، کھانے پینے، داد و ستد، لین دین، درآمد و برآمد، لگان اور مال گذاری سے سروکار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں۔ یہاں تک کہ معاشیات کے ابتدائی مدارج میں اس علم اور سیاسیات میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی تھی

---

[۱] تاریخ اور سیاسیات کا باہمی تعلق مفصلہ ذیل شکل سے بخوبی ظاہر ہو جائے گا



ان دونوں دائروں میں سے ایک سیاسیات کا دائرہ ہے دوسرا تاریخ کا اور یہ دونوں دائرے بجائے اس کے کہ ایک دوسرے پر بالکل منطبق ہو جائیں، ایک دوسرے کو ایسے کاٹتے ہیں کہ ایک دائرے کا ایک حصہ دوسرے دائرے سے باہر رہ جاتا ہے۔ سایہ دار حصے میں وہ تاریخی امور ہیں جن کا تعلق مملکت کے تعلقات یا اُس کی ترکیب سے ہے، اور یہ حصہ براہِ راست سیاسیات کے دائرے میں شامل ہے۔ اس کے برعکس سیاسیات کا غیر سایہ دار حصہ نظری سیاسیات ہیں، اور تاریخ کا غیر سایہ دار حصہ لڑائیوں درباداریوں اور دیگر ایسے معاملات سے پُر ہے جن کا تعلق براہِ راست مملکت سے نہیں۔

اور اسے بھی علم سیاستِ مدن میں شامل کیا جاتا تھا۔ جس طرح یہ امر ناممکن ہے کہ کوئی ملک معاشی اعتبار سے ترقی کر سکے، تاوقتیکہ اُس کی تنظیم نے ترقی کے ایک خاص درجہ کو عبور نہ کر لیا ہو، بجنسہٖ اسی طرح جب تک کسی ملک کی حکومت عاملینِ پیدائش کی کافی نگرانی نہ کرے یعنی جب تک وہ درآمد و برآمد کے قواعد و قوانین مرتب نہ کرے اور جب تک لگان اور مال گذاری کے حدود مقرر نہ کئے جائیں اُس وقت تک ملک کی ترقی میں رخنہ پڑنے اور اُس کی تنظیم بے کار ثابت ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ آج کل دنیا میں جتنی عالمگیر معاشی تحریکات پھیلی ہوئی ہیں، مثلاً آزاد و مامون تجارت حکومت کی جانب سے محکومات کی نگرانی، کاشتکاروں اور زمینداروں کے تعلقات، ان میں سے اکثر و بیشتر کا تعلق براہِ راست مملکت سے ہے۔ اور یہی وہی مسائل ہیں جہاں سیاسیات اور معاشیات ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ الغرض ان دونوں علوم کا باہمی رشتہ ایسے معاشی مسائل سے ظاہر ہوتا ہے جن کا تعلق براہِ راست تنظیمِ مملکت یا اختیاراتِ حکومت سے ہو۔

اخلاق و مذہب سے تعلق۔ یوں تو عمرانی علوم کو بہت سی شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جن میں سے ہر ایک کا کچھ نہ کچھ تعلق سیاسیات سے ہونا ضروری ہے۔ لیکن بنظرِ اختصار اس وقت صرف اخلاق و مذہب سے جو واسطہ ہے۔ اس کا بیان کافی ہوگا۔ ابتدائی معاشری حالت میں جب انتظامِ مملکت میں اتنی پیچیدگیاں نہ تھیں۔ اور جب انسان نسبتاً سیدھی سادی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس وقت ان تینوں میں بہت ہی کم فرق سمجھا جاتا تھا۔ ایک ہی فعل کی سزا میں مجرم کے بھائی بند حقہ پانی بند کر دیتے تھے۔ حکومت کی جانب سے کسی نہ کسی قسم کی جسمانی سزا دی جاتی تھی۔ اور اگر مجرم نے کفارہ نہ دیا ہو۔ یا اقرارِ گناہ نہ کیا ہو یا تائب نہ ہوا ہو۔ تو اُسے مرنے کے بعد طرح طرح کی روحانی سزاؤں کا خوف دلایا جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ معاملاتِ زندگی میں پیچیدگیاں بڑھتی گئیں۔ اور انسان کے افعال کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر لیا گیا۔ اب بجائے اس کے کہ حکمران ہی سرگروہِ معاشرۃ اور مذہبی سردار ہو۔ اس کی حیثیت محض سیاسی رہ گئی۔ اور زیادہ سے زیادہ وہ دیگر شعبہ ہائے زندگی کی نگرانی کرنے لگا۔ حال کے زمانے میں سیاسی اثر نے اس قدر ترقی کی ہے۔ کہ نہ صرف سیاسی زندگی کی اصلاح کی غرض سے قوانین نافذ کئے جاتے ہیں بلکہ مذہب اور اخلاق تک میں سیاسیات نے دخل حاصل کر لیا ہے۔ مثلاً مناکحت و ازدواج کے قوانین جنکا تعلق کسی زمانے میں محض مذہب کے ساتھ تھا۔ اب رفتہ رفتہ حکومت کے زیرِ اثر آتے جا رہے ہیں۔ اور اخلاقی قواعد جن کی خلاف ورزی کی سزا صرف اس قدر ممکن ہے کہ معاشرۃ ملزم سے کنارہ کشی اختیار کرے عرصہ دراز سے براہ راست سیاسی اثر سے متاثر ہو چکے ہیں۔ مثلاً اکثر ممالک میں شارعِ عام پر برہنہ پھرنا اتنا ہی بڑا جرم

ہے۔ جتنا وہ اخلاقی گناہ سمجھا جاتا ہے۔

سیاسیات کی تعریف اور اس کے تعلقات کے بیان کے بعد اب اس ادارہ یعنی مملکت کا مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جس کے ساتھ علمِ سیاسیات خاص طور پر وابستہ ہے۔

فہرستِ اصطلاحات جو تمہید میں استعمال کی گئی ہیں

اصطلاح	English	اصطلاح	English
اجتماعی ادارہ	Collective Institution	شخصیت	Personality
آزاد و مامون تجارت	Free and protected trade	عاملینِ پیدائش	Agents of Production
اشتراکیت	Socialism	علومِ غیر متعارفہ	Non-exact Sciences
انفرادی	Individual	علومِ متعارفہ	Exact Sciences
تادیب	Discipline	عمرانی	Social
تخیلات	Ideas	معاشرۃ	Society
تصور	Ideal	معاشری	Social
تنظیم	Organization	معاشرۂ سیاسی	Political Society
دستور، دساتیر	Constitution, Constitutions	مرکّب	Composite
حقوق	Rights	مملکت	State
سیاسیات	Politics	معاشیات	Economics
سیاسیات منطبقہ	Applied Politics	مقابلتی	Comparitive
سیاسیات نظریہ	Theoretical Politics	فرائض	Duties

(باقی)

ہارون خان شروانی

تجلّیات

بے نیازی نگہِ حُسن کرے یا نہ کرے
عشق ناکام مگر حسن کو رسوا نہ کرے

منزلِ عشق ملے یا نہ ملے، دل لیکن
ترکِ آوارگیٔ دشتِ تمنّا نہ کرے

طلبِ چشمۂ حیواں میں پھرے دشت بدشت
دِل مگر پیرویٔ خضر و مسیحا نہ کرے

بے نیازی سے رہے وقفِ جہنّم، لیکن
جُھک کے توبہ کی ندامت کو گوارا نہ کرے

ڈھونڈھتا پھرتا ہوں اُس ساقیِ دریا دِل کو
میرے ویراں کدۂ دل کو جو میخانہ کرے

مستیاں میکدۂ حُسن کی اللہ! اللہ!
یہ نشے قلزمِ صہبا کبھی پیدا نہ کرے

دستِ نازک سے مجھے خود ہی سنبھالے ساقی
کام ایسا بھی کبھی لغزشِ مستانہ کرے

سر وہی سر ہے نہ ہو جس میں خمارِ غمِ دوش
دل وہی دل ہے جو اندیشۂ فردا نہ کرے

رازِ ہستی سے ہے کچھ کچھ وہی آگاہ اثرؔ
جو کبھی بھول کے فکرِ غمِ دنیا نہ کرے

اثرؔ صہبائی

تاریخ دنیا پر ایک نظر

مشرق کے قدیمی تمدّن

(۱)

تاریخی تمدّن کا آغاز

خانہ بدوش ۔ ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ انسان کس طرح قدیمی جنگلوں سے نکلا اور کس طرح اس نے اپنی صیادی کا زمانہ چھوڑ کر دو مختلف سمتوں میں اپنی ترقی شروع کی۔ اِدھر اُس نے جانوروں کو پالتو بنایا، اپنے گرد بیوی بچوں اور غلاموں کا اک گروہ اکٹھا کیا اور گھوڑوں اونٹوں بھیڑوں اور بیلوں کی دولت جمع کر کے اُس نے صحراؤں میں خانہ بدوشوں کی زندگی شروع کی۔ اُدھر زراعت کا فن سیکھ کر وہ زرخیز اور محفوظ وادیوں میں بس گیا جہاں اُس نے اپنا گھر بار بنایا۔ اور صنعت و حرفت کی داغ بیل ڈالی۔

بود و باش کی اِن دو مختلف طرزوں سے دو مختلف قسم کے لوگ پیدا ہوئے۔ اور اِن کے اختلافات نسلاً بعد نسلٍ بجائے گھٹنے کے بڑھے۔ خانہ آبادوں نے جلد اور مسلسل ترقی کی یہاں تک کہ وہ تمدن کے ایک اعلےٰ درجے پر پہنچ گئے۔ خانہ بدوشوں کی ترقی بہت جلد رُک گئی اور وہ ایک نیم وحشیانہ حالت میں بسر اوقات کرنے لگے

خانہ بدوشوں کے علاقے اُس وقت سے لے کر اب تک وہی صحرائے اعظم کے مضافات عربستان کا وسطی خطّہ اور خاص طور پر وہ وسیع ایشیائی میدان تھے جو بحیرۂ اخضر سے لے کر مشرق کی طرف کوہستان خنگن تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اِن مقامات میں خانہ بدوش اپنے متعلقین کے ساتھ ایک خیمہ میں رہتا ہے۔ اُس کی خوراک کا انحصار تقریباً تمام تر اُس کے گلّوں پر ہے اور انہیں کا پالنا اور بڑھانا اس کی زندگی کا کام ہے۔ ان کی خور و نوش کے سامان کی بہم رسانی کے لئے وہ جابجا آوارہ رہتا ہے۔ کیونکہ وہ کبھی زمین جوتنے کی کوشش نہیں کرتا۔ نہ وہ

کسی طرح قدرت کا معاون بنتا ہے ۔ نتیجتہً وہ ایک خاص مقام میں چند روز ہی گذارہ کر سکتا ہے ۔ جہاں اُس کا دانہ پانی ختم ہؤا ۔ اُس نے اپنے خیمے اکھاڑے اور چل دیا۔ کہتے ہیں کہ ایشیا میں وہ ایک سال کے دوران میں اکثر دو ہزار میل تک طے کر لیتا ہے ۔ گرمیوں میں وہ قطبِ شمالی کے قریب جا پہنچتا ہے اور سردیوں میں منطقۂ حارہ کے قریب + ایسی طرزِ زندگی میں وہ جائداد بہت کم بنا سکتا ہے اُسے امن و امان نصیب نہیں ہوتا وہ کوئی فن و حرفت حاصل نہیں کر سکتا ۔ وہ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے ، نہ سکھا سکتا ہے + زمانہ گزرے جاتا ہے لیکن وہ بدستور اپنی حالت پر قائم رہتا ہے ۔ قوی ، چالاک اور سمجھدار لیکن تند مزاج ، غارت گر اور نیم وحشی ۔ جب کبھی آبادی کے بڑھنے یا دانے چارے کے گھٹ جانے سے وہ اپنے صحراؤں کو چھوڑنے پر مجبور ہوتا ہے تو وہ اور اُس کا دائمی رفیق گھوڑا خانہ آبادوں کے لئے ایک زحمت و مصیبت ثابت ہوتے ہیں +

خانہ آباد ۔ انسان نے جوں جوں تمدن کے میدان میں قدم مارا جوں جوں اُس نے قدرت کے ذرائع پر قابو پایا توں توں دنیا کی زمین روز بروز زیادہ آبادی کی پرورش کرنے کے قابل ہوتی گئی ۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ قدیم زمانۂ حجریہ میں جب انسان سوائے صیادی کے اور کچھ نہ کر سکتا تھا اس وقت ساری دنیا میں صرف پچاس لاکھ آدمی یعنی لندن کی آبادی سے بھی کم آدمی گزارہ کر سکتے تھے ۔ جب آدمی چرواہا بنا ۔ تو اُسے کسی قدر کم زمین کی ضرورت ہوتی لیکن پھر بھی تھوڑے آدمیوں کے لئے بہت سی زمین درکار تھی ۔ موجودہ فرانس کے برابر کے ایک زرخیز خطے میں صرف ۵۰۰۰۰ خانہ بدوش رہ سکتے تھے ۔ اس کے برعکس مزارعین کے ملکوں میں آبادی بہت بڑھ سکتی تھی اور بڑھی ۔ نیل کی شاداب وادی کا مزروعہ رقبہ یارک شائر کے رقبے سے صرف دوچند تھا ۔ لیکن اس سے ایک کروڑ آدمیوں کے لئے خوراک بہم پہنچ سکتی تھی ۔ اور دجلہ و فرات گنگا وسندھ ، ہوانگ ہو اور ینگ سی کیانگ کی وادیوں میں تو بڑی بڑی آبادیوں نے جگہ پائی ۔ انسانی تاریخ میں ان مستقل آبادیوں کی اہمیت کا اندازہ لگانا ایک ناممکن امر ہے ۔ جب تک انسان فقط جنگلوں میں آوارہ رہا یا شکار کھیلتا رہا یا چرواہا بن کر اپنے خیمے اُٹھائے اُٹھائے پھرا اُس وقت تک وہ طرزِ معاشرت میں کچھ زیادہ ترقی نہ کر سکا ۔ اور جب تک عورتیں اپنے بچوں کی گٹھڑیاں اپنی پیٹھ پر لئے لئے پھریں وہ خانگی امور میں زیادہ کمال حاصل نہ کر سکیں لیکن جب مرد اور عورتیں کنبہ بنے اور اِن کنبوں کی قومیں بنیں اور یہ لوگ بس گئے انہوں نے گھر بار بنائے ایک مستقل نظام قائم کیا مال و دولت جمع ہوئی پھر فرصت ملی اور انہیں کچھ نہ کچھ چین نصیب ہؤا تو اُس وقت ایک اعلےٰ شائستگی کی طرف نسلِ انسانی نے اپنا قدم بڑھایا +

خانہ بدوشی سے خانہ آبادی آہستہ آہستہ ہوئی۔ بہت سی نسلوں تک آدمی ابھی صید و شکار کرتے رہے اور عورتیں کھیتوں میں کام کرتی رہیں۔ علاوہ بریں ابتدائی زراعت اس قدر نامکمل تھی کہ زمینیں بہت جلد بیکار ہو جاتیں اور اکثر نئی زمینیں ڈھونڈھنی پڑتیں۔ باوجود اس کے چند مبارک مقامات میں حضریت کی زندگی قائم ہو گئی۔ اور نقلِ مکانی کی عادت جاتی رہی +

ترقی کے پہلے قدم۔ پہلی آبادیاں جو انسان نے قائم کیں، میٹھے پانی کے قرب میں دریاؤں یا جھیلوں کے کناروں پر تھیں۔ اِنسان کے جسم میں اپنے اُن قدیمی بزرگوں اور پیشروؤں کی جو پانی کے قرب وجوار میں رہنے والے تھے۔ ابھی اتنی نشانیاں موجود ہیں۔ کہ میٹھا پانی اُس کی زیست کے لئے ایک لازمی چیز ہے +

جدید زمانۂ حجریہ میں جھیلوں کی بستیاں عام تھیں۔ جن کے بعض نمونے حال ہی میں سوئٹزرلینڈ، شمالی اطالیہ اور انگلستان میں (بمقام گلیسٹنبری) پائے گئے ہیں۔ گٹھے جھیل کی تہ پر جما دیے جاتے تھے۔ اُن پر ایک چبوترا بنا دیا جاتا تھا۔ اور اس پر جھونپڑے تعمیر کر دیے جاتے تھے۔ جھیلوں کے گاؤں ذرا محفوظ ہوتے تھے۔ مچھلی وہاں بکثرت دستیاب ہوتی تھی۔ اور یہی اِن کی عام خوراک تھی۔ ساتھ کے کنارے پر اِن کے پالتو جانور چرتے تھے جہاں وہ تھوڑی بہت کھیتی باڑی کر لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی صید و شکار سے بھی کچھ حاصل کر لیتے تھے۔ اِن بستیوں کو سب سے بڑا خطرہ آگ کا تھا۔ اور اِن کا جہاں کہیں کوئی نشان ملا ہے۔ اُس سے اُن ہیبت ناک آتش زدگیوں کا پتہ چلتا ہے۔ جنہوں نے عموماً اِن آبادیوں کو تہ و بالا کر دیا ہوگا +

لیکن ایسی بستیوں میں زراعت صرف ایک ضمنی کام تھا۔ مچھلیوں کا شکار سب سے بڑا کام تھا۔ اور اس کے ساتھ دودھ کے لئے چند بکریاں اور تن پوشی کے لئے بھیڑوں کا ایک گلّہ ہوتا تھا۔ صرف بعض خاص سرسبز و شاداب وادیوں کے دیہاتوں میں زراعت انسان کا اولیں کام قرار پایا اور صیادی اور ماہی گیری اور راعیت محض زائد کام ہو گئے۔

کامیاب دریائی سکونت کی شرائط یہ تھیں کہ:-

(۱) آب وہوا اوسط درجہ گرم ہو۔

(۲) زمین زرخیز ہو۔

(۳) پانی بہتات میں ہو اور باقاعدہ ملے۔

(۴) علاقہ مخالفانہ حملوں سے صحراؤں، سمندروں یا پہاڑوں کی آڑ میں محفوظ ہو۔

(۵) اندرونی آمد و رفت کے رستوں کی سہولت، لیکن

(۲) بیرونی دنیا سے رسم وراہ رکھنے کی قابلیت موجود ہو۔

اُن دس بارہ علاقوں میں جہاں یہ شرائط کم وبیش پوری ہوئیں۔ ترقی بہت جلد ہوئی۔ اور موجودہ تمدن کی بنیادیں مستحکم طور پر قائم ہوگئیں۔ کاشتکاری کے لئے آلات ایجاد ہوئے۔ آبپاشی کے ذریعے نکالے گئے۔ دھاتوں کو تیار کرنے کے طریقے دریافت ہوئے۔ اینٹ، پتھر کے مکانات تعمیر ہوئے۔ کشتیاں اور جہاز بنائے گئے۔ مساحت اور ہیئت کے علوم کی بنا پڑی۔ تقویمیں اختراع ہوئیں۔ فنون وحرفت کا آغاز ہوا۔ تجارت کا دور دورہ ہوا۔ کتابت نقاشی، ادب، فلسفہ، دینیات ان سب نے ترقی کی راہ میں قدم رکھا +

تمدن کے قدیمی مرکز۔ اس بات پر بہت بحث کی گئی ہے کہ تمدن کے قدیمی مرکزوں میں سے کس میں یہ ترقی پہلے پہل رُونما ہوئی۔ چینی کہتے ہیں کہ ہمارا تمدن سب سے پُرانا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنی ایک لاکھ سال کی روایات بیان کرنے لگتے ہیں۔ چینی تاریخ بیشک پُرانی ہے لیکن مستند تاریخ میں چار ہزار سال ق م سے پہلے اس کا نشان نہیں ملتا۔ بعض ماہرانِ علم الانسان کا خیال ہے۔ کہ وہ شائستگی جو سپینیوں نے سولھویں صدی عیسوی میں میکسیکو اور پیرو میں ملاحظہ کی، دنیا میں سب سے پرانی تھی۔ لیکن جدید ترین تحقیق اس نظریہ کو مسترد کرتی ہے۔ کہ امریکی تہذیب امریکی آبادی کی طرح مقابلتہً جدید تر وقتوں میں ایشیا سے امریکا کو گئی۔ چند سال ہوئے کہ مصر کا تمدن سب سے قدیم مانا جاتا تھا۔ اس کی تقویم ۴۲۰۰ ق م کے قریب ہوئی اور اس سے بھی ہزار سال پیشتر مصریوں کی زندگی کم وبیش حضارت کی زندگی تھی لیکن اب حال کے محققین کا خیال ہے کہ بابل کا تمدن اس سے قدیم اور خوزستان کا تمدن بابل سے بھی زیادہ قدیم تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر ڈی جی ہوگارتھ اور پروفیسر فلنڈرز جیسے مسلم الرائے ماہرانِ اثریات کا بھی خیال ہے کہ جدید ترین آثار کا ویدہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایلم کے تمدن کا زمانہ بارہ ہزار سال ق م کا ہے۔ حال میں ہڑپا کے برآمد شدہ آثار سے خیال کیا گیا ہے۔ کہ ہندوستان میں حضرتِ مسیح سے تین ہزار سال پہلے تمدن کا دور دورہ تھا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ اس امر میں کوئی قطعی رائے قائم کی جاسکے بہت سے اور اکتشافات کی محنتیں درکار ہونگی +

آخری اور قطعی جواب کچھ بھی ہو۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ دُنیا کے مختلف خطوں میں مختلف اور ممیز تمدن اس طرح نشوونما پاتے رہے۔ کہ یا وہ کسی ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ رہے یا کسی دوسرے کا تھوڑا بہت اثر اُن پر پڑتا رہا +

غالباً یہ صحیح ہے۔ کہ انسانی نسل ایک ہی ابتدائی خاندان سے بڑھی لیکن ایسا ہے بھی تو اس خاندان کا انتشار قدیم زمانۂ حجریہ ہی میں ہو چکا تھا اور مختلف جغرافی حالات اور مختلف نوع کے ازدواجی تعلقات سے سفید

اور سیاہ اور زرد اور سُرخ نسلیں جو ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں، ظہور میں آئیں - معلوم ہوتا ہے۔ کہ جدید زمانۂ حجریہ میں مصر اور بابل یا بابل اور ہندوستان کا آپس میں کچھ تعلق نہ تھا - اور چین تو باقی ماندہ مہذب دنیا سے بالکل الگ تھلگ صرف اپنے اُن خانہ بدوش دشمنوں سے جو اُس کے حدود پر ہمیشہ یورشیں کرتے رہتے تھے، برسرِ پیکار رہ کر آپ ہی اپنے بنائے ہوئے رستے پر گام زن تھا +

---

(۲)

چین اور ہندوستان

چین کی ابتدائی تاریخ - کیون لُون کے پہاڑوں سے جو تبت کی سطحِ مرتفع کی شمالی جانب واقع ہیں، دو بڑے دریا جن کے منبعے قریب ہی قریب ہیں بہتے ہیں - اُن میں سے ایک ہوانگ ہو (یعنی دریائے زرد) تھوڑی دور چل کر ایک شمالی راستہ اختیار کر کے غاروں کے ایک سلسلے سے گزرتا ہؤا زرخیز وادیوں کے ایک وسیع خطے میں جو خاص چین کے شمالی صوبوں پر مشتمل ہے داخل ہوتا اور شاداب کئے جاتا ہے۔ دوسرا یانگ سی کیانگ کے جنوب کی طرف ہو کر ۳۲۰۰ میل کی مسافت طے کرتا ہؤا وسطی میدانوں کو سیراب کرتا ہے - اِن خطوں کو جن کی سرسبزی و زرخیزی اِن برفانی ندیوں پر منحصر ہے، خوفناک کوہستانی سلسلوں اور دُور دُور تک پھیلے ہوئے اجاڑ بیابانوں نے بیرونی دنیا سے منقطع کر رکھا ہے - ایک ایسے زمانے میں جس کے متعلق کوئی روایات بھی موجود نہیں، یہ خطے منگولی نسل کے امن پسند خانہ آبادوں کا مسکن بنے جو یہاں کے بڑے بڑے دریاؤں اور اُن کے بہت سے معاونوں کی وادیوں تک جا کر بیشمار خود مختار دیہاتی جماعتوں میں بس گئے - یہ ابتدائی خانہ آباد جو اپنے صبر و ہمت کے لئے مشہور تھے جلد دولت اور تعداد میں ترقی کر گئے یہاں تک کہ اُن کی خاموش خوشحالی کو دیکھ دیکھ کر وسطِ ایشیا کے صحرا نوردوں کا جی للچا اُٹھا - سینکڑوں بار ان لٹیروں نے گوبی کے صحرا سے اپنے تیز رفتار گھوڑوں پر گزر کر ان لوگوں پر چھاپہ مارا، اُن کے گاؤں تباہ و برباد کر دیئے۔ اُن کے ذخیرے لوٹ لئے اور اُن کے بچوں کو غلام بنا کر لے گئے +

یہ اور ایسے ہی اور بہت سے خانگی مخمصوں کی وجہ تھی - کہ چین میں جاگیرداری کا نظام رائج ہو گیا جس میں فوجی امرا کی ایک جماعت امن و حفاظت کی ذمہ وار رہی - کوئی دو ہزار سال تک (اندازاً ۲۲۰۰ سے ۲۴۶ ق م تک)

یہ جاگیرداری نظام برقرار رہا، بتدریج فوجی سرداروں کی تعداد گھٹتی گئی اور جو بچے اُن کی قوت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ آخرکار مشہور ٹسن شی کے تحت میں جس نے ہوانگ ٹی یعنی شہنشاہ کا لقب اختیار کیا ایک متحدہ سلطنت قائم ہو گئی ٹسن شی نے شروع ہی میں تین لاکھ آدمیوں کی ایک فوج تیار کر کے خانہ بدوشوں کو قرار واقعی سزا دی۔ اس کے بعد اُس نے "دیوارِ اعظم" بنوائی، جو ۱۸۰۰ میل لمبی تھی۔ اور جس کا مقصد سلطنت کو اِن یورشوں سے بچانا تھا۔ ۲۴۶ ق م سے لے کر ۱۹۱۲ء تک چین کی حکومت شاہانہ طرز کی رہی۔ بہت سے شاہی خاندانوں کے عہد میں جو یکے بعد دیگرے مالکِ تخت و تاج ہوئے، چین کی سلطنت میں امن و امان قائم ہو گیا۔ مانچوریا، منگولیا، ترکستان اور تبت اُس کی طاقت کے سائے میں آ گئے۔ ملک دولت اور خوشحالی میں ترقی کرتا گیا۔ اور وہاں ایک ایسے تمدن کا ڈنکا بجنے لگا جو ساتویں صدی عیسوی میں بے شبہ دنیا بھر میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔

چینی تمدن - چینی تاریخ اور چینی تمدن اور فن کی ایک نادر خصوصیت اُن کا غیر منقطع تسلسل ہے۔ قدیم ترین زمانوں سے لے کر [illegible] تک وہاں کوئی تباہ کن انقلاب نہیں ہوا۔ وہاں ہمارے سامنے ایک قوم (جو تعداد میں کل دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے) زمانۂ حجریہ سے لے کر زمانۂ حال تک اپنے ہی بنائے ہوئے رستوں پر چلی اور پھولی پھلی ہے۔ اگر کبھی ایک لمبے عرصے کے لئے کوئی اجنبی خاندان (مثلاً تیرھویں صدی عیسوی کے تاتار یا سترھویں صدی کے مانچو) تختِ سلطنت پر قابض ہوا، تو آخرکار مفتوحین کے انبوہِ کثیر نے اُسے کانِ نمک میں نمک بنا دیا۔ اور وہ سب چینیوں کے سے چینی ہو گئے۔ اسی عظیم الشان سلطنت کی محفوظ وسعت کے اندر مشہور و معروف دریافتیں ہوئیں۔ اور بڑی اہم ایجادیں کی گئیں۔ لیکن بالعموم اُن کو اس طرح چھپا چھپا کر رکھا گیا کہ حال ہی میں آ کر دنیا کو اُن کا علم اور دنیا کی ترقی پر اُن کا اثر ہوا۔ شروع شروع ہی میں چینیوں نے آبپاشی کا ایک نہایت اعلےٰ نظام بنایا جس میں بہت سی نہریں عمدہ نالیاں اور پل تھے۔ پرانے زمانوں سے انہوں نے ریشم کے کپڑے تیار کئے تھے اور دنیا میں صرف وہی لوگ تھے، جو ریشم بافی کے بھید سے آگاہ تھے۔ چینی کے برتن اور ان کی نفیس جلا انہیں تک مخصوص تھیں چھاپے کا فن چینیوں کے ہاں یورپ والوں سے کم از کم آٹھ صدیاں پہلے رائج تھا۔ بارود جس کا علم اہلِ مغرب کو بہت بعد میں جا کر ہوا۔ اُن کے ہاں جنگ و جدل میں مدت سے استعمال ہوتا تھا، اور یہ امر یقینی ہے کہ مغرب نے یہ باتیں عربوں اور تاتاریوں کے واسطہ سے گویا چینیوں ہی سے سیکھیں۔ ملاحی "کمپاس"، بھی غالباً اُن کی ایجاد تھی۔ جس کا استعمال صدیوں بعد یورپ نے عرب سیاحوں سے سیکھا۔ "یہ حال جانتے ہوئے کہ تیرھویں صدی کی عیسائی دنیا پر کمپاس، بارود اور چھاپے کا اثر کیا معنی رکھتا تھا۔ یہ کہنا کچھ بے جا نہیں کہ "نشأۃ الثانیہ"، کی تحریک کا اصلی منبع جس قدر یونان تھا۔ اُسی قدر چین بھی تھا"۔

لیکن چینی تمدن اُس وقت میں اور اب بھی مذہبی اور علمی حیثیت سے کمزور ہے۔ وہ زیادہ تر مادی تھا اُسے زیادہ تر جسمانی معاملات سے سروکار تھا۔ بزرگ پرستی نے اُسے بڑی حد تک پُرانی چیزوں کا شیدائی اور نئی چیزوں سے متنفر کر دیا۔ کتابت کا طریقہ بھونڈا اور دقیانوسی تھا جس کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ علم کے خزانے بڑی بڑی دشوار فہم کتابوں میں بھرے پڑے رہتے۔ چینی علما عموماً اپنی قدیم کتابوں کی ہمہ گیری کے نام لیوا تھے۔ چین کے مشہور روحانی رہنما کنفوشس (کنگ فوتسی ۵۵۱ تا ۴۷۹ ق م) کی تعلیمات میں اگرچہ اخلاقی اوصاف مثلاً انسانی حمیت، انصاف پسندی حکم برداری، دیانت داری اور نیک نیتی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ لیکن اُن میں حیات و ممات کے دشوار و اہم مسائل پر کچھ روشنی نہیں ڈالی گئی، نہ ایسا طریقہ بتایا گیا ہے جس سے انسان اپنے خدا سے ربط پیدا کر سکے +

ہندوستان اور اُس کے باشندے ۔ اگرچہ صرف ایک ہمالیہ کا سلسلہ ہندوستان کو چین سے جدا کرتا ہے لیکن ہندوستان کے مختلف نسل و نوع کے باشندوں کی تاریخ چین کے زیادہ ہم وضع و ہم معاشرت باشندوں سے بغایت درجہ مختلف ہے۔ یوں تو ہندوستان کو بھی چین کی طرح ایک بڑے کوہستانی سلسلے نے محفوظ اور بیرونی دنیا سے منقطع کر رکھا ہے۔ لیکن نہ یہ حفاظت اور نہ یہ انقطاع چین کی طرح مکمل ہے۔ مشرق کی طرف برما کے ساحل اور برہما پترا کی وادی سے اندر آنے کے راستے ہیں۔ اور مغرب میں درۂ خیبر کا بڑا کھلا ہؤا دروازہ موجود ہے۔ جہاں سے کم از کم آٹھ مختلف موقعوں پر حملہ آور فوجیں پنجاب اور وادیٔ گنگا کی طرف پیش قدمی کرتی ہوئی ملک پر قابض ہو گئی ہیں۔ جزیرہ نما کے اوّلیں باشندوں پر پیشتر اس کے کہ وہ یا اُن کا تمدن یہاں مستحکم طور پر قائم ہو سکتا، اجنبی آپڑے۔ لیکن اِن حملہ آوروں کی بھی جلد باری آئی اور اِن پر اور حملہ آوروں نے یورش کی۔ اور اسی طرح صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہانتک کہ ہندوستان میں کم از کم چار مختلف نسلوں، آٹھ مختلف مذاہب اور ایک سَو سے زائد دیسی زبانوں کا دور دورہ ہو گیا +

ہندوستان کے اصلی باشندے "متوسط" نسل کے نمونے کے تھے۔ پست قد اور سیہ فام۔ (ان کے تمدن کا مقام سندھ کی وادی تھی) موجودہ پہاڑی قومیں مثلاً گورکھے اور بھیل گونڈ انہیں کی نسل سے ہیں +

اِن لوگوں پر ۲۰۰۰ ق م سے کچھ مدت پہلے آریائی نسل ترکستان کے صحراؤں سے نکل کر حملہ آور ہوئی۔ اور یا انہیں مغلوب کر لیا یا مار پیٹ کر بھگا دیا۔ آریائی حملہ آوروں نے پنجاب میں ۲۰۰۰ سے ۱۴۰۰ ق م تک کی چھ صدیوں میں ایک غیر معمولی طبع زاد تمدن کی بنیاد ڈالی۔ جس کی دائمی یادگاریں ویدی ادب اور ہندومت ہیں۔ بعد میں جب اُن کی آبادیاں گنگا کی وادی میں پھیلیں۔ تو وہ تین بڑی ذاتوں یا معاشری گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ جن کی شدید حد بندیاں ابھی تک تمدنی ترقی اور قومی اتحاد کے رستے میں ایک حدِ فاصل بن کر حائل ہیں۔ وہ ذاتیں یہ ہیں:-

(۱) برہمن یا پروہت
(۲) کشتری یا سپاہی ۔ اور
(۳) ویش یا دُکاندار اور زمیندار ۔

اِن کے نیچے تھے وہ ہند کے اصلی غیر آریائی مفتوح باشندے جو ایک چوتھی شودر یا کمینہ ذات میں شامل تھے اور جن کے ساتھ چوپایوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا +

بعد کی چھ صدیوں میں ۱۴۰۰ سے ۸۰۰ ق م تک جب کہ یہ ذاتیں اپنی اپنی جگہ پر قائم ہو رہی تھیں ۔ یعنی اُس زمانے میں جس کی خصوصیات اُن دو بڑی رزمیہ نظموں مہابھارت اور رامائن میں بوضاحت بیان کی گئی ہیں ۔ ہندوستان کی سیاسی طاقت بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکی تھی ۔ جنوبی ہندوستان پر ۸۰۰ ق م تک جا کر ہندوانہ اثر پڑا ۔ اور کہیں ۳۲۱ ق م میں جا کر ایک مرکزی حکومت قائم ہوئی ۔ اس سن میں عظیم الشان بادشاہ چندرگپت موریا نے اپنی سلطنت کی بمقام پاٹلی پترا (پٹنہ) بنیاد رکھی +

ہندی تمدّن ۔ یہ موریا سلطنت جس کا بانی چندرگپت تھا ۔ تقریباً ڈیڑھ صدی تک (۳۲۱ تا ۱۸۴ ق م) برقرار رہی ۔ یہ ایک محض شمالی سلطنت تھی ۔ اور دریائے کرشنا سے زیادہ جنوب کی طرف اس کا اقتدار نہ تھا ۔ یہ اپنے بانی کے پوتے مشہور و معروف بادشاہ اشوک کے عہد میں (۲۷۲ تا ۲۳۲ ق م) اپنی وسعت اور شان و شوکت کے معراج پر پہنچی ۔ اس بادشاہ کی صعوبتیں اور کامرانیاں ہندی تمدّن کے امتیازی خصوصیات کا صحیح نقشہ کھینچتی ہیں ۔ یعنی اُن سے اس تمدن کے مذہبی رنگ کا اندازہ ہوتا ہے ۔ جس میں وہ زیادہ تر رنگا ہوا ہے ۔ اگر اُدھر جفاکش ، سست رو چینی مذہبی خیالات سے عاری نظر آتے ہیں ۔ تو اِدھر اپنے تخیلات میں مستغرق رہنے والے جذبات پرست ہندوؤں میں مافوق العادت کا ضرورت سے زیادہ احساس ہے اور وہ ایک گرم خطۂ زمین کی حیات و ممات کی کثرت میں بیخودی کی افراط رہبانیت کی انتہا اور مذہبی جوش کی تندی میں گرفتار لیکن اس کے ساتھ ہی تخیل کی بلند پرواز اور الہامی وجدان کی پاکیزگی کے بہترین نمائندے رہے ہیں ۔ رزمیہ زمانہ (۱۴۰۰ تا ۸۰۰ ق م) میں جب کہ وہ گنگا کی وادی کے سکون و عافیت میں آرام و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے ۔ تو اُن میں برہمنوں کی مذہبی جماعت نے حیاتِ قومی کے ہر شعبے پر اپنا اقتدار جما لیا ۔ سیاست اور معاشرت ، قانون اور ادب ، تعلیم اور اخلاق ، فنون و طبیعیات سب پر برہمنوں کا اثر حاوی ہو گیا ۔ اُن کی رہنمائی میں ہندوؤں کی ذکاوت نے دنیا میں نئی نئی چیزیں اختراع کیں اور بڑے بڑے نمایاں کام کر دکھائے ۔ ہیئت ، مساحت ، حساب (مثلاً کسورِ اعشاریہ) تعمیر ، سیاسیات ، فلسفہ میں انہوں نے وہ کچھ کیا ۔ جو

ہمیشہ دنیا کے مستقل علمی خزانے کی زیب وزینت رہے گا +

لیکن مذہب کے دائرے میں ہندومت کا اثر سب سے زیادہ اور سب سے نمایاں طور پر ظاہر ہوا ہے۔ کیونکہ اسی ملک ہندوستان میں تقریباً ۵۵۰ سے ۴۷۷ ق م تک (عین اُس وقت جب کنفیوشس چینیوں کو اپنے اخلاق کی تعلیم دے رہا تھا) گوتم بدھ نے اپنے وطن والوں کو اور اُن کے ذریعے سے دنیا بھر کو یہ سبق دیا کہ خوشی کا راز نفس کشی میں چھپا ہے۔ زندگی کی راہ نیکی کی راہ ہے۔ قلبی پاکیزگی کے مقابل میں مذہبی رسمیات کی کچھ حقیقت نہیں۔ پروہتوں کی طاقت بودی اور ہیچ ہے۔ اور زیست کا منتہائے کمال جذبات پر پوری طرح غالب آجانا ہے۔ اور یہی نروان یا نجات ہے

مشہور شہنشاہ اشوک بدھ مت کا پیرو ہوگیا اور اُس نے اس کی تعلیمات کی دور دور تک اشاعت کی لیکن اُس کی موت کے جلد بعد بہ زوال پذیر ہوگیا۔ اُس کا بھی ایک مذہبی نظام بن گیا برائیاں اُس میں سرایت کرگئیں برہمنوں نے اُسکی مخالفت پر کمر باندھ لی اور اسلامی حملوں کے زمانے میں وہ ہند میں نیست و نابود ہوگیا۔ لیکن اس سے بہت پہلے وہ سیلون، برما، تبت اور چین تک پھیل چکا تھا اور ان ملکوں میں یہ آج تک قائم ہے اور دنیا کی ساری آبادی کا پانچواں حصہ بدھ کا پرستار اور پیرو ہے +

---

(۳)

ہلالِ شاداب[1]

بابل۔ اگر ہم ہندوستان سے بلوچستان کی دشوار گزار غاروں اور صحراؤں میں سے ہو کر مغرب کی جانب چلتے جائیں تو پانچ سو میل کے دقت طلب اور خطرناک سفر کے بعد ہم ایران کی بری سطحِ مرتفع پر پہنچ جائیں گے۔ جو بلند ہوتے ہوتے خلیج فارس کے قریب ۸۰۰۰ فٹ بلند ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر ہم اس سطحِ مرتفع کی بلندیوں پر ہوتے ہوئے شمال مغربی طرف کو خلیج کے اُوپر کی جانب چلتے جائیں۔ تو غروبِ آفتاب کی طرف دور دور ہماری نگاہ اُس مشہور دوآبہ پر پڑیگی جو قدیم بابل کا گہوارہ تھا +

---

[1] "ہلالِ شاداب"۔ اس علاقہ کو کہتے ہیں جس میں بابل۔ اشوریا۔ فینیقیا اور فلسطین شامل تھے۔

یہ خوش قسمت ملک جسے دجلہ و فرات سیراب کرتے ہیں۔ ایک نہایت قدیم اور طبع زاد تمدّن کا مسکن تھا۔ جو کئی ہزار سال تک اپنے زوروں پر رہا۔ البتہ اس تمدّن کی ترقیوں میں کئی رُکاوٹیں اور آفتیں حائل ہوئیں۔ جس کا ایک سبب وہ تباہ کن طغیانیاں تھیں۔ جو اُس کے اِن دریاؤں میں وقتاً فوقتاً اُٹھتی تھیں۔ اور دوسرے دونوں ہمسایہ پہاڑی قوموں اور دور کے رہنے والے خانہ بدوشوں کی تاخت و تاراج تھی جس سے محفوظ رہنے کے لئے یہاں کوئی قدرتی حدود نہ تھیں۔

بابل کے سب سے پہلے باشندے وہ پُر اسرار سُومیری تھے۔ جو نہیں معلوم کہاں سے آئے اور پھر کہاں گم ہو گئے۔ بعضوں کا خیال ہے۔ کہ اُن کی اور چینیوں کی نسل ایک ہی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ جنوبی ہندوستان کے دراوڑ اور وہ ہم نسل تھے۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ خوزستان کے رستے سے ۴۰۰۰ ق م سے قبل یہاں وارد ہو کر اُنہوں نے شہر آباد کئے جن میں وہ ۲۰۰۰ ق م تک رہے۔ اُنہوں نے آبپاشی کا ایک عمدہ طریقہ ایجاد کیا۔ ایک عجیب قسم کی تحریر نکالی جو مٹی کی تختیوں پر لکھی جاتی تھی اور جسے پیکر نما تحریر کہتے ہیں۔ ہیئت میں خاصی ترقی کی۔ ایک تقویم ایجاد کی جو باقاعدہ طور پر مہینوں اور ہفتوں میں منقسم تھی۔ دن کو آفتابی اور آبی گھڑیوں کے ذریعے سے گھنٹوں اور دقیقوں میں تقسیم کیا اور دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں کے بڑے بڑے مندر تعمیر کئے اور وہاں بڑی لمبی چوڑی رسمیات رائج کیں۔

۲۷۵۰ق م میں سارگن نے جو فرات کی بالائی وادی میں ایک شامی مملکت کا بادشاہ تھا۔ اُن کو اپنے زیرِ قلم کیا لیکن باوجود اس تسخیر کے وہ اور اُن کا تمدن بدستور قائم رہے۔ چند سو سال بعد ۲۲۶۳ ق م میں شام کے اموریوں نے سارے دوآبہ پر اپنا سکہ بٹھالیا لیکن اس دفعہ بھی سُومیری تمدن کی فوقیت نے اُسے مِٹ جانے سے بچالیا۔ بلکہ اموری بادشاہ حمورابی (وہ امرافیل شناری جس کا ذکر توریت کتاب پیدایش ۱۴-۹ میں آیا ہے) کے عہد میں (۲۱۲۳ تا ۲۰۸۰ ق م) جس کا مجموعۂ قوانین چند سال ہوئے، سُوسہ میں ایک منقوش ستون پر پایا گیا اور جس سے اس کی غیر معمولی عدل گستری کا پتہ چلتا ہے، بابل کا تمدن اپنے معراج ترقی پر پہنچ گیا۔ لیکن اس کے بعد کا تیسرا حملہ ایسا تھا۔ کہ اہلِ بابل اُس کی مقاومت کی تاب نہ لا سکے۔ ۱۹۲۵ ق م میں اناطولیہ کے حطّی اُن پر چڑھ آئے۔ اور بعد ازاں بحیرۂ اخضر کے کاسیوں نے اُنہیں قطعی طور پر مغلوب کر کے بابل میں ایک شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ جو برابر چھ سو سال تک حکومت کرتا رہا۔ کچھ مدت تک اپنی قومیت برقرار رکھنے کی کوششوں کے بعد سومیریوں کا بحیثیت ایک قوم کے نام و نشان باقی نہ رہا۔ لیکن اُن کا تمدن ابھی تک ہمارے قوانین، ہماری ہیئت۔ ہماری تقویم، ہماری تقسیمِ اوقات، ہمارے وزنوں اور پیمانوں میں اور درجنوں سے شمار کرنے کے طریقے میں مضمر ہے۔ پہیّوں، پیرموں اور چرخیوں کا استعمال پہلے پہل اُنہیں نے کیا اور ممکن ہے کہ گیہوں کی کاشت کی ابتدا بھی اُنہیں نے کی ہو۔

اشوریا - سُومیری بابل کی کمزوری کا سب سے بڑا سبب اُس کا سیاسی اور مذہبی نفاق تھا - ہر ہر شہر کی اپنی حکومت، اپنا مذہبی نظام اور اپنا اپنا خدا تھا - اِن سب میں یہ کمزوری تھی کہ وہ اپنے مشترک مُلک کو اپنے متعدد اور خوفناک دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے متحد نہ ہو سکتے تھے - اِسی لئے اکادیوں، اموریوں اور کاسیوں نے اُن کے وطن کو یکے بعد دیگرے پامال کیا +

اسی زمانے میں (۳۰۰۰ ق م سے لے کر) دجلہ پر پانچ سَو میل شمال کی طرف ایک اور طاقت آہستہ آہستہ نشوونما پارہی تھی - اُس کے نامساعد حالات نے اس میں عین برعکس اوصاف پیدا کر دیئے تھے یعنی اُس کا تمدن کمتر تھا، لیکن اُس کی سیاسی تنظیم بہت زیادہ زبردست اور اُس کی فوجی قوت بہت زیادہ خوفناک تھی - یہ اشوری جن کا دارالسلطنت اشور تھا، ایک سامی النسل قوم تھے جن کی رگوں میں عربی بدویوں کے ایک تُندخو قبیلے کا خُون گردش کرتا تھا +

اُن کا وطن غیر محفوظ تھا اردگرد کی پہاڑی قومیں آئے دن اُن پر چھاپے مارتی تھیں ایشیائے کوچک کے حملے بھی کبھی کبھی اُن پر ہاتھ صاف کرتے تھے - نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی ساری زندگی جنگ وجدل کے لئے وقف ہو گئی اور مرورِ زمانہ کے ساتھ اُن میں ایسی جنگی قابلیت اور خونخواری پیدا ہو گئی کہ ایک ہزار سال (تقریباً ۱۶۰۰ سے ۶۰۰ ق م) تک انہوں نے شمال سے لے کر جنوب تک سارے دوآبے کو اپنی فوجوں کی رزمگاہ بنائے رکھا - انہوں نے اپنے تئیں کمانوں اور نیزوں، دیوار شکن اور قلعہ شکن کلوں کے سے آلاتِ حرب سے مسلح کر لیا - انہوں نے فولادی رتھیں بنائیں - اور گھوڑوں کو لڑائی میں لڑنے کا طریقہ سکھایا +

اُنہوں نے شہروں پر حملہ کر کے اُن کی اینٹ سے اینٹ بجادی - اور باشندوں کو طرح طرح کی شیطانی اذیتوں سے ہلاک کیا - ۱۲۷۵ ق م میں یا اس کے قریب قریب انہوں نے بابل کو فتح کر کے اُسے اپنے علاقے میں شامل کر لیا ۷۴۵ ق م سے لے کر ۶۰۰ ق م تک اپنے نصف درجن بادشاہوں کے تحت میں جن میں سناحرب (۷۰۵ تا ۶۸۱ ق م) سب سے زیادہ مشہور ہے - اُن کی سلطنت اپنے بامِ عرُوج پر پہنچی + سناحرب نے اپنا دارالخلافہ نینوا میں بدل دیا جس کی اُس نے دوبارہ ایک بے نظیر طریقے پر تعمیر و قلعہ بندی کی - اُس کی خواہش تھی کہ نینوا کو ایک عالمگیر سلطنت کا مرکز بنائے - لیکن اُن ظلم وستم کا جو اُس نے اور اُس کے جانشینوں نے معصوم باشندوں پر ڈھائے، یہ نتیجہ ہوا - کہ آخر کار اُنہوں نے ایک عام بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا - میدان کے رہنے والے بابلی کوہستان کے میدیوں کے ساتھ مل گئے اور پھر صحراؤں کے سمیٹیوں کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ شامل کر لیا - دُور دراز مصر بھی جو مفتوح ہو چکا تھا بغاوت میں شریک ہو گیا + ۶۰۶ ق م میں نینوا کے ظلم آباد شہر پر حملہ آوروں نے دھاوا کیا اور اُس کو قطعی منہدم کر دیا

وہاں کا آخری مطلق العنان بادشاہ اپنے ہی محل کی ہیبت ناک آگ میں جل کر مر گیا +

اگر اشوریوں نے دنیا کے تمدن کے لئے کچھ کیا تو وہ محض جنگ و حکومت کی شق میں تھا۔ جنگی قابلیت کے لحاظ سے انہیں زمانۂ قدیم کے پرشین کہا جا سکتا تھا + اُن کے وقت تک کسی قوم نے جنگی معاملات میں ایسی نمایاں تنظیم نہ کی تھی۔ نہ اُن سے پہلے کبھی حکومت کے سارے امور کو اس طرح ایک مرکز پر لایا گیا تھا اور نہ مفتوحہ قوموں کا کسی نے یوں خون چوسا تھا +

فینیقیا۔ اشوریا کے زوال پر اُس کی سنگین گرفت سے "ہلالِ شاداب" کی جن قوموں کو آزادی ملی وہ بابلی، یہودی اور فینیقی تھے۔ بابل کا تمدن ایک دفعہ تھوڑی دیر کے لئے کلدانی بادشاہ بخت نصر ثانی اور اُس کے جانشینوں (۶۰۶ تا ۵۳۸ ق م) کے عہد میں پھر چمکا۔ یہودی بھی تقریباً بیس برس (۶۰۶ تا ۵۸۶ ق م) کے لئے آزادی کی ہوا میں پھولے پھلے لیکن وہ جنہوں نے اس آزادی سے سب سے زیادہ اور سب سے دیر تک استفادہ حاصل کیا فینیقی تھے جن کی تجارت کے منافع سے اشوری مدتوں تک فیض یاب ہوتے رہے +

فینیقی جو ایک سامی قوم تھے نہ اشوریوں کی طرح جنگجو تھے، نہ بابلیوں کی طرح مزارعین تھے۔ اُن کا ملک بحرِ متوسط پر ایک تنگ ساحلی خطہ تھا جس کی پیداوار بہت کم تھی۔ اُن کی تعداد تھوڑی تھی اور اسی لئے وہ اپنے زبردست ہمسایوں یعنی جنوب کے مصریوں مشرق کے اشوریوں اور شمال کے حطیوں کے حملوں کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ سمندر اُن کا میدان تھا اور وہ تاجر اور ملاح تھے۔ اُن کے دو بڑے بندروں ٹایر اور سدون کے جہاز بحیرۂ لیوآنت کا زر و دولت ادھر سے اُدھر منتقل کرتے اور سب سے زیادہ اپنے ملک کو اُس سے مالا مال کرتے تھے۔ امن و امان ان لوگوں کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ اسی لئے صرف ایک امن و عافیت کے لئے وہ کسی بڑی طاقت کا لوہا ماننے اور اُسے مطلوبہ خراج ادا کرنے پر ہر وقت رضامند تھے +

اپنی تجارت کے دوران میں فینیقیوں نے دور دراز کا سفر کیا اور مختلف ملکوں کے ساحلوں پر انہوں نے اپنی تجارت گاہیں قائم کیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور و اہم کارتھیج (قرطاجنہ) تھا جو افریقہ کے ساحل پر صقلیہ کے جزیرے کے مقابل میں واقع تھا۔ ان لوگوں نے جہاز سازی کے فن کو ترقی دی، مبادلے کا طریقہ سلجھایا۔ اور اوزان اور پیمایش کے نظام کو زیادہ مکمل بنایا۔ سب سے بڑی بات انہوں نے یہ کی کہ مصریوں کی "تمثالی تحریر" کو جس سے اُنہوں نے اپنے برتنوں پر نشان لگانے کا کام لیا، جِلا دے کر وہ حروفِ تہجی تیار کئے جو فی زمانہ مغربی دنیا میں رائج ہیں +

یہی لوگ تھے۔ جو بحرِ متوسط کے تمدن کو دور دراز نامعلوم خطوں تک لے گئے۔ ادھر ٹین کی تلاش میں وہ کئی سمندر پار برطانیہ تک جا پہنچے۔ اُدھر بحرِ احمر اور خلیج فارس کی بندرگاہوں سے وہ نکل کر بحرِ ہند اور بحیرۂ چین میں جہازرانی کرتے رہے۔ بلکہ بعض مؤرخین کا تو یہاں تک خیال ہے کہ وہ بحرالکاہل کے دور دور تک پھیلے ہوئے پانیوں سے گزر کر میکسیکو اور پیرو تک جا پہنچے جہاں انہوں نے دنیائے لیوانت کی "شمسی حجری" شائستگی کی روشنی پھیلائی +

فلسطین - جس طرح فینیقیا بحری تجارت کا گھر تھا اُسی طرح اس کے جنوب کی طرف کو فلسطین کی سرزمین ایک مشہور مذہب کا گہوارہ بن گئی - عبرانی لوگ جنہوں نے فلسطین کو اپنا وطن بنایا اُسی سامی نسل سے تھے۔ جس سے فینیقی اور اشوری تھے۔ وہ دراصل عرب کے مرغزاروں کے بدوی تھے اور اُن کی قوم کی اولین روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے "پدرسری" گھرانے اپنے بکریوں، بھیڑوں کے گلوں کو ہمراہ لئے چراگاہ بہ چراگاہ پھرتے رہتے تھے+ ہر گھر کا باپ اپنے گھرانے کا سردار ہوتا تھا۔ پدرسروں کا زمانہ تقریباً ۲۰۰۰ ق م کا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ مشہور بابلی بادشاہ حمورابی کے ہم عصر تھے۔ جس کا زمانہ ۲۱۲۳ تا ۲۰۸۰ ق م کا تھا - اس وقت کے بعد کی تاریخ غایت درجہ دُھندلی ہے - یہاں تک کہ ایک ہزار سال بعد حضرتِ ابراہیمؑ کو اپنا جدِّ امجد کہنے والے لوگ حضرت داؤد کی حکومت کے ماتحت (۱۰۱۵ تا ۹۷۵ ق م میں) فلسطین میں آبسے +

اس ہزار سال کے عرصے میں صحرانورد عبرانیوں نے کچھ صدیاں مصر کے نواح میں گزاریں - جہاں اُن کی زندگی مستقل اور مہذب رہی - جب ایک مخالف فرعون نے اُن کی حالت کو ناقابل برداشت بنا دیا۔ تو وہ مصر سے ہجرت کر گئے اور (شاید ۱۵۰۰ ق م کے قریب) انہوں نے سینا کے صحراؤں اور نخلستانوں میں پھر اپنی بدویانہ زندگی اختیار کر لی۔ دشت و صحرا میں مدتوں تک آوارہ رہنے کے بعد انہوں نے فلسطین کی زرخیز و شاداب سرزمین پر (جس میں اُس وقت انہیں کے ہم نسل کنعانی رہتے تھے) حملہ آور ہو کر اُسے اپنے قبضے میں لے لیا+ سینا میں اُن کی بود و باش کا سب سے عجیب نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا مذہبی شعور عمیق تر ہوتا گیا - چنانچہ جب وہ فلسطین میں داخل ہوئے تو انہیں یقین ہو چکا تھا کہ وہ خدا (یہووا) کی بہترین اور منتخب مخلوق ہیں +

کنعان کی فتح کا کام دشوار اور طول طویل تھا - اس کے دوران میں عبرانیوں پر بیرونی قوموں مثلاً مبدیوں نے صحرا کی طرف سے اور فلسطینیوں نے سمندر کی جانب سے (ممکن ہے کہ یہ لوگ ۱۲۰۰ ق م کے قریب کریٹ سے یہاں وارد ہوئے) حملہ کیا۔ اور انہوں نے ساحلی خطے پر قبضہ بھی کر لیا+ آبادکاری کے اولین دور میں عبرانیوں کے ہاں اُن کے قاضیوں کی حکومت تھی لیکن جب یہ لوگ فلسطینیوں سے برسرِ پیکار ہوئے تو اتحاد اور جنگی قابلیت کے حصول کے لئے اُن

میں بادشاہت قائم ہوگئی۔ حضرتِ داؤد کی قیادت میں اُنہوں نے فلسطینی طاقت کو توڑ دیا۔ بلکہ انہوں نے جبوسیوں سے (جو ایک کنعانی قوم تھے اور جو اس سے قبل عبرانیوں کے پے در پے حملوں سے مغلوب نہ ہوئے تھے) یروشلم کا شہر بھی چھین لیا +

اپنے آئندہ بادشاہ حضرتِ سلیمانؑ کے عہد میں (۹۷۰ تا ۹۳۵ ق م) اُن کی خوشحالی اپنے معراج پر پہنچ گئی۔ اُن کی موت پر وہ دو قبیلوں بنی اسرائیل اور بنی یہودا میں منقسم ہوگئے۔ بنی اسرائیل کو تو بہت سے انقلابات کے بعد اشوریوں نے مغلوب کر لیا جو انہیں ۷۲۲ ق م میں قید کر کے لے گئے اور اس طرح یہ لوگ ناپید ہوگئے + یہودا کی سلطنت ۵۸۶ ق م تک قائم رہی۔ اس کے بعد وہ بھی فتح ہوگئی۔ اس کا فاتح نئی بابلی سلطنت کا بادشاہ بخت نصر ثانی تھا۔ اس کے عناد کی وجہ یہ تھی کہ باوجود تنبیہ آمیز پیشین گوئیوں کے یروشلم کے حکمرانوں نے مصر کے بادشاہ سے جو بابلی بادشاہ کا دشمن تھا، ایکا کر لیا۔ یہودا کی بابلی قید تقریباً نصف صدی تک جاری رہی + پھر ۵۳۸ ق م میں وہ بڑے عجیب و غریب واقعات کے ساتھ انجام کو پہنچی + لیکن اس قید کے اثر یہودا کے لوگوں پر نہایت گہرے اور مستقل ہوئے + اُن میں اپنی قومیت برقرار رکھنے کا جذبہ تو برقرار رہا لیکن اُن کی ریاست مفقود ہو کر فقط ایک کلیسا رہ گیا +

بشیر احمد

دائمی آزادی

اپنے دنیاوی سالوں کی تنگ ندی میں میں اس زندہ تختے (یعنی) اپنے جسم کو چمٹا ہوا ہوں۔ پار ہو کر میں اسے چھوڑ دیتا ہوں! ...... اور پھر؟ میں نہیں جانتا کہ وہاں روشنی اور تاریکی یکساں ہوتی ہیں + غیب دائمی آزادی ہے + وہ اپنی محبت میں بے رحم ہے۔ وہ موتی کے لئے جو تاریکی کے زنداں میں بے زبان پڑا ہوا ہے گھونگھے کو توڑ دیتا ہے!

اے دلِ بیکس! تو سر بہ گریباں ہے اور اُن دنوں کو روتا ہے جو ہمیشہ کے لئے گزر چکے ہیں۔ تُو خوش ہو کہ ابھی آنے والے دن بھی ہیں۔

اے مسافر نوبت بج رہی ہے۔ اب وقت ہے کہ تو اپنا رستہ اختیار کرے۔ اُس کا چہرہ دوبارہ بے نقاب ہوگا، اور تیری ملاقات ہوگی!

گلچیں

لمعات

جب کبھی مُسکرا دیا تُو نے — درد کو کر دیا دوا تُو نے

میں اُسی ابتدا کی ہوں تمہید — جس کو لا انتہا کیا تُو نے

میں ہوں ممنون اے جفا پیشہ — دل کو غم آشنا کیا تُو نے

اک مسرّت ہے غم میں بھی حاصل — کر دیا خوگرِ جفا تُو نے

صاف آتی نہیں ہے اب آواز — نزع میں آہ کیا کہا تُو نے

وجہِ تسکینِ دل ہُوا جب درد — درد کو کر دیا دوا تُو نے

بڑھ گیا اور بھی حجابِ نظر — عام جلوہ اگر کیا تُو نے

منکشف کر دیئے حیات کے راز — خوب جب آزما لیا تُو نے

سُن کے مجھ سے مری حکایتِ دل — کیا کیا مُسکرا دیا تُو نے

وجہِ ماتم ہے حاسدوں کے لئے — مجھ کو جادو نوا کیا تُو نے

تیری ہمت پہ آفریں ثاقبؔ
تھا جو دل میں وہ کہہ دیا تُو نے

سیّد ابو محمد ثاقبؔ کانپوری

کیا؟

مجھے کچھ کہنا ہے مگر جو کچھ کہنا ہے اُسے اگر بالکل کھلے کھلے لفظوں میں کہدوں تو لوگ اسے اس قدر گول ہول تصور کرینگے کہ میرا مطلب فوت ہو جائیگا۔ لوگ لائق ہیں اور اپنی ذہانت سے معمولی سی معمولی بات کو بھی عقدِ ثریا سے ورے نہیں چھوڑتے مگر مجھے آسمان کے تارے نہیں توڑنے۔ مجھے تو سیدھی سی بات کہنی ہے۔ وہ بھی اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں اور اردو سمجھنے والوں سے لیکن اسی لئے اس بات کو سات دیباچوں کے بعد پردے ہی پردے میں کہوں گا۔

(۲)

جسم۔ "روح! تو جا رہی ہے؟ سچ مچ؟ اچھا سدھارو۔ رستہ، سنا ہے ایسا ویسا ہی ہے، دیکھ کر چلنا۔ جو بات بیت گئی اس کا ذکر فضول ہے مگر تو نے مجھے بہت دُکھ دیئے اور اس پر بھی ہمیشہ تجھے معاف کیا گیا۔ اب بھی معاف کرتا ہوں۔ میں تو آرام کرتا ہوں اور یہ جو تم نے آوارہ گردی کی ٹھانی ہے سو تمہاری مرضی! کیوں میری طرح آرام نہیں کرتی ہو؟ کہاں ماری ماری پھرو گی؟ کیا کہا کہ سفر لازمی ہے! تھا'.......ہوگا'.........ہم تو تھک چکے...... اچھا ایک آخری بات سن لے۔ امتحان میں پڑتی ہے غلطی کرتی ہے۔ میرے ہی امتحان میں تو فیل ہو چکی تو اور کسی کے امتحان کا تجھے کیا یارا ہے!۔ کم بخت سو سو دفعہ تجھے رعایتی نمبر ملے کہ تو فیل نہ ہو۔ کئی دفعہ محض سفارش سے تو اوپر والی جماعت میں بھی چڑھائی گئی مگر جس طرح امیرزادوں کی معمولی تعلیمی ترقی یہی ہوتی ہے۔ کہ پرائمری فیل، مڈل فیل، انٹرنس فیل، نالائقی پاس اسی طرح تو بھی مذہب فیل، معاشرت فیل، سُکھ فیل اور دُکھ پاس رہی۔ اُف تم نے مجھے کیا کیا نہیں ستایا؟ جا اب دور ہو۔ جہاں کی تو لعنت ہے وہیں جا۔ میں اب چین سے پاؤں پھیلا کر سوؤں گا۔

روح۔ کیا تم سب کچھ کہہ چکے؛

جسم۔ سب کچھ۔

روح۔ آج تک کیوں نہ کہا؟ کیا مجھ پر رحم کیا؛

جسم۔ او بیوقوف! رحم نہ کرتا تو کیا کرتا؟ کیا کہتا؟ مجھ پر تو صرف ہمعصروں کا اور تیرا ظلم تھا مگر تجھ پر مُردے بھی سوار تھے۔

سقراط نے یہ کہا، ارسطو نے یہ بکا، ڈارون کی لن ترانیاں یوں تھیں - یہ تھا تیرا شغل - جسے اس جنجال میں مبتلا دیکھتا اُس پر رحم نہ کرتا تو کیا کرتا؟ -

روح - ہلّٰہ مجھے معاف کرو - کاش کہیں رہ سکتی! اگر کچھ اور رہنا ہوتا تو ضرور تلافی کی کوشش کرتی مگر جھان مُردوں نے کہیں کا نہ رکھا - مُردوں کے فریب میں آ کر زندوں کو ستاتی رہی - افسوس!

(۳)

زندگی کا مُنایہ ہے کہ اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ضروری ایثار کی طاقت نہ رہے - شباب کا مُنایہ ہے کہ گناہ کی اُمنگ باقی نہ رہے - نیکی اُس شکست کا نام ہے جو ماحول کے پے در پے حملوں سے فطرتی انسانی جذبات کو روزانہ نصیب ہوتی ہے - وہ جوانا مرگ جذبات جنھیں اس شکست کا اوائلِ عمر ہی میں مزا چکھنا پڑے اندر ہی اندر سانپ کی طرح بِس گھولتے رہتے ہیں -

(۴)

اس دنیا میں پھول اور پھل ایک ہی وقت ایک ہی درخت میں صرف کہیں کہیں ساتھ ہوتے ہیں ورنہ عام طور پر پھول محض آنے والے پھل کی آرزو کا ایک شگفتہ سا اظہار ہیں - اسی طرح بچپن ایک شغل بیکاری ہے - شباب کے کھیل کا ایک بھڑکیلا مگر پھٹ جانے والا اشتہار ہے -

(۵)

پہلے موت، پھر شباب، پھر بچپن! یہ کیا الٹ پھیر ہے؟ کوئی الٹ پھیر نہیں - ایک مردِ خدا کو القا ہوا کہ انسان نہیں مرتا - صرف وقت مرجاتا ہے - اِس عارف نے اپنی ریاضت کے زور سے وقت کو از سرِ نو زندہ کیا مگر شومئ قسمت سے وقت کی گھڑی میں الٹی طرف چابی لگ گئی یعنی بجائے آگے بڑھنے کے وقت پیچھے ہٹنے لگا - جس مرید کو اس حال سے آگاہی ہوئی اس کا ایک ہی نعرہ ہے :-

"میں خدا کی طرف اُلٹے پاؤں جا رہا ہوں!!!"

(۶)

میرا مولوی بھی یہی کہتا ہے کہ تیرہ سَو سال پیچھے ہٹ جاؤ - موجودہ صدی فضول ہے اس سے پہلی لایعنی تھی - اُس سے پہلی کا خیال نہ کرو - جو اُس سے پہلی ہیں اُن کو بھی بُھلا دو اور پورے تیرہ سَو سال اُگل دو - آمنّا و صدقنا - مگر خدا کی جانب سامنی طرف کا راستہ کیا بند ہے؟ -

(۷)

ایک عیش نصیب حضرت کو یہ رنج ہے۔ کہ ان کا دوست غمگین ہے اور اظہار ہمدردی کو اولی ترین انسانی فرض سمجھ کر یہ حضرت بھی عیش کی حکمرانی چھوڑ چھاڑ آہ و بکا میں مصروف ہیں۔ یعنی ان کا آئین وفا یہ ہے کہ دوست خوش نہیں تو ہم بھی خوشی کو لات ماریںگے۔ دراصل سارے کا سارا ایشیا ہی اسی نہج پر ہے۔ نمازی کو جب تک دنیا میں ایک بھی بے نماز نظر آتا ہے چین نہیں آسکتا اور لطف یہ ہے کہ جتنی نمازیں لمبی ہوتی ہیں جوں جوں نمازی زیادہ ہوتے ہیں، اُسی قدر یہ بےچینی بڑھتی ہے۔ یعنی ایشیا میں ایک غم یا ایک گناہ بہت سی خوشی بہت سی عبادت کو لے مرتا ہے۔ یہ کیوں نہیں ہوتا کہ تھوڑی سی عبادت بہت سے گناہوں کو لے مرے یعنی اس طرح کہ جس قوم میں ہزار میں سے ایک نمازی ہو وہ قوم اپنے تمام افراد کو ہی نمازی سمجھ لے؟ گناہ کا وار نیکی پر اس قدر کاری کیوں ہے اور نیکی کا جادو بدی پر کیوں نہیں چلتا؟ کیوں کوئی غمگین کسی عیش نصیب دوست کا خیال کر کے اپنے آپ سے یوں مخاطب نہیں ہوتا؟ "میرا دوست خوش ہے گویا میں ہی خوش ہوں۔ میرا اولین فرض یہ ہے کہ اپنا غم چھپا کر اُس کی خوشی بڑھاؤں"، اور کیوں خوشی کا شہسوار یوں نہیں کہتا "چونکہ میرا دوست غمزدہ ہے۔ اس لئے مجھے اور بھی زیادہ خوشی کا اظہار کرنا چاہئے تاکہ دوست کا غم زیادہ نہ ہو"، مگر یہ کبھی نہیں ہوگا۔ صدیوں سے "دل کے کریں آہ وزاریاں" والی بلائے بد ایسی بُری طرح اس رسم زدہ برّاعظم کے گلے پڑی ہے کہ اب چھٹکارا مشکل ہے۔ خود زبان چیخ رہی ہے کہ جن لوگوں میں "ہمدردی" کا لفظ ہے مگر "ہم مسرتی" کسی نے آجتک نہیں بولا اُن میں درد عام ہوگا مسرت کا نام نہ ہوگا کیا اس سے صاف ظاہر نہیں کہ ایشیا کی دنیا کو جسمانی خوشی کے رسول کی ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ایشیا میں روحیں ڈھلتی ڈھلتی اس قدر پتلی پڑ گئیں ہیں کہ اب تقریباً ناکارہ ہیں۔ بالخصوص اس خیال سے کہ ایشیا کے روحانی دھوبی ابھی تک پرانے طریقے سے روحوں کو عذاب کے پتھر خوف کے تختے پر زور زور سے پٹختے ہیں۔ دھوبی کا کیا جاتا ہے مگر روحیں ہیں کہ چمک اور استری تو کجا جو چرنے پھٹنے سے بچے اسے گائے چبائے جاتی ہے۔ کاش کہ مسلمان اس رسوم کی گائے کو قربان کردیں مگر آمدیم برسر مطلب۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایشیا میں ایسا ہادی پیدا ہو جائے جو پیرس کے باکمالوں کی طرح۔ . . . . [یادش بخیر۔ پہلے پیرس کو آنکھیں بند کر کے دیکھ لوں۔ ایشیا میں خوشی حرام ہے وہاں غم حرام ہے۔ یہاں کسی آنے والی دنیا کی خوشی کا تقاضا ہے کہ گریہ نیم شبی پر زور ہو مگر پیرس کے شبستانوں میں اس جانے والی دنیا کی داد میں رقص و سرود و خندۂ فراواں کی دلفریبی ہے۔ ہم اس دنیا کو لات مارتے ہیں وہ اسے گلے لگا کر پیار کرتے ہیں (دنیا سب جگہ عورت ہے صرف سلوک کا فرق ہے) مگر پیرس کو اس طرح کیوں یاد کیا جائے۔] پرانی سے بدرانی

روحانی قمیص کو ہر ہفتے چمکا دے مگر مشکل یہ آن پڑی ہے کہ یارانِ وطن شدھی کی دُھن میں ہیں۔ افغانی شلوار تو خدا خدا کر کے پتلون بن چلی ہے مگر ہندوستانی تہمد کی خیر نہیں۔ آج دھوتی کل لنگوٹی۔ [سنتا ہوں کہ مدراس میں کوئی مولانا کسی پنڈت جی کے پاؤں پڑے۔ اس ہم مسرّتی کے سوانگ سے بھی خدا بچائے]

مجھے کچھ کہنا تھا مگر کہہ نہ سکا۔ وہ مائیں پیدا نہیں ہوئیں جن کے بچے اسے سن سکیں۔ دنیا سے میں ناراض نہیں۔ جیسی بھی ہے اچھی ہے اور بچاری بہتر ہونے کی کوشش میں سرگرداں ہے۔ دنیا والوں سے میں ناراض نہیں۔ جہاں بھی ہیں جھوٹے ہیں اور جو جھوٹا ہے سو اچھا ہے۔ مگر جب ایشیائی میلا کچیلا جھوٹ یورپ کے زرق برق دروغ میں تبدیل ہو جائیگا تو پھر دنیا میں آہ و زاری کی آواز کہاں سے آئیگی؟۔ آنسوؤں کے شیدائی پھر کہاں تیس مار نانی کرینگے؟ اس دنیا کی قسمت میں اگر ایک ابدی تبسم بننا لکھا ہے۔ تو کیا رونے والوں نے یونہی اپنی عمریں کھوئیں؟

کیا؟ کیا؟؟ کیا؟؟؟

فلک پیما

مُحبت

پیارے مجھ سے تھوڑی محبت کر لیکن ہمیشہ کے لئے۔

اے محبت! اے پیاری اور ننھی سی!

محبت محبت کا مفہوم سمجھ لیتی ہے اُسے کسی ترجمانی کی ضرورت نہیں۔

تمہاری خواہشیں پاکیزہ ہوں اور تمہاری محبت گہری۔

جس کسی نے محبت کی پہلی نظر ہیں کی۔

گلچیں

تکمیلِ محبّت

(۴)

سجّاد ایک تھرڈ ایر کلاس کا طالب علم تھا۔ اُسے علی گڑھ میں آئے تین سال ہونے کو تھے۔ وہ علی گڑھ کی مخصوص خوبیوں سے مزین اور وہاں کی سیاسیات سے خوب آگاہ ہو چکا تھا۔ ایک روز وہ اسٹریچی ہال کے قریب گزر رہا تھا کہ اُس نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سر سید کورٹ میں کھڑا سر اُٹھائے ٹکٹکی باندھے ہال کو دیکھ رہا ہے۔ جب وہ پھر آیا تو اُس نے دیکھا کہ اب یہ حضرت جامع مسجد کے آگے ڈٹے کھڑے ہیں اور اُسی طرح بہ غور و خوض اُس کا مطالعہ کر رہے ہیں حیران ہوا کہ کیا ماجرا ہے یہ کوئی امریکی سیاح ہیں؟ لیکن امریکی تو اتنی دیر میں ساری کی ساری دہلی اور شاید تاج محل بھی دیکھ جائیں یہ سست رو آدمی ضرور کوئی مشرقی خیال پرست ہیں جن کے دماغ کا کوئی نہ کوئی پرزا ڈھیلا ہو گیا ہے۔ اور بلاشبہ وہ ایک "کالے آدمی" تھے اور طرزِ لباس سے ایک معمولی طالب علم۔

سجّاد نے کہا اِن عجیب الخلقت کا سراغ لگانا چاہئے کہ ان کا دولت کدہ کون سے نمبر کمرے میں ہے؟ کیا عجب ہے کہ علی گڑھ کی غیر دلچسپ فضا میں ہمارے لئے اِس سے کچھ دلچسپی کا سامان پیدا ہو جائے۔

جمیل جب سے علی گڑھ آیا تھا اُس کے در و دیوار کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں کے کھلے وسیع کورٹ، وہاں کے ہال، وہاں کی مسجد، وہاں کے گراؤنڈ اور میدان، لباس کی یکسانیت، ترکی ٹوپیاں، طالب علموں کی یگانگت، آزاد خیالی اور خودداری سے وہ غایت درجہ متاثر ہوا۔ اُس کی طبیعت سچے اسلامی جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسلامی تاریخ میں اُس نے مسلمانوں کے شاندار کارنامے گویا آنکھوں دیکھے تھے۔ امیر علی کی تصنیفات "روحِ اسلام" اور "مختصر تاریخِ عرب"، شبلی کی "الفاروق" اور "الغزالی"، عبد الرزاق کی "البرامکہ"، حالی کی "مسدس" اور ایسی ہی چند اور شہرۂ آفاق کتابیں نہ صرف اُس کے مختصر سے کتب خانے میں شامل تھیں بلکہ اُس کے دل و دماغ کی زیب و زینت بنی ہوئی تھیں۔ فاروقِ اعظم کا راتوں کو گشت کرنا، صلاح الدین کا عدالت میں جواب دہی کے لئے آ کھڑا ہونا، طارق کا آبنائے جبل الطارق کو عبور کر کے سپین میں جا دھمکنا، قرطبہ و بغداد کی علمی و ادبی مجلسیں، غزالی و رومی، بو علی سینا و ابنِ رشد کی مذہب آرائیاں اور فلسفہ پیمائیاں، عرب کے صحرا، الحمراء و القصر کے محلات، ازہر و ایا صوفیہ کی مساجد جو اس کے نفس میں جاگزیں ہو چکی تھیں سب علی گڑھ کے نظارے سے گویا ایک آن کی آن میں اس نوجوان خیال پرست مسلمان کی نظروں میں پھر گئیں +

کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عارضی طور پر اپنی سب قلبی کلفتیں بھول گیا ہے۔ اُسے ایک نئی دنیا مل گئی ہے جس میں وہ محوِ تماشا ہے۔

چند روز کے بعد جمیل کے کمرے کے دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی اور ایک وضعدار معتبر صورت طالب علم اندر داخل ہوا۔ جمیل استقبال کو اُٹھا۔

طالب علم۔ السلام علیکم۔ کہو بھئی اچھے ہو؟ کب علی گڑھ آنا ہوا؟

جمیل۔ (تعظیم و تکریم کے لہجے میں) جناب میں ایک ہفتہ ہوا حاضر ہوا ہوں۔ میں آپ کا بےحد ممنون ہوں کہ مجھ ناواقف اجنبی پر آپ نے یوں عنایت فرمائی۔

طالب علم۔ ناواقف! ہاں ناواقف تو آپ معلوم ہو ہی رہے ہیں ورنہ علی گڑھ میں یوں ادب سے گفتگو کرکے اپنی مٹی پلید نہ کریں اور "اجنبی پنے" میں تو آپ کنجوس سیاحوں یا کسی عالمِ اثریات کے ہم پایہ ہیں۔ بھائی تمہاری نظربازی ہی مجھے یہاں کھینچ کر لے آئی ہے کہ مجھے بھی وہ کچھ دکھا دو جو تم نے جمعہ جمعہ آٹھ روز میں یہاں دیکھ پایا ہے۔ اور جو میں تین سال سے تلاش کر رہا ہوں مگر کہیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اور باقی کیا علی گڑھ کا ایک طالب علم اور کیا اُس کی عنایت فرمائی کا شکریہ؛ عنایت تو تم سے فاضلِ اجل و ناظرِ اکمل کی ہے کہ مجھ سے سہ سالہ طالب علم کو اپنی بزرگانہ صحبت سے مستفید ہونے کا موقع دیا ہے۔

جمیل۔ آپ کا اسمِ مبارک؟

طالب علم۔ اسمِ فاعل اسمِ تفضیل اسمِ حالیہ وغیرہ سے تو شاید کسی کو یہاں کے اسکول میں تھوڑی بہت آگاہی ہو بھی مگر واللہ اسمِ مبارک علی گڑھ کی کسی قواعد میں تمہیں نظر نہ آئے گا۔ مجھے سجاد کہتے ہیں۔ اور تمہارا وہی اسمِ مبارک؟

جمیل۔ (شرما کر) جمیل۔

سجاد۔ اچھا تو جمیل آؤ میں تمہارے دماغ سے پرانے زمانے کی بوسیدہ تاریخ کے اوراق نکال کر وہاں کچھ جدید معلومات کا اضافہ کروں۔ بھائی! یہ اسٹریچی ہال یہ بارکیں یہ مسجد بھی سب محض گارے اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ ہال میں جلسے ہوتے ہیں جہاں بڑے بڑے آدمی نئی اور پرانی وضع کے چست لباس پہن کر ایک دوسرے کو دھوکا دینے آتے ہیں۔ بارکوں میں آوارہ گردی ہوا کرتی ہے اور مسجد غریب طالب علموں سے جرمانے کی زکوٰۃ وصول کرنے کی تاوان گاہ ہے اور بس باقی یہاں مجھ سے نوجوان ہیں اور کچھ اُن کی خوشامد کرنے والے پروفیسر اور پرنسپل۔

جمیل۔ لیکن بھائی سچ بتاؤ کہ یہاں کا انتظام تو نہایت اہتمام و توجہ سے ہوتا ہوگا۔ ایک مکمل دارالعلوم کا چلانا کوئی

معمولی بات نہیں ۔

سجاد ۔ انتظام یہاں ہر ایک کا کیا جاتا ہے بڑی توجہ سے تکمیل یہاں ہر شے کی ہوتی ہے یہاں تک کہ سیاست کی بساط بھی بچھی رہتی ہے ۔ اور یہ نرا دارالعلوم نہیں یہاں فنون ولطائف ومزخرفات کی ساخت پرداخت بھی ہوتی ہے ۔

جمیل لیکن آخر یہاں کے اربابِ حل وعقد بڑے باتدبیر ہوں گے ۔

سجاد باتدبیر؟ باتقدیر کہو تو بات بھی ہے ۔ اور بھائی یہاں کے ربِّ حل وعقد کے آگے تو ربِّ ارض وسما کی دال بھی نہیں گلتی ۔ لیکن خیر تم ابھی بچے ہو ۔ تم کیا سمجھو علی گڑھ کی ان سیاسیات کو ۔ بس چھوڑو یہ قصّہ اور سمجھ لو کہ علی گڑھ لاہور سے کسی صورت بہتر نہیں اور بدتر نہ ہو تو غنیمت ہے ۔ ہاں تم سے ہزار ڈیڑھ ہزار مسلمان نوجوان یہاں آ وارد ہوں تو شاید اس فضا میں کچھ تبدیلی واقع ہو جائے ۔ لیکن خیر آؤ ہم تم کوئی کام کی بات کریں ۔

یہ باتیں ہو کر دونوں دوست باہر چلے گئے اور پھر یہی معمول ہو گیا کہ سجاد اور جمیل عموماً اکٹھے رہتے ۔ سجاد کی صحبت جمیل کے لئے مفید ثابت ہوئی ۔ یہ ضرور ہؤا کہ علی گڑھ کے متعلق جو منصوبے اُس نے باندھے تھے وہ سب خاک میں مل گئے اور اس سے چند دنوں کے لئے وہ ملول و مایوس سا ہو گیا کہ میں جس بت کو اپنی پرستش کے لئے کھڑا کرتا ہوں ۔ فوراً اُس کا کوئی بت شکن آ دھمکتا ہے ۔ لیکن سجاد کے اثر سے وہ کبھی کبھی اپنے خیالات کے خول کے اندر سے زبردستی باہر کو کھینچ لیا جاتا جس سے نہ صرف اُس کے خیالات کو وسعت ہوئی بلکہ دل لگی کا ایک اچھا خاصہ سامان پیدا ہو گیا ۔

پھر بھی ثروت کا خیال بھلائے نہ بھولتا تھا ۔

ایک روز علی الصباح سجاد جمیل کے کمرے میں آیا ۔ جمیل سو رہا تھا ۔ سجاد نے عمداً اُسے نہ جگایا اور اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تو میز پر دیوانِ حافظ پڑا تھا ۔ کھولا تو اُس صفحہ کے اندر سے ایک کاغذ نکلا جس پر یہ غزل تھی کہ

ترسم کہ اشک در غمِ ما پردہ در شود ۔۔۔ ویں رازِ سر بہ مُہر بہ عالم سمر شود

گویند سنگ لعل شود در مقامِ صبر ۔۔۔ آرے شود ولیک بہ خونِ جگر شود

کاغذ کے پرزے پر یہ عبارت لکھی تھی :-

آہ ث . . . میری تیرے لئے محبت بے غرض ہو اور پاک وصاف !

آہ ث . . . میری تیرے لئے محبت پُرخلوص ہو اور نرم و خاموش !

میں تجھ سے محبت کروں اور کرتا رہوں

میں تیری پرستش کروں اور کرتا رہوں

آہ ش . . . میری تیرے لئے محبت کامل ہو اور پائدار !
آہ ش . . . میری تیرے لئے محبت صادق ہو اور خوددار !
تیرے پیار میں میرا دل تجھ پر نثار ہو !
تیرے خیال میں میرا ہر خیال تجھ سے سرشار ہو !
آہ اے میری پہلی دلبر ! اے تو حسن کی شمع !
اے تو محبت کی دیوی ! اے تو صداقت کی پتلی !
آہ ش . . . کیا اب میرا تیرا رستہ جدا جدا کیا اب میرا تیرا نصیبہ
الگ الگ ہے ؟
اگر ہے تو
پھر بھی ش . . . خدا کرے میں تجھ سے محبت کروں اور کرتا رہوں
پھر بھی ش . . . خدا کرے میں تیری پرستش کروں اور کرتا رہوں
اور
میری تیرے لئے محبت بے غرض ہو اور پاک و صاف
اور تیری میرے لئے اُلفت بیدار ہو اور نرم و خاموش !

چپکے سے یہ پرزا جیب میں ڈال کر سجاد چلتا بنا۔ گھنٹے بھر کے بعد پھر آیا تو دیکھا کہ جمیل نے کمرے کا سب سامان تہ و بالا کر رکھا ہے اور کچھ تلاش کر رہا ہے۔

سجاد کوئی نوٹ گم ہو گئے یا کوئی پالتو بلی کہیں چھپ گئی ؟

جمیل (پریشان ہو کر) نہیں ایسے ہی والد کا ایک خط تھا جو ڈھونڈ رہا ہوں۔

سجاد جی وہ تمہارے والد کا خط تو میں نے تمہارے والد بزرگوار ہی کی خدمت میں واپس بھیج دیا ہے۔

جمیل (کھسیانا ہو کر) ہیں بھائی سجاد ! یہ کیا ! بھئی سچ سچ بتاؤ۔ تمہیں قسم ہے۔ وہ تو ایسے ہی کچھ خیالات تھے خط نہ تھا

سجاد وہ میں اُسے پہنچا دوں گا جس کے لئے لکھا تھا۔ لیکن یار تم تو بڑے مکار و عیار نکلے۔ بالکل غیر مسلم۔ ہاں خیالات ہی تھے۔ شاید علی گڑھ میگزین کے لئے کچھ لکھا تھا ؛ ایڈیٹر تمہاری تین نقطوں والی کا گلا کاٹ دے گا جب جا کر

تمہارے باقی ماندہ مسودے پر نگاہ ڈالے گا۔

جمیل سجاد کیا کہوں!

سجاد ارے بھائی مسلم اِس طرح چھپ چھپ کر خیالات بنا بنا کر دلبر کی غیر حاضری میں روتا نہیں وہ اُسے ہر طریقے سے جیت لینا چاہتا ہے۔

جمیل تو پھر میں واقعی کچھ غیر مسلم سا ہوں۔

سجاد تمہیں میری قسم مجھے بتاؤ آخر یہ کون بھلا مانس ہے جس کی بیٹی تمہاری نظر پڑ گئی؟

جمیل تم تو مذاق اُڑاتے ہو اور اِن چیزوں کا مذاق ہی اُڑانا چاہیئے کہ اِن کی سنجیدگی صرف اُن کے لئے ہے جن کے دل محبت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں۔

سجاد جمیل میں ایک مسخرا ہوں اور دنیا کو مسخروں کی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ تمہاری اس رنگین نوائی (خط جیب سے نکال کر جمیل کو دے دیتا ہے) کو دیکھ کر جس کے لئے میں دل سے معافی کا خواستگار ہوں میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنا رازدار سمجھو اور مجھے بتاؤ جو کچھ بھی تمہارے دل میں ہے۔

جمیل (ایک آہ بھر کر) سجاد تم سنجیدہ بن کر مجھے کیوں رنجیدہ بناتے ہو۔ میں اک خیال پرست ہوں اور دنیا کو خیالات و تصورات کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ لیکن کیا مقامِ شکر نہیں کہ تمہارے تفنن سے میری سنجیدگی کچھ کم ہوئی۔ اب تم سنجیدہ بن گئے تو میں کیا کروں گا؟

سجاد کیا اُس لڑکی کو تمہارے کسی عزیز نے دیکھا ہے اور کیا وہ اُس سے تمہاری شادی پسند کریں گے؟

جمیل یہ میری چچازاد بہن ہے۔ میرے عزیزوں کو مجھ سے بھی زیادہ اُسے دیکھنے کا موقع ملا ہے (ملاحظہ ہو کہ نگاہوں کی مجموعی تعداد وحدت سے اندازہ لگایا جاتا تو یہ سرتاپا غلط تھا) اور شادی کا کیا پوچھتے ہو۔ بھائی میرا شمار شادی پسندوں میں نہیں۔

سجاد اللہ اکبر! تم گاندھی کے پیرو کب سے ہو گئے اور اُس بھلے مانس مہاتما نے بھی شادی کے بعد ازدواجی تعلق کے خلاف لیکچر دینے شروع کئے۔ لیکن تم مہاصوفی شادی سے پہلے ہی اُس کے مشاہدے سے بھی بیزار ہو گئے۔ خدا کے واسطے عقل کے ناخن لو۔ بھئی اسے ہنسی ٹھٹھا نہ سمجھنا۔ یہ ایک نہایت اہم بات ہے جس کا اثر تمہاری ساری زندگی پر پڑنے والا ہے۔ خدا کے لئے ذرا ہوش میں آؤ۔ کہیں کسی سادھو سے پرستان کی کوئی جڑی بوٹی لے کر تو نہیں نگل لی؟

جمیل اگر یہ دیوانہ پن ہے تو شروع سے اخیر تک میری ساری زندگی محض دیوانہ پن اور میرے سارے منتہائے نظر فقط سراب نظر ہیں۔

سجاد یقیناً، بلاشبہ! تم تو مسلم ہو یہ غیر مسلمانہ روش کب سے اختیار کی؟

جمیل کیا کسی شخص کو کسی دوسرے سے الفت یا محبت نہیں ہو سکتی جب تک شادی کا دلال بیچ میں آکر سودا نہ کرائے؟ گویا مسلمان صرف شادی کر سکتا ہے بغیر محبت کے اور محبت نہیں کر سکتا مگر شادی کی حالت میں۔ پھر دوستی بھی ایک بے معنی تعلق ہے؟

سجاد ارے میاں ذرا کبھی لغت بھی اٹھا کر دیکھ لیا کرو۔ دوستی مردوں مردوں اور عورتوں عورتوں میں ہوتی ہے پیار ماں کو بچے سے ہوتا ہے یا بچے کو ماں سے اور اُنس آدمی کو آدمی سے۔ لیکن محبت یا عشق صرف مرد کو عورت یا عورت کو مرد سے ہوتا ہے اور یہ اُسی وقت جائز ہے جب عقد کی مہر اُس پر لگ جائے!

جمیل تو گویا محبت یا عشق تولیدِ جنسی کا اجارہ دار ہے اور بس؟

سجاد بھائی جمیل میں یہ نہیں کہتا کہ اس معصوم لڑکی سے محبت نہ کرو۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اُس بیچاری سے دل لگا کر اُس سے یوں دست بردار نہ ہو جاؤ۔

جمیل میں دل لگانے والوں میں نہیں۔ میرے دل میں تو محض اُس کی طرف محبت کا اک پاکیزہ جذبہ ہے۔ وہ جس کی قسمت میں ہوگی، جسے اُس کے والدین دینا چاہیں گے اُسے مل رہے گی۔

سجاد یہی سہی تو اسے کیوں محض اُس کے والدین کی مرضی پر چھوڑتے ہو۔ شاید تمہیں اُس کی خوشی کے بہترین کفیل ہو سکو۔ کیا اُسے یوں چھوڑ دینا اُس سے محبت کرنا ہے؟

جمیل سجاد اگر یہ محبت شادی کی غرض سے ہوتی تو بھی میں اُس کے قابل کب تھا! میرا جسم منحنی ہے میرا دل تاریک ہے نہ میرے پاس زیادہ زر و مال ہے نہ کسی رتبے یا عہدے کا رعب و داب۔ خدا گواہ ہے میں کسی طرح بھی اُس کے قابل نہیں!

سجاد میں سمجھ گیا تم اُن بزدل ناخود شناس خیال پرستوں میں سے ہو جو اپنے تئیں کسی شے کے قابل نہیں سمجھتے اور اسی لئے کسی شے کے قابل بنتے نہیں۔ اور اگر بنتے بھی ہیں تو اس سے دنیا یا دنیا والوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ وہ انڈے کی طرح اپنے اندر ہی رہتے ہیں۔ وہ کیا ہوئے اور کیا نہ ہوئے۔ اُنہیں دنیا سے غرض نہیں تو دنیا کو اُن سے کیا غرض؟ فی الحقیقت اُن کا دنیا میں رہنے کا حق ہی کیا ہے۔ وہ اپنے فطری فرائض کو ادا نہیں

کرتے بلکہ زندگی سے جی چُراتے ہیں۔ بھائی زندہ وہی ہیں جو زندہ دل ہیں، انسان وہی ہیں جو دوسروں سے تعلقات پیدا کریں نہ کہ فقط اپنے خیالات و تصورات میں محو رہیں۔

جمیل ثروت اور مجھ سے شادی! نہیں سجاد ناممکن قطعی ناممکن۔ وہ میری ہمیشہ کے لئے میری ہے۔ وہ وہاں نہیں جہاں ہے وہ میرے دل میں موجود ہے اور وہ میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے نہ ہو سکتی ہے۔ میں دنیا میں اپنا کام کرتا ہوں کئے جاؤں گا۔ مجھ سے اَوروں کے لئے جو کچھ ہو سکے گا میں کروں گا۔ تمہارے نقطۂ نظر سے بھی دیکھوں تو ابھی میں طالب علم ہوں مجھے پڑھنا پڑھانا ہے۔ ابھی میں کیا ہوں کہ اپنے تیئں اُس کے لئے پیش کروں۔ لیکن میرا دل اُس کے وجود کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے۔

سجاد اچھا جمیل چھوڑو یہ قصہ بھئی آؤ باہر چلیں۔ اگر کہیں ہمارے پروفیسر آف فلاسفی مل گئے تو اُن سے اِس نفسیاتی اُلجھن کے سُلجھانے کا طریق پوچھیں گے۔

---

(۵)

محبت ایک نسوانی جذبہ ہے!

محبت حسن ہے اور حسن عورت اور اس لئے صرف عورت ہی صحیح محبت ہے!

پھر اگر عورت میں محبت نہیں تو وہ محض ایک چینی کی مورت ہے جیسے اگر مرد میں ہمت نہیں تو وہ فقط ایک آہنی بت ہے!

انسانی فطرت کے دریائے جذبات کا سرچشمہ محبت ہے جس کی نُزہت گاہ عورت کا دل اور جس کا آبِ رواں عورت کے آنسو ہیں!

عورت حُسن کا پھول ہے اور اس پھول کی خوشبو محبت ہے، مرد کا چمنِ حیات اسی پھول سے آراستہ اور اُس کی فضائے دل اسی کی نکہت سے معمور و معطر ہے!

دنیا کے چمنستان میں مہک اسی پھول سے ہے اور چہک اسی پکھیرو سے۔ اور اس مہک اور اس چہک سے وہ عالم انبساط پیدا ہے جس کا نام بہارستانِ زندگی ہے!

دنیا میں جب پہلا انسان پیدا ہوا تو اُس نے عورت کی آنکھوں سے محبت کی زبان سیکھی۔ یہی وہ زبان تھی جس

کی بدولت خلوص کے الفاظ ہمدردی کے جملے اور ایثار و نیکی کے منظومات بزمِ تمدن میں نطقِ فطرت سے ادا ہوئے اور گنبدِ افلاک میں گونج اُٹھے!

دُنیا اک ظلمت کدہ ہے جسے محبت کی شمع منور کرتی ہے اور انسان کا دل ایک صدف ہے جس کی ساری آب و تاب صرف محبت کے دُرِ شاہوار سے ہے۔

اور عورت جس کا سینہ محبت کا کعبہ ہے جب سچی محبت کرتی ہے تو سراپا محبت ہو جاتی ہے۔ اس شمع کا شعلہ جب بلند ہوتا ہے تو یہ شمع محض اپنا شعلہ بن کر رہ جاتی ہے۔

ثروت اک رنگین و زرّین نوشگفتہ پھول کی طرح بچپن کے گلزار میں لہلہا رہی تھی کہ جمیل ایک بلبل شیدا کی مانند اُس خوش منظر روش پر آ کر اُڑان بھرنے لگا جس کی ساری رونق ثروت کے دم قدم سے تھی۔ اپنے گل کا نظارہ دیکھ کر بلبل نغمہ زن ہوئی، اپنی بلبل کا نغمہ سُن کر پھول میں وہ نکہت پیدا ہوئی جس سے دونوں کا باغِ زندگی پایان کار معطر و سرشار ہونے والا تھا۔

ثروت کے دل میں کچھ دیر سے طفلانہ موانست کی وہ لہریں سطحِ خیالات کے نیچے متحرک تھیں جن کا ابھی اُسے خود بھی علم نہ تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ کسی دوسرے کے لئے بھی انہیں حسنِ طفلی کی فطری شوخیوں سے علیحدہ تصور کرنا دشوار تھا۔ جب جمیل "علیم منزل" میں آ کر رہنے لگا اور دن رات اُس کی نظروں سے محبت کی کرنیں جلوہ ریز ہوئیں تو پہلے پہل بے جانے ہوئے ثروت کے دل سے الفت کی وہ رقیق ہوائیں اٹھیں جن سے زندگی کی فضا میں ایک روز دھواں دھار گھٹائیں چھا جانے والی تھیں۔

بہت سے نوجوان ثروت کے پیشِ نظر تھے لیکن قُربت و ہم نشینی کا اثر کہئے یا جمیل کی انوکھی طبیعت کی دلکشی کہ ثروت بچپن ہی سے اپنے کھیل کود میں جمیل کی صحبت میں خوش رہتی تھی۔ اب جب جوانی کی نسیمِ جانفزا چلی تو کسی کے چھپے سن کر یہ غنچۂ ناشگفتہ اِک گلِ رعنا بن کر چٹک پڑا۔

جب ثروت نے پہلے پہل جمیل کو ٹکٹکی باندھے تکتے دیکھا تو وہ نہ سمجھی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ لیکن وہ ٹکٹکی ہٹنے والی نہ تھی اور نہ وہ اک نری ٹکٹکی ہی تھی کہ محض تعجب و استعجاب کا اظہار ہوتی۔ نہیں اُن نگاہوں میں اک گہرائی تھی اور اُس گہرائی میں اک سوز تھا، غایت درجہ دلپذیر و دلگداز۔

آخر ایک روز گُل کھلا۔ ثروت کی انگلی میں اک ننھی سی خوش نما انگوٹھی تھی جسے وہ بار بار اُتار کر اُس سے کھیل رہی تھی اور جمیل اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ انگوٹھی اتفاق سے تپائی ہی پر رہ گئی۔ جب سب کمرہ چھوڑ کر باہر چلے گئے تو

جمیل نے اُسے اُٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ ہفتے کا دن تھا جب وہ گھر والوں سے ملنے اور گاؤں میں دو روز گزارنے کے لئے لاہور سے چلا جایا کرتا تھا۔ جمیل چلا گیا۔ پیچھے انگوٹھی کی تلاش ہوئی۔ بدر النساء نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ آخر ثروت نے کہا کہ انگوٹھی مل گئی۔ بدر النساء نے پوچھا کہاں ہے اُس نے بات ٹالنے کے لئے کہا کہ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ کہیں ہے۔

بدر النساء بولی تمہارے جی میں ؟

فی الحقیقت وہ انگوٹھی ثروت کے جی ہی میں نکلی۔ اُسے انگوٹھی سے وہ کھیلنا اور جمیل کا وہ دیکھنا یاد آ گیا۔ انگوٹھی مل گئی لیکن اُس کا جی کھو گیا۔ کئی ہفتوں سے دل کے خس و خاشاک میں ایک اَن دیکھی چنگاری سلگ رہی تھی جو اب یک لخت ایک شعلہ بن کر دہک اٹھی۔ ثروت کو معلوم نہ ہوا کہ کیا ہوا لیکن اُس کا جی سینے میں بیٹھ گیا اور اُس کے بدن میں ایک سنسنی پیدا ہو گئی۔ ثروت نہ جانی کہ اُس کا دل ہی اُس کا جانی دشمن بن گیا ہے۔ وہ سمجھی تو یہی سمجھی کہ خدا جانے کون اُسے اپنے پروں پر اُٹھا کر بلند ترین چوٹیوں پر لے گیا ہے اور اب اُسے دور نیچے اک ٹھاٹھیں مارنے والے سمندر میں پٹخ دینے کو ہے۔ وہ چیخ اٹھنے کو تھی کہ اُسے اوروں کی موجودگی کا احساس ہوا وہ دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور وہاں کواڑ بند کر بستر پر لیٹ گئی۔ موتی اُس کی آنکھوں سے ڈھلکنے لگے یہاں تک کہ آنسو چھم چھم جاری ہو گئے اور ہچکی کا تار بھی بندھ گیا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ روئے اور روئے جائے۔ اس سے پہلے بھی کبھی وہ ماں یا سہیلیوں کے طعنوں پر روئی ہو گی لیکن یہ رونا کچھ اَور رونا تھا۔ یہ اشکِ زار گرم و گرم رفتار تھے۔ اِن آنسوؤں میں محبت پڑی مسکراتی تھی۔ اس غمگینی میں اک دلکشی اس اندوہ میں اک انبساط کی لہر تھی۔ لیکن ثروت کو کیا پتہ تھا کہ یہ کیا ہے۔ بس اک آگ سی سینے کے اندر لگی ہوئی تھی کہ پتہ لینے کو جی ہی نہ چاہتا تھا کہ کس نے لگائی بجز اِس کے جس نے لگائی ہے وہ آ کر اسے بجھا تو دے۔ جب طبیعت ذرا ٹھکانے ہوئی تو ثروت کے کان میں گویا خاموشی نے آواز دی "جمیل"۔ یہ نام اب اس قدر دلکش ہو گیا تھا کہ اُس نے بار بار آہستہ آہستہ کہا "جمیل ...... جمیل ...... جمیل ...... تُو کہاں ہے کہ میرے ساتھ آ کر کھیلے" ؟

اتوار کا دن چھٹی کا دن تھا لیکن آج وہ پہاڑ کی طرح ٹالے نہ ٹلتا تھا۔ جوں توں کر کے وہ کٹا اور پیر کی خوشگوار صبح خوشیوں کے شادیانے بجاتی آئی۔ جمیل آیا اور انگوٹھی کو چپکے سے وہیں رکھ دیا جہاں پہلے تھی۔ اتنے میں بدر النساء گول کمرے سے گذریں تو تپائی پر انگوٹھی کو پڑا پایا۔ ثروت کو آواز دی وہ آئی تو کہا کہ انگوٹھی کہاں ہے اُس نے کہا اماں میں کیا ہر وقت انگوٹھی دیکھتی پھرتی ہوں کہیں میرے کمرے میں ہو گی ؟ پرسوں ہی مل گئی تھی۔ جمیل نے ذرا

حیرت سے ثروت کی طرف دیکھا اُدھر ثروت بھی بن دیکھے نہ رہ سکی اور شرم سے سر جھکا لیا۔ اُس وقت جمیل کے دل کی دزدیدہ لیکن خوف زدہ مسرت کا کچھ وہی اندازہ لگا سکتا ہے جس نے ہند کی مجبور معاشرت میں اپنی دلبر حسینہ کے متعلق پہلی بار محسوس کیا ہو کہ اُسے بھی اُس سے پیار ہے۔ بدرالنساء نے ذرا جھنجھلا کر اور انگوٹھی دکھا کر کہا تو پھر اِسے یہاں کوئی چھلاوا لے آیا؟ ثروت میں دیکھتی ہوں کہ جوں جوں تم بڑی ہوتی ہو تمہاری عقل غائب ہوتی جاتی ہے۔ کسی روز دن کو تارے نہ دیکھنے لگ جانا کہیں کہہ دو اندھیری رات میں بھی مجھے چاند نظر آتا ہے۔

ثروت کیا جواب دیتی کہ وہ واقعی دن کو تارے دیکھنے لگی تھی اور واقعی اُس کی اندھیری راتیں آن کی آن میں کسی چاند کی چاندنی سے پُرنور ہو چکی تھیں۔

عرب کہتے ہیں کہ کسی شے کی محبت انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔ دوسروں کی نظر میں محبت والوں کا یہی حال ہو گا مگر اپنے آپ میں تو اسیرِ محبت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کسی شے کی محبت اُسے سرشار و بیدار کر دیتی ہے۔ اُس کی بیقراری میں اک اطمینان اور اُس کی بے اختیاری میں ایک وجدان رونما ہوتا ہے۔ اُس کے سازِ دل کے سارے تار محوِ اہتزاز اور اُس کے دماغ کی ساری قوتیں ایک برقی کل کی طرح متحرک و مرتعش ہو جاتی ہیں۔ باہمی محبت کے احساس سے روح و رواں میں گویا ایتھر کی ایک رو دوڑ جاتی ہے جس سے سوئی ہوئی قوتیں بیدار ہو کر کمزوریاں خوبیوں میں تبدیل ہونے لگتی ہیں جمیل کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اُس کا تخیل اُسے ایک آسمانی فضا میں لے گیا ہے جو اُس کے شہپروں کی پھڑپھڑاہٹ سے گونج رہی ہے۔ اگر موقع ہوتا تو اُس کے نطق کی شیرینی اُس کے تخیل کی پرواز اُس کی عقل و فہم کی سلامت روی اُس وقت دنیا کو حیرت میں ڈال دیتی کہ اس نو عمر میں یہ پختگی کہاں سے آئی اور کیوں کر؟ اُدھر ثروت جو یوں بھی حسن کی ایک پتلی تھی اب ایک حسن کی دیوی بن گئی۔ عورت جب کامران محبت کی آمد آمد کا احساس کرے تو اُس کا حُسن دوبالا اور اُس کی رعنائی پہلے سے بدرجہا زیادہ شیریں ہو جاتی ہے۔

ثروت نے جمیل کو دیکھا جمیل نے ثروت کو۔ محبت کی معجز نمائی نے دونوں کو ششدر کر دیا۔ ثروت کبھی ایسی حسین نہ تھی جیسی آج۔ دنیا جہان کا رنگین و زرین جمال اُسکے چہرے میں چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا اور اُس کی رسیلی آنکھیں جمیل کے لئے اُس کے نرم و نازک دل کی ترجمان بن گئی تھیں۔ اور جمیل جو یوں اک معمولی شکل کا لڑکا تھا آج اُس میں اس قدر دلکشی پیدا ہو گئی تھی کہ ثروت جی ہی جی میں کہہ رہی تھی کہ آج وہ کہاں سے ہو کے آیا ہے کہ وہ کچھ اَور کا اَور معلوم ہو رہا ہے۔

کیا یہی نہ تھی تکمیلِ محبت؟ اُس زرّیں ساعت میں جمیل و ثروت نے معراجِ مسرّت کو پالیا تھا!

لیکن قدرت کو محبت کی یہ آسانیاں منظور نہ تھیں ۔ زمانے کو مسرت کا یہ قیام و قرار ایک نظر نہ بھایا ۔ کرۂ فلک نے گردش کی اور ایک نئی صورتِ حالات پیش نظر کر دی ۔

آئندہ دو تین ماہ میں ثروت کے لئے وہ پیام آئے جن کا تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں ۔ بدر النساء عقاب نظر تھی اور بات بات میں بال کی کھال اُتارتی تھی ۔ لڑکی کا رُخ تاڑ گئی اور ایک دن اُسے تخلئے میں لے جا کر خوب سرزنش کی اور کہا کہ ناسمجھ نہ بنو ۔ تمہاری ساری عمر کا معاملہ درپیش ہے ۔ اب ماشاء اللہ تم جوان ہو ۔ جوان لڑکیاں گھر میں بٹھائی جائیں تو شریفوں کی ناک کٹ جائے اور ساری کی ساری آبرو خاک میں مل جائے ۔ یاد رکھو لڑکیاں لڑکوں کی طرف نہیں دیکھا کرتیں یہ شریف حیادار بچیوں کا کام نہیں ۔ لڑکے لڑکیوں کی طرف دیکھ لیں تو مضایقہ نہیں ۔ پھر لڑکے پیام بھیجتے ہیں اور ماں باپ سوچ بچار کر کے فیصلہ کرتے ہیں کہ ہماری لختِ جگر کے لئے کونسا نوجوان سب سے زیادہ موزون ہے ؟ خوش اطوار نیک بخت لڑکی جانتی ہے کہ میرے ماں باپ سے زیادہ مجھ سے محبت کرنے والا اس دنیا میں نہ کوئی ہے نہ ہو سکتا ہے سو وہ خداوندِ کریم کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے ۔

اور اِسی طرح یہ خانگی تقریریں اور ملامتیں روز بہ روز جاری رہیں ۔ کبھی دھمکیاں کبھی ترغیبیں کبھی لاڈ پیار کبھی دم دلاسے یہ گوناگوں عذاب برابر جاری رہا ۔

اور جمیل ابھی وہیں مقیم تھا اور ثروت کو بدستور دیکھنے پر مجبور تھا اور ثروت کی نگاہیں بھی ہمیشہ نیچی نہ تھیں ۔ اگرچہ دونوں میں کبھی کوئی محبت کی گفتگو نہ ہوئی جس سے دوسرے کا مافی الضمیر علانیہ طور پر ظاہر ہو جاتا ۔ ان پیاموں اور بحثوں سے اُدھر جمیل اِدھر ثروت بے قرار و بدحواس ہو گئے ۔

آخر جمیل نے لاہور چھوڑ دیا ۔ ثروت ماں سے شرافت کی صفات سن سن کر بے حال ہو رہی تھی کہ سوائے اس کے کہ شریف لڑکی ہنوں میں اَور کر ہی کیا سکتی ہوں ؟

حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت میں ثروت کا کرب و اضطراب جمیل سے بھی کہیں بڑھ کر تھا ۔ دن کی آہیں اور رات کی اشک باریاں اُس کی ماں سے بھی نہ چھپی تھیں گو باپ کو ان سب حالات کی مطلق خبر نہ تھی ۔ لیکن ماں اپنی جنس کی کمزوری اور اطاعت گزاری سے بخوبی واقف تھی ۔ اُس نے شوہر کی غائبانہ جھوٹی سچی رائے بھی لڑکی کے آگے پیش کر دی ۔ چند مہینوں رو دھو کر ثروت گویا مضمحل ہو کر اپنی قسمت کے قدموں میں گر پڑی ۔ اور آخر ایک دن اُس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ جو آپ کی مرضی ہو وہی میری خوشی ہے ۔ میں اپنے دل کو بھینچ ڈالوں گی مگر ادائے فرض سے کبھی نہ چوکوں گی ۔

ماں نے آبدیدہ ہو کر بیٹی کے سر پر پیار کیا کہ میری ثروت! ہماری ساری خوشیاں تیرے ساتھ ہیں۔ خدا تجھے خوش نصیب کرے اور تو ہمیشہ پھولے پھلے!

---

(۶)

جمیل کالج کے ایک برآمدے میں کھڑا ایف اے کی فہرستِ نتائج میں اپنی کامیابی دیکھ کر مسکرا رہا تھا کہ سجاد نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے پر تھپکی دی اور امتحان کی کامیابی پر مبارک باد دے کر اُس کے ہاتھ میں ایک خط دیا کہ یہ لو تمہاری دلبر کا محبت نامہ، تمہاری شبانہ روز دماغی کوفت پر انعام + والدہ کا خط تھا جمیل نے وہیں کھول کر دیکھا تو اُس میں مادرانہ شفقت کا طول طویل اظہار تھا اور اخیر میں ایک کونے میں لکھا تھا کہ منظور و ثروت کی منگنی ہوگئی ہے جمیل کا رنگ بالکل متغیر ہوگیا اور چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ سجاد نے کہا خیر تو ہے۔ جمیل نے جواب دیا ہاں یوں تو سب بخیریت ہیں۔ سجاد نے کہا پھر؟ (اور جمیل کے ہاتھ سے لفافہ چھیننے کی کوشش کی) جمیل ہٹ کر علیحدہ ہو گیا سجاد آیا تو کہا بھائی! کیا پوچھتے ہو؟ تم کو مبارک ہو۔ تمہاری پیشین گوئی پوری ہونی تھی سو ہوئی۔ ثروت کی منگنی ہو گئی۔ سجاد نے ایک فرمایشی قہقہہ لگایا کہ سارا کمرہ گونج اُٹھا۔ پھر جمیل کی پیٹھ پر خوب زور سے ہاتھ مار کر اُس کے کندھوں پر تھپکیاں دیں اور اُچھل اُچھل کر اُس کے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا کہ مجھ احمق کو افسوس ہو تو ہو لیکن یار تمہیں تو امرت مل گیا۔ واللہ تمہارے صوفیانہ ٹونے ٹوٹکے بڑے کارگر ثابت ہوئے۔ بھئی میں تم پر ایمان لے آیا۔ تمہیں اُس بھلی مانس سے پاگلوں کی سی محبت تھی لیکن تم دن رات اسی فکر میں مبتلا تھے کہ کہیں اُس سے تمہاری شادی ہی نہ ہو جائے۔ سو اب اُس کی منگنی ہو چکی ہے تم بالکل مامون و مصئون ہو اور اب کسی قسم کا خطرہ مطلق باقی نہیں رہا۔ اللہ اکبر کیسی کامیابی ہے! اُدھر تعلیم کے ایف اے میں پاس اِدھر محبت کے میٹرک میں فیل۔ سبحان تیری قدرت! تو نے صوفیوں کو اپنی قدرتِ کاملہ کی کیسی کیسی نشانیاں دکھائی ہیں!

جمیل کا دل جو کبھی محبت کے میدان میں کسی پہاڑی ندی کی طرح بہتا تھا اب خشک ہو کر اُس میں مایوسی اور خشک مزاجی کے سنگ ریزے نکل آئے جن کی دل میں پوجا کرنا بھی اب متقی عقل مندوں کے نزدیک ایک اخلاقی جُرم ٹھیرا۔ اب وہ اکثر تن تنہا چہل قدمی کے لئے جانے لگا لیکن اُس کے سال میں کبھی کبھی ایسے دن آتے تھے جب وہ محض خاموشی کی تنہائی اور قدرت کی عزلت سے متاثر ہو کر دنیا و مافیہا سے بلند اور اُس کی جکڑ بندیوں سے

قطعی بالا بالا پرواز کرنے لگتا تھا۔ کبھی کبھی ایسے پاکیزہ لمحات اپنا پرتو ڈالتے تھے کہ دل کی اندرونی تاریکیاں اُن سے یکسر فروزاں ہوجاتی تھیں۔ ایک روز ایک ایسی ساعت میں اُس نے قوتِ نفس کی وجدانی آواز سنی کہ اُٹھ اور جاکر اُن دوُر دور پھیلے ہوئے خزانوں کو سمیٹ لے جو مشیتِ خداوندی نے فطرت کے ہاتھوں دنیا کے کونے کونے میں چھپا رکھے ہیں!
اُس کی زندگی میں ایک تبدیلی سی آگئی۔

جمیل کے دل میں ثروت کی محبت تو جیسی تھی ویسی رہی لیکن اس بظاہر مردہ پھیپھڑوں پر اب اُس نے چمن چمن سے گلچینی کرکے رنگ رنگ کے پھولوں کا اک انبار لگا دیا کہ دنیا کے مردار خواروں کی بھیانک نظریں اُس پر نہ پڑیں۔ وہ شعر و ادب اور فن و موسیقی کے چمنستان میں جانکلا اور اُس نے اپنا دامن ننھی ننھی پتیوں اور رنگیں پھولوں کی نرم و نازک پنکھڑیوں سے بھر لیا۔ ہر روز وہ ایک نئی بیاض کو کبھی کسی شاعر کی بوقلمونیوں کبھی کسی نثار کی خیال آرائیوں کبھی کسی نقاش کی نقش نگاریوں اور کبھی کسی فلسفی کی حقیقت نمائیوں سے زیب و زینت دیتا۔ وہ ان بیاضوں کو ایسی خوش نمائی اور حزم و احتیاط سے پیراستہ کرتا گویا وہ ان نادر الوجود مسوّدات کو کسی کتب خانے یا عجائب گاہ میں پیش کرنے والا ہے۔ یہ تھا اُس کے دل کا عجائب خانہ جس کی خالی غیر آباد عمارت کو اب اُسے اپنے ذہنی و قلبی نقش و نگار سے یکسر رشکِ عالم بنانا تھا۔ محبت کی ناکامی نے اُسے مفلس بنا دیا تھا اب علم و فن کے حصول سے اُسے ایک غیر فانی دولت پیدا کرنی تھی۔ یہ ایک بڑے دل و دماغ کا کام تھا اور جمیل اس کام میں پورا اترا۔ وہ خوش تر قوی تر اور زندہ تر ہو گیا۔ اُس کی خوشی ایک ذہنی خوشی، اُس کی قوت ایک دماغی قوت اور اُس کی زندگی ایک روحانی زندگی ہوگئی۔

کچھ عرصہ ہوُا جب حمید نے ثروت کی منگنی سے پہلے منظور کے کچھ حالات اور اُس کی رائے جمیل سے دریافت کی تھی تو جمیل نے بے کم و کاست اپنے خیالات کو بیان کرکے منظور کو ہر طرح قابلِ قبول ظاہر کیا تھا۔ اس کے ایک سال بعد ثروت اور منظور کی شادی کی تیاریاں ہوئیں۔ دعوتی رقعے سب عزیزوں دوستوں کو پہنچے۔ منجملہ اُن کے جمیل بھی تھا۔ نارواداری خدا رسیدہ زاہدوں کو شاید اصرار ہو لیکن بیچارے جمیل سے ہم کیونکر اُمید کرسکتے ہیں کہ وہ ثروت کے نیلام میں آخری بولی دینے والے کی خوشیوں کے جشن میں بخوشی شریک ہوتا۔ وہ معاشرتی مواقع میں رسمی شرکت سے بہت گریز کرتا تھا بالخصوص جب اس کے جذبات اس معاملے میں ایسے نازک تھے کہ ذرا سی ٹھیس سے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کا ڈر تھا۔ یہ جذبات اُسے غایت درجہ عزیز تھے اور اُن کی صیانت کے لئے اُس نے اک دروغِ مصلحت آمیز کی آڑ میں اپنے تئیں بچانا چاہا۔ عین عقد کی رات اُس نے لاہور تار بھیجا کہ میں علیل ہوں لیکن اس خوشی میں سب کے ساتھ شریک ہوں گو اس غیر حاضری میں اس نے اپنے مفصّل تہنیت نامے میں ایک بظاہر پُرخلوص معذرت بھی پیش کی لیکن منظور اور اُس

کی وجہ سے ثروت بھی اُس کی اس بے اعتنائی سے ذرا رنجیدہ خاطر ہوگئی اور یہ غلط فہمی روز بہ روز بڑھتی گئی۔

منگنی کے چھ ماہ بعد ثروت کی شادی ہوگئی۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ پنجاب بھر کے چیدہ چیدہ معززین شریکِ دعوت تھے۔ بڑے بڑے ریش دار شاعروں نے سہرے پیش کئے۔ دعوت ایسے پیمانے پر کی گئی تھی اور "تناولِ ماحضر" اس قدر مکلف و مرغن و ملذذ اور متنوع و ا بقولِ شخصے مفصل تھا کہ جتنے لوگ دعوت سے گھر کو واپس گئے اُن میں سے اکثر نے دو دو تین تین وقت کا کھانا نہ کھایا اور بعض تو دو دو ہفتے تک سند یافتہ ڈاکٹروں اور حکیموں کے ٹیلیفون کھڑکاتے رہے۔ اِدھر عزیزوں اور منتظموں میں سے کئی صاحبوں کے گلے پھولے ہوئے تھے، آنکھیں دھنس گئی تھیں اور چہرے ہڑ کی طرح سوکھے ہوئے اور چھوارے کی طرح سیاہ ہوگئے تھے۔ یعنی عملی طور پر ثابت ہوگیا تھا کہ دعوت ہر طرح سے کامیاب اور پُر اثر رہی۔

علی گڑھ میں بی اے کا امتحان پاس کرکے جمیل چار سال کے بعد گھر واپس آیا۔

اِس دوران میں جب کبھی اتفاقی طور پر اُسے "علیم منزل" میں قیام کرنا پڑتا وہ یا تو ثروت کے سامنے آنے سے پرہیز کرتا اور اگر کبھی ایسا ہو جاتا تو اپنے رویے پر ایک مصنوعی رنگ چڑھا لیتا۔

گھر واپس آنے کے چھ ماہ بعد نعیم الدین نے کئی ہفتوں کی مسلسل کوشش کے بعد جمیل کو ریل میں اے ٹی ایس کا عہدہ دلوا دیا۔

ایک دن جمیل کی ہمشیرہ نے اُسے اپنے بچپن کے انداز سے کہا کہ بھائی اب تو ہمیں اپنی بھاوج کا چاؤ ہے۔ گھر آپ کی غیر حاضری میں کس قدر سُونا تھا اب اُسے آباد و شاد کیجئے۔ جمیل نے ہنستے ہوئے کہا جمیلہ گھر میری غیر حاضری میں سونا تھا تو تم کوئی سی ایک بھاوج لے آتیں۔ بھلا میرے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؛ جمیلہ علیحدہ ہوگئی تو خورشید بیگم اپنے بیٹے کے پاس آئی اور کہنے لگی مرے اکلوتے بیٹے! امتحان اور معاش میں کامیاب ہوکر تم نے باپ کا گھر روشن کیا۔ کیا تم اب اپنی ماں کا کلیجہ ٹھنڈا نہ کرو گے؟ جمیل نے مسکرا کر کہا اماں! میں وہ برف کہاں سے لاؤں جس سے تمہیں ٹھنڈک پہنچے؟ ماں بولی بیٹا برف کا تو سب انتظام ہو جائیگا مگر تم بھی تو ہاں کہو۔ جمیل نے جواب دیا اماں! ہیں جس طرح ہوں بہت خوش ہوں میں نہیں جانتا شادی کی یہ نئی بلا کیا اثر پیدا کرے گی۔ خورشید بیگم نے بزور کہا جمیل! شادی کو بلا نہ کہو اس سے تمہارا گھر آباد ہوگا اور تمہارے بزرگ باپ کی نسل قایم رہے گی۔ جمیل یہ سن کر باہر چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب وہ پہلے کی بہ نسبت ایک زیادہ عملی آدمی بن رہا تھا۔ اُسے بھی اُسی روز سے دُھن لگ گئی کہ اِس معاملے کو کسی طرح طے کرنا چاہئے۔ کبھی جی سے پوچھتا کہ اگرچہ ثروت مجھے بھول چکی ہے اور اُسے بھول بھی جانا چاہئے لیکن کیا میں ثروت کو

بھولا ہوں ؟ پھر کہتا کہ اگر نہیں بھی بھولا تو اُسے بھول جانا میرا اخلاقی فرض ہے۔ کبھی سوچتا کہ تن تنہا رہنا میرے والدین کے لئے باعثِ کرب اور یوں میرے لئے بھی موجبِ اندوہ ہوگا۔ پھر جی سے پوچھتا کہ جس طرح عمر میں اَور ارادے کئے ہیں کیا اُسی طرح ایک روز فیصلہ نہ کرلوں کہ ہاں شادی کرلوں گا اور پھر والدہ سے جاکر کہہ دوں کہ یہ اے خدا اب مجھے اُس نیک بخت کی شکل تو دکھا دو۔

اِسی دوران میں ایک روز نعیم الدین باغ کی سیر کو جاتے ہوئے بیٹے کو ساتھ لیتے گئے اور اُس سے یہ ساری بات کی کہ میری تمنا ہے کہ اگر تم کو اعتراض نہ ہو تو تم اپنی خالہ زاد بہن عذرا سے شادی کرلو۔ وہ بڑی صالح و نیک بخت اور عقلمند لڑکی ہے۔ اگر ہماری طرف سے ذرا دیر ہوئی تو اُس کے لئے پیام چلے آرہے ہیں پھر ایسی لڑکی مشکل سے ملے گی جسے تم مل چکے ہو یا دیکھ سکتے ہو۔

جمیل خاموش رہا پھر تھوڑی دیر کے بعد والد سے کہا کہ جیسے آپ کی مرضی میں آپ کے حکم پر راضی ہوں۔

جمیل اپنے ضمیر کو آئینے کی طرح صاف و روشن رکھنا چاہتا تھا۔ ماں باپ کی تربیت تعلیم کے اثر اور محبت کے سوز سے اُس کا دل گداز ہوچکا تھا۔ اُس نے اُسی روز سے ارادہ کرلیا کہ اب میری تمام توجہ اور محبت صرف عذرا کے لئے وقف ہوگی!

جمیل اپنی خالہ محمود بیگم کے گھر آنے جانے لگا اور گویا موسیو کوسے کے "خود تاثیری" کے اصول پر عمل کرکے عذرا کے آگے پیچھے جی ہی جی میں اُس کا نام دُہرانے لگا اور اکثر خیال کرنے لگا کہ عذرا بڑی اچھی لڑکی ہے۔

اور واقعی عذرا گو گلعذاروں میں نہ تھی لیکن ایک زبردست سیرت کی مالک ضرور تھی۔ وہ خاموش مزاج دوراندیش اور خوددار تھی۔ وہ تکلیفوں میں حوصلہ مند ضروریاتِ آرام و آسایش میں کفایت شعار اور لباس و خانہ آرائی میں سادگی پسند تھی۔ وہ تخیلات سے عاری اور معمولات کی عادی تھی۔ وہ دنیا کو اس طرح دیکھتی تھی جیسی کہ وہ نظر آتی ہے وہ جمیل کی طرح دنیا کے خاکے کھینچ کھینچ کر اُن میں رنگ بھرنے کی مشتاق و خوگر نہ تھی۔ لیکن گو غیر معمولی خیالات اُس کی نظر میں پسندیدہ نہ تھے وہ اپنے معمولی خیالوں اور باتوں پر اک پہاڑ کی طرح قایم تھی۔ جمیل کی طرح اُس کی فطرت میں نہ صحرا کی وسعت تھی نہ ندیوں کی روانی اور نہ سمندر کا جوش و خروش۔ اُس کے چہرے کا نام متانت تھا اور خاموشی اُس کی آنکھوں میں بستی تھی۔ اُس کے خیالات اور اُس کی پسند ناپسند کا پتہ لگانا آسان کام نہ تھا کیونکہ وہ منصوبہ بندی سے متنفر اور خیال آرائی کا مضحکہ اُڑاتی تھی جس سے یہ معلوم کرنا کہ اُس کے اپنے خیال کیا ہیں انتہا درجہ دشوار ہوجاتا تھا۔ وہ وفادار تھی اور جہاں اُس کی مخصوص ہٹ درمیان میں نہ آجاتی وہ ہر قسم کا ایثار کرنے کو تیار تھی۔

اپنے گاؤں میں وہ یتیموں کی سرپرستی اور رانڈوں کی دلجوئی کرتی اور غریبوں کے لئے اُس نے ایک چھوٹی سی

درسگاہ بنائی جس میں وہ اور اُس کی ایک غریب سہیلی اُنہیں لکھنے پڑھنے اور سینے پرونے کی تعلیم دیتیں۔

اُسے اردو فارسی میں خاصی لیاقت تھی اور حساب بھی اُس نے دلچسپی سے سیکھا تھا۔

عذرا کی صورت زیبا اُس کا قد چھوٹا اُس کی چال باترتیب اور اُس کی آواز دھیمی تھی۔

ملازمت ملنے کے پانچ ماہ بعد جمیل کی منگنی اور ڈیڑھ سال بعد اس کی شادی ہوگئی۔

عذرا سے مل کر جمیل گویا ایک ایسی شخصیت سے دوچار ہوا جس میں اُس میں بعض باتوں میں بُعدِ مشرقین تھا لیکن جمیل کی کمیاں عذرا کی خوبیاں تھیں اور شاید قدرت نے جو عموماً فطرتِ انسانی کی خواہشات کے جادۂ زرّیں پر اپنے واقعات کی ریل گاڑی کو چلانا پسند نہیں کرتی بلکہ اُسے اپنے ہی بعض ناقابل الفہم موضوعہ اصولوں کی آہنی سڑک پر رواں کرتی ہے۔ اسی لئے اِس ندرت پرست نوجوان کو ایک معمول پسند رفیق زندگی دی تاکہ روزمرہ کے افکار و اعمال کی آمد و شد میں اُن کی باہمی زندگی کا ترازو متوازن و یکساں رہے +

عذرا جمیل کو عموماً یہ کہہ کر ایک عملی زندگی کی ترغیب دیتی کہ تمہاری "سادھوانہ" قابلیت اور تمہارا "گاندھیانہ" تخیل کس کام کا ہے جب دنیا کو اُس سے کچھ فائدہ نہ پہنچے۔ اگر انسان ایک خیالی نصب العین اور ایک مثالی محبت کے تخیلات میں ذہن ہی ذہن میں اپنی زندگی گزار دے تو اس دنیا میں اُس کے آنے اور رہنے سہنے کی غرض ہی کیا تھی؟ اُدھر جمیل کی طبیعت بجائے آگے بڑھ کے آنے کے پیچھے ہٹ کے چھپنے کی تھی۔ وہ اپنی خلوت سے محبت کرتا تھا۔ وہ دن کی روشنی سے گھبراتا تھا۔ اُس کی آنکھیں راتوں کی چاندنی کو ڈھونڈھتی تھیں۔ پھر بھی عذرا کی "عملیت" کا اک خاموش اثر جمیل پر ہونے لگا اگرچہ اُس کی سچی عظمت کا راز اُس وقت جمیل پر کھلا جب آئندہ بعض دشوار موقعوں پر اُس نے جمیل کو خاموشی کے ساتھ زندگی کی سیدھی راہ دکھادی۔

کیا جمیل کے دل سے ثروت کی محبت محو ہوچکی تھی؟ اس سوال کے جواب میں ہم صرف یہ سوال کرینگے کہ کیا انسان اپنے جذبات و تصوّرات کا مالک و حاکم ہے؟ اور کیا اُس کے دل کا کوئی جذبہ اور وہ بھی اک حسین و پاک جذبہ قطعی طور پر مٹ سکتا ہے؟ اور پھر کہیں گے کہ انسان کو خود اپنی ہی قلبی حالت سے صحیح آگاہی نہیں۔ وہ اپنے دل کو الٹ پلٹ کر دے بعض خیالات کو اُس میں سے نکال ڈالے لیکن اُن رنگوں کو کیونکر دھو ڈال سکتا ہے جو اس جامِ جہاں نما کے بلّوریں عنصر کا جزو بن چکے ہیں؟

جمیل کی شعریت عذرا کی "فطریت" سے دوچار ہوئی۔ جمیل نے عذرا کو شاعرانہ نگاہوں سے دیکھا عذرا نے جمیل کو فطری طریقے سے لیکن دونوں کی نگاہوں میں سچی محبت تھی جو روز بروز بڑھتی گئی۔ عذرا کو اُس کی ماں کی نصیحت تھی کہ آج کل کی

بعض منہ زور لڑکیوں کی طرح شوہر سے زیادہ بحث مباحثہ نہ کرنا ورنہ وہ مانتا بھی تمہاری بات نہ مانے گا۔

اُدھر جمیل ایک "اصیل شوہر تھا سوائے اس کے کہ جہاں وہ اپنی فلک پروازیوں میں محو ہو جاتا وہاں عذرا عموماً اُسے زمین کی طرف کھینچ نہ سکتی تھی۔ جمیل چونکہ کمزور طبع تھا اسلئے بعض وقت وہ اِدھر اپنی اماں اور اُدھر اپنی زوجہ کی اینچاتانی میں گرفتار ہو جاتا لیکن خوش قسمتی سے ایسے مواقع اکثر پیش نہ آتے تھے۔

شادی کے ایک سال بعد جمیل کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام دادا نے عزیز احمد رکھا۔ اِس سے جمیل کے والدین کی نگاہ میں اُس کی بیوی کی قدر و منزلت بڑھ گئی اور جمیل اور عذرا کے تعلقات اَور بھی زیادہ خوشگوار و استوار ہوتے گئے۔

اِس کے دو سال بعد شیخ نعیم الدین کا انتقال ہو گیا۔ نعیم الدین نے اپنی عمر کے پچھلے چند سالوں میں زمینوں اور مکانوں کی خرید و فروخت سے کافی جائداد پیدا کر لی تھی۔ پس نعیم الدین کی وفات پر جمیل ایک خاصا متمول شخص ہو گیا۔ اب بجائے علمی مشاغل کے وہ اپنے کاروباری معاملات میں منہمک رہنے لگا۔ ملازمت سے جو وقت بچتا اُسے اُن کی نذر کرتا۔ تعجب تھا کہ باوجود تخیل پسند ہونے کے کاروباری حیثیت سے وہ ناکام نہ رہا۔ جمیل و عذرا کی سادہ معاشرت اور کفایت شعاری کے باعث اُن کے پاس تھوڑی ہی دیر میں خاصا سرمایہ جمع ہو گیا۔

لیکن اس زر و دولت کا اثر جمیل کی سیرت پر بُرا پڑا۔ وہ روز بروز زیادہ زر پرست اور مادیات میں منہمک ہوتا گیا اگرچہ اُس نے کبھی خیانت سے کام نہ لیا اور نہ کبھی کی دل آزاری کی۔ وہ عموماً اپنی بنک کی کتاب کا مطالعہ کرتا اور اپنی جمع کو دیکھ دیکھ کر جی ہی جی میں خوش ہوتا اور حساب کیا کرتا کہ کتنی مدت میں میرے پاس کتنا روپیہ جمع ہو جائیگا۔ اُس کی بیوی اُسے خیرات کرنے کی ترغیب دیتی لیکن علاوہ اس بات کے کہ وہ رسمی خیرات کے خلاف اپنے اصولی اعتراضات میں پناہ لے لیتا اُس میں ایک یہ عجیب و غریب عادت بھی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ سرزنش آمیز نصیحت پر بجائے ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے عارضی طور پر عین اُس کے برعکس عمل کرنے لگتا تھا۔ اپنے کاروبار میں منہمک ہو کر اُس کی محبت کی بلند پروازی و تیزی کچھ کم ہو گئی۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس نے اپنے خانگی تعلقات میں کسی طرح کی بے اعتنائی سے کام لیا۔ نہیں بلکہ عذرا کی مستقل مزاجی کے اثر سے اُن کی محبت روز بروز زیادہ پائدار و مستقل ہوتی گئی اور اُن کی باہمی زندگی زیادہ ساکن و مطمئن!

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جمیل و عذرا کی ساری زندگی اسی طرح باہمی مسرت و انبساط میں گزرے گی!

(باقی)

بشیر احمد

تحریکِ عمل

گر دیکھئے تو یاس، ہے انکارِ ذاتِ حق، امیدوارِ رحمتِ پروردگار رہ

آئیں گی تجھ کو راس نہ سرمستیاں تری رہنا ہے اس جہان میں اگر ہوشیار رہ

اب دشت گردیوں کے زمانے گزر گئے ہنگامہ زائے محفلِ زیبائے یار رہ

شایانِ عاشقی نہیں مایوسئِ فراق ہر دم رہینِ کشمکشِ انتظار رہ

جاتی رہیں گی حسن کی بے اعتنائیاں تو اپنے عہدِ شوق پہ خود استوار رہ

اچھی نہیں ہیں دوست یہ عزلت گزینیاں تو حق و راستی ہے سدا آشکار رہ

یہ تیرہ خاکداں ترے دم سے چمک اُٹھے رخشاں عمل کے چرخ پہ خورشیدوار رہ

اہلِ نظر کو زندگیٔ پُرسکوں ہے موت بحرِ جہاں میں موجِ صفت بیقرار رہ

پیدا ہر اک بہار میں اپنی بہار کر اور بے نیازِ عہدِ خزان و بہار رہ

کس نے کہا تجسس و تدبیر چھوڑ دے

سنگِ عمل سے شیشۂ تقدیر توڑ دے

جلال الدین اکبر

بکھرے ہوئے پھول

اے عابد! جب رات کی نقاب پوش ملکہ واپس جانے لگتی ہے۔ جب آسمان کی آب گون چادر سے ملائک اُس کی پوشاک کے بکھرے ہوئے ہیرے چُننے لگتے ہیں تو رفتہ رفتہ افق پر سحاب کے رنگین وباریک پردے بھی پھٹ پڑتے ہیں۔ پردہ نشین ملکہ اُن میں روپوش ہو جاتی ہے اور صبح کا نور دنیا کو تابندگی بخشتا ہے۔ اُس وقت نازک نازک پھول بھی اظہارِ عقیدت میں مسکرا اُٹھتے ہیں مگر تو اُس وقت کہاں ہوتا ہے؟ مجھے سجدہ کیوں نہیں کرتا؟

اے عابد! تو جانتا ہے۔ صبح کس کو کہتے ہیں؟ صبح اُس دوشیزہ کا نام ہے جس کے دل میں معصومانہ جذبات پنہاں ہوتے ہیں اور جس کے سینہ سے دوشیزگی کا نور نکل کر، تیری آنکھ کی پھیلتی ہوئی بینائی کی طرح دنیا پر چھا جاتا ہے!

اسی لئے میں نے اس وقت کو اپنی عبادت کا بہترین وقت بنایا ہے!!!

اے عابد! اُس وقت، جب صحرائے اعظم کی دلکشی پر رفتہ رفتہ ایک ہولناک اندھیرا مُسلّط ہونے لگتا ہے جب قمر اپنی بے حجاب اور عُریاں روشنی کو مشرق کے اُفقی حصّہ سے پھیلاتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ جب اُس کی روشنی ہلکے رنگ کی زرّین شراب بن کر کائنات کے ہوش وحواس پر غالب آتی جاتی ہے۔ جب سمندر آہستہ آہستہ چاندنی کا ساتُمانور اپنی آنکھوں میں لئے ہوئے متحرّک ہوتا ہے۔ اور جب آسمان پر موتی بکھر جاتے ہیں۔ تو اُس وقت تو کِن تاریکیوں میں چھپ جاتا ہے؟۔

آ اور اپنے معبود کو سجدہ کر!

اے عابد! یہی وہ وقت ہے۔ جسے میں نے اپنی عبادت کے لئے پسند کیا ہے کیونکہ شام دلکش اور دل افروز مناظر کا مخزن ہے!!!

اے عابد! جب رات کی تاریکی میں نقاشِ قدرت کے تراشے ہوئے نقش ونگار جھلملانے لگتے ہیں۔ جب دنیا کے تمام پہلوؤں پر سکوت کا پردہ پڑ جاتا ہے۔ اور جب فرشتوں کی آرامگاہ اور نیک روحوں کے پاک محل میں بھی سناٹا چھا جاتا ہے۔ جب چاند کی روشنی دنیا میں یکّہ وتنہا رہ جاتی ہے اُس وقت تیرے کلبہ میں نیند کا تیرہ وتار اندھیرا

کیوں چھا جاتا ہے؟

آہ کیا تو اس وقت کو نہیں جانتا؟

اے عابد! اُٹھ اور سرِ نیاز جھکا دے!

یہی وہ وقت ہے جو میری عبادت کی آخری منزل ہے اور جس وقت سکوت اور سکون باہم گلے ملتے ہیں!

اے عابد! میری عبادت کے یہ اوقات "بکھرے ہوئے پھول" ہیں۔ انہیں چُن لے! موسمِ بہار گزرا جاتا ہے۔ پھر تو ان کی لڑیاں کب پروئے گا؟؟؟؟

تہذیب فاطمہ عباسی

کوائفِ دل

(۱)

خو کردہ ہے دل لطفِ خراشِ جاں کا　　دل دادہ جراحتِ غمِ پنہاں کا

معلوم ہے درماں کی حقیقت اُس کو　　وارفتہ ہے دردِ طلبِ درماں کا

(۲)

کرتا ہے بسر ہمیشہ روتے دھوتے　　ہو جائے گی تسکیں اسے ہوتے ہوتے

نادان ہے دل، کبھی سمجھ جائے گا　　سو ہی جاتا ہے بچہ روتے روتے

(۳)

کرتا ہے عجیب خواہشوں کا اظہار　　لاتا نہیں میں زباں پہ حرفِ انکار

ازبس ہے عزیز مجھ کو خاطر اُس کی　　ہادی مرا دل ہے ایک طفلِ بیمار

سیّد محمد ہادی حسین

وجدانیات

اظہارِ حالِ عجز محبت سے دُور تھا — اور اُس پہ یہ کہ حُسن تمہارا غیُور تھا

نغموں میں ڈوب ڈوب گئی تھی ہر ایک سانس — تو دل کی انجمن میں گل افشاں حضُور تھا

نسبت ہی کیا ہے طور سے انوارِ یار کو — یہ تابشِ جمال ہے وہ رقصِ نُور تھا

اُن کی ہزار ضد کہ ہمیں چھیڑ کیوں دیا — میرا یہ ایک عذر کہ دل ناصبُور تھا

رنگینیوں میں ڈوب گیا لالہ زارِ دل — ہر چند تیری برقِ تجلّی سے دُور تھا

دل کی شکستگی سے نہ گھبرایئے حضُور — یہ آئینہ ازل سے یونہی چُور چُور تھا

تیری طرف سے ظلم کی غایت نہیں رہی — میں کچھ نہ کہہ سکا کہ ادب کا وفُور تھا

میں قصۂ تباہیٔ دل عرض تو کروں — تم ہنس کے کہہ نہ دو کہ تمہارا قصُور تھا

غیروں سے تھے وہ محوِ سخن سادگی تھی یہ — دیکھا نہ آنکھ اُٹھا کے مجھے یہ غرُور تھا

عابد کوئی حجاب نہ تھا شامِ وصل میں
اِک پردۂ تبسّمِ پنہاں ضرور تھا

عابد علی عابد

محبت کی فتح

موسم بہار کی ایک صبح کو جب کہ ناصر کی عمر آٹھ یا نو سال کے قریب ہوگی وہ اپنے باغ میں سیر کے لئے آیا اور پھول توڑ کر رومال میں جمع کرنے لگا۔ دفعتہً اُس کی نظر ایک خوبصورت تتلی پر پڑی جو گلاب کے پھولوں پر اُڑ رہی تھی۔ ننھے گلچیں کا دل اُسے پکڑنے کے لئے بے تاب ہوگیا۔ وہ پھولوں کو زمین پر پھینک کر تتلی کو پکڑنے کی کوشش میں مصروف ہؤا۔ اُس کا تعاقب کرتے ہوئے وہ باغ کے آخری حصّہ میں جا پہنچا۔ وہاں اُس کے کوٹ کا دامن ایک خاردار جھاڑی میں اُلجھ گیا۔ اور وہ منہ کے بل زمین پر گر کر رونے لگا۔ باغ کے سامنے والی سڑک پر سے سلیم گزر رہا تھا۔ اُس نے ناصر کو گرتے ہوئے دیکھا تو فوراً اُس کی مدد کے لئے دوڑا اور اُسے کانٹوں کے جال سے رہائی دی۔ وہ خود بھی ناصر کا ہم عمر تھا اُس کے ہاتھ کانٹوں سے زخمی ہوگئے۔ ناصر نے اُس کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "تم کیسے اچھے اور بہادر لڑکے ہو کیا تم میرے دوست بنو گے؟" وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اُس کا باپ بھی ادھر آنکلا۔ ناصر نے دوڑ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے یہ تمام واقعہ سنایا۔ ناصر کا باپ سلیم کے پاس آیا اور بولا "میاں تم کس کے بیٹے ہو"۔ سلیم نے جواب دیا۔ "جناب میرے کوئی ماں باپ نہیں، لوگ کہتے ہیں تمہارے ماں باپ اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں۔ میں چچا کے پاس رہا کرتا تھا لیکن آج انہوں نے ناراض ہو کر مجھے گھر سے نکال دیا ہے"۔

خدا نے جہاں ناصر کے باپ کو ظاہری دولت اور عزت عطا کر رکھی تھی۔ وہاں اُس کے باطن کو بھی رحم، محبت اور فیاضی کے لاتعداد خزائن بخش دیئے تھے۔ اُس نے سلیم سے اس کے مفصّل حالات دریافت کرنے کے بعد اُسے پیار کیا اور کہا کہ تم میرے پاس رہو میں تمہیں ناصر کے برابر ہی تعلیم دلاؤں گا اور تمہیں اپنا بیٹا سمجھوں گا۔

دن گذرتے گئے، سلیم اور ناصر کی عمر کے ساتھ ہی ان کی محبت بھی ترقی کرتی گئی۔ وہ بچپن ہی سے ایک غیر معمولی طبیعت رکھتے تھے۔ عام لوگوں سے ملنا جلنا انہیں سخت ناگوار تھا۔

آخر وہ دن بھی آپہنچا جب انہوں نے اپنی تعلیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیا۔

سلیم کا چچا اور چچی کسی ناگہانی حادثہ سے دریا میں ڈوب کر مر گئے۔ چونکہ اُن کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اس لئے سلیم ہی اُن کی جائداد کا مالک ہؤا۔ لیکن وہ پھر بھی ناصر سے جدا نہ ہؤا۔ انہیں دنوں ناصر کے باپ کا بھی انتقال ہوگیا۔

باپ کی موت کے بعد ناصر نے شہر کو چھوڑ دیا۔ اور اپنے گاؤں میں جہاں اُس کا آبائی مکان تھا سکونت اختیار کی۔ سلیم بھی اپنی جائداد فروخت کر کے اُس کے ساتھ ہی چلا آیا۔

یہاں اُن کے کتب خانے میں ہزارہا نادر الوجود کتابیں تھیں جو ناصر کے باپ نے اپنی تمام عمر میں جمع کی تھیں اب اِن کا محبوب ترین مشغلہ کتب بینی تھا۔ جب اُن کا دل پڑھنے سے سیر ہو جاتا تو وہ باغ میں چلے جاتے۔ وہاں کسی کُنج میں بیٹھ کر کتابِ فطرت کے مطالعہ میں محو ہو جاتے اور پہروں قدرت کی رنگینیوں کے متعلق گفتگو کیا کرتے۔

انہوں نے آپس میں یہ تحریری عہد کر لیا تھا کہ اگر ہم میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے تو دوسرا اُس کے ترکہ کا واحد مالک ہو۔

ناصر کے ہمسایہ اکرم کے ہاں اُس کا ایک رشتہ دار وحید جو شہر میں رہتا تھا ملنے کے لئے آیا۔ ایک دن دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وحید نے کہا "ناصر اور سلیم کو ایک دوسرے سے کس قدر محبت ہے اور محبت بھی ایسی پائدار ہے کہ اٹھارہ سال کے عرصہ میں اس میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ جب سلیم ناصر کے پاس نیا نیا آیا تھا اُسی زمانہ سے میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ میرا مکان ان کے شہر والے مکان کے نزدیک ہی واقع ہے جہاں یہ پہلے رہا کرتے تھے ان دونوں کا باہمی اخلاص نظیر نہیں رکھتا یہی وہ سچی دوستی اور حقیقی محبت ہے جسے موت کے سوا دنیا کی کوئی چیز شکست نہیں دے سکتی۔ بلکہ سچ تو یوں ہے کہ ایسی محبت موت پر بھی فتح پاتی ہے"۔ اکرم نے یہ سن کر شرارت سے ایک قہقہہ لگایا اور بولا "تو یہ آپ بھی دنیا پر کس قدر نیک ظن رکھتے ہیں۔ اجی! یہ محبّت وحبّت کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ سب لوگ اپنی غرض کے لئے آپس میں خوشامد سے پیش آنے پر مجبور ہیں اور آپ جیسے خوش اعتقاد اسے محبت سمجھے ہوئے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی شخص کسی سے بغیر کسی قرابت کے صرف بے غرض محبت کر سکتا ہے۔ ایسا آدمی جو خواہ مخواہ کسی غیر سے محبت کرے، پاگل، مجنون، دیوانہ ہے یہ دونوں بھی جانے کس غرض کے لئے ابھی تک ایکدوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ موت بھی ان کی محبت پر فتح نہیں پا سکتی مگر یاد رکھئے کہ یہ خاکسار بھی اس پر فتح پا سکتا ہے"۔

وحید۔ ہرگز نہیں، حقیقی محبت کبھی نہیں مٹ سکتی، تم اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکو گے۔

اکرم۔ بھئی خدا کی قسم، اگر میرا نام اکرم ہے تو چھ مہینے کے اندر آپ کو دکھا دوں گا کہ یہ محبت کیا حقیقت رکھتی ہے۔

وحید۔ اُونہہ۔

وحید نے اُس کی بات کو محض یاوہ گوئی سمجھا۔ لیکن وہ درحقیقت اپنے ارادہ کی تکمیل پر تُلا ہؤا تھا۔ اُس نے وحید کے رخصت ہوتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔

وہ اکثر ناصر کے پاس آکر بیٹھتا اور ہمیشہ سلیم کی نسبت نہایت سادگی سے ایک نہ ایک ایسی بات کر دیتا کہ سلیم کی شکایت بھی ہو جاتی اور ناصر بھی اُسے نہایت نیک نیت آدمی سمجھتا۔ کچھ عرصہ تک تو ناصر پر چنداں اثر نہ ہؤا، لیکن رفتہ رفتہ اُس کے دل میں سلیم کی طرف سے نامحسوس طور پر کدورت آنی شروع ہوئی۔ گو بظاہر وہ اُس سے اسی طرح پیش آتا، لیکن اُس کے دل کی گہرائی میں کہیں بہت دور ایک مبہم شبہ کسی زخمی سانپ کی طرح تاریکی میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اب اُس نے سلیم کو تنقیدی نظروں سے دیکھنا شروع کیا، اُسے سلیم کی ہر پرخلوص بات میں ایک تصنع نظر آنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا اور افسوس کرتا۔ اب اُس کا دل مطمئن نہ تھا مگر وہ کبھی واضح طور پر یہ نہ سوچ سکا کہ اُس کا اطمینان کیوں جاتا رہا۔

اکرم نے یہ کام بھی شروع کیا کہ سلیم کی ایک تصویر ساتھ لے کر گھر سے چلا جاتا اور کئی کئی دن آس پاس کے گاؤں اور قصبوں میں پھرا کرتا۔ کوئی تین ماہ کی کوشش کے بعد اُس کا مقصد پورا ہو گیا۔ اُسے عشرت خاں نامی ایک ایسا آدمی مل گیا۔ جس کی صورت سلیم سے بہت ہی ملتی جلتی تھی۔ یہ ایک ذلیل و غریب آدمی تھا جو ہمیشہ نہایت ناجائز طریق سے روپیہ حاصل کر کے اپنی بسر اوقات کیا کرتا۔ اکرم نے اس سے معاملہ طے کر لیا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ جس شام وہ گاؤں پہنچا اتفاقاً اس روز سلیم کی طبیعت ناساز تھی۔ وہ سرِ شام ہی ناصر سے رخصت ہو کر اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا تھا۔

رات کے وقت اکرم ان کے مکان میں داخل ہؤا۔ اور ناصر کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ناصر نے نہایت فکر سے اُسے بتایا کہ سلیم کی طبیعت خراب ہے۔

اکرم۔ (تعجب سے) اچھا مگر وہ تو کھڑکی کے پاس بیٹھ کر بندوق میں کارتوس ڈال رہے تھے۔ کیا آپ کا ارادہ صبح شکار کو جانے کا ہے؟

ناصر۔ نہیں تو۔

ناصر یہ سن کر بہت حیران ہؤا۔ لیکن اُس نے اپنا تعجب اکرم پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ پھر اکرم باتوں باتوں میں کہنے لگا "سلیم صاحب نے یہ بہت ہی اچھا کیا کہ رائے صاحب والا گاؤں خریدنے کا ارادہ کیا، ایک لاکھ میں یہ گاؤں بہت ہی سستا ہے"۔

ناصر۔ کیسا گاؤں؟۔ سلیم نے تو کوئی ارادہ نہیں کیا۔

اکرم - اجی وہی جو یہاں سے بیس میل شمال کی جانب واقع ہے۔ رائے صاحب اسے فروخت کر دینا چاہتے ہیں۔

ناصر - تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ سلیم اس کے خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اکرم - مجھ سے رائے صاحب کا ایک ملازم ملا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ تمہارے ہمسایہ سلیم ایک روز ہمارے آقا سے اس کے خریدنے کی نسبت گفتگو کرنے آئے تھے۔

ناصر - سلیم تو وہاں کبھی نہیں گیا۔

اکرم - آپ کو شاید اس لئے معلوم نہ ہوگا کہ پچھلے دنوں جب آپ دہلی تشریف لے گئے تھے۔ انہیں دنوں مسٹر سلیم وہاں گئے تھے۔

ناصر - ہاں یہی بات ہوگی۔

تھوڑی دیر بعد اکرم اٹھ کر چلا گیا۔ ناصر آج ان نئی باتوں کو سن کر سخت متعجب ہو رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ سلیم ایک لاکھ میں گاؤں کیونکر خرید سکے گا؟ اُس کے پاس تو صرف پچاس ہزار روپیہ ہے۔ کبھی وہ سوچتا کہ "پہلے جب کبھی میں ایک دن کے لئے بھی دہلی جایا کرتا تھا تو سلیم ہمیشہ میرے ساتھ ہی جاتا۔ لیکن اس مرتبہ وہ خلاف معمول ناسازئ طبع کا عذر کر کے یہیں رہا۔ اور پھر یہ بات بھی مجھ سے پوشیدہ رکھی۔ سلیم کبھی مجھ سے اپنا کوئی راز نہیں چھپایا کرتا تھا۔ معلوم نہیں اُسے کیا ہو گیا۔ خیر میں صبح یہ بات تو اُس سے ضرور دریافت کروں گا۔"

وہ انہیں خیالات میں غرق ہو گیا۔

رات کو ایک بجے کے قریب جب تمام لوگ سو رہے ہیں۔ اکرم اور عشرت، ناصر کے مکان کے سامنے کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ عشرت شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ اس کے ہاتھ میں سلیم کی ایک نہایت عمدہ اور قیمتی بندوق ہے۔

اکرم - عشرت! دیکھو اُس کی صرف ایک ہی نظر اپنے چہرے پر پڑنے دینا۔ اگر اُس نے تمہیں اچھی طرح سے دیکھ لیا۔ تو تمہاری جان کی خیر نہیں۔ مگر ایسی جلدی بھی نہ کرنا کہ وہ تمہیں دیکھ ہی نہ سکے۔ بس، ایک نظر میں تو وہ ضرور تمہیں سلیم ہی سمجھے گا۔ واللہ اس وقت مجھے خود دھوکا ہو رہا ہے۔ ہاں! جو تدبیریں تمہیں بتا چکا ہوں اُس پر نہایت دانشمندی سے عمل کرنا۔

عشرت - ارے صاحب! آپ مزے سے بیٹھے تماشا دیکھئے۔ کوئی بچہ تھوڑا ہی ہوں۔ میری زندگی انہیں کاموں

میں گزری ہے۔ یہ آپ نے خوب کیا کہ سلیم کی بندوق اور لباس حاصل کرلیا۔

اکرم۔ ہاں اسی لئے تو میں نے اپنے آدمی کو ان کے ہاں نوکر کرادیا تھا کہ وقت پر کام آئے۔ اچھا خدا حافظ۔

عشرت دبے پاؤں ناصر کے مکان میں داخل ہؤا۔ اکرم کے آدمی نے دروازہ کھلا ہی رکھا تھا۔ عشرت اُس کے پیچھے ہولیا۔ وہ اُسے ناصر کے کمرے کے سامنے چھوڑ کر چلا گیا۔ عشرت اندر داخل ہؤا۔ ناصر گہری نیند سو رہا تھا۔ پلنگ کے پاس ہی تپائی پر ٹائم پیس پڑا تھا۔ عشرت نے پہلے تو بندوق کا رُخ ناصر کے سینے کی طرف کیا اور پھر ایک ہاتھ مار کر ٹائم پیس تپائی سے نیچے گرا دیا۔ اس آواز سے ناصر بیدار ہوگیا۔ لیمپ کی دھیمی روشنی میں اس کی نگاہیں عشرت کے چہرے پر پڑیں۔ اس نے ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ کہا "سلیم"۔ عشرت نے بندوق کو وہیں پھینکا۔ اور نہایت سرعت کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

ناصر چند لمحوں تک تو سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ کیا ہؤا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس کے حواس بجا ہوئے۔ اُس نے کہا "یہ سلیم نے کیا کیا؟ وہ میری جان لینا چاہتا ہے! اُس سے اس کا کیا مقصد تھا"؟۔ اُسے فوراً اکرم کی باتیں یاد آگئیں۔ اسے خیال آیا کہ سلیم میرے روپے پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس خیال سے اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ وہ سر کو پکڑ کر پلنگ پر بیٹھ گیا اور یوں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا "اُف! سلیم واقعی دغاباز نکلا۔ آہ آج مجھ پر کس قدر تلخ حقیقت منکشف ہوئی۔ میں نے کیا دیکھا جس کے دیکھنے کی مجھے کبھی اُمید نہ تھی۔ کیا دنیا میں محبت کا یہی بدلہ ملا کرتا ہے؟

وہ اُٹھا اور سلیم کی بندوق ہاتھ میں لے کر کہنے لگا۔ "یہ بندوق میں نے اُسے اسی لئے تحفتہً دی تھی کہ وہ اس سے مجھی کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے"۔ دفعتہً اُس کے دل میں غیظ و غضب کا طوفان اُمنڈ پڑا۔ اس شخص کے لئے جس سے اُس نے بھائیوں سے بڑھ کر محبت کی تھی لیکن جو ایسا کمینہ نکلا کہ اس نے اس محبت کی کچھ قدر نہ کی۔ جس کی پست فطرت اس محبت کو بالکل نہ سمجھ سکی۔ اس نے کمرے سے باہر نکل کر چاروں طرف سلیم کو دیکھا لیکن اسے کہیں نہ پا کر وہ اُس کے کمرے کی طرف گیا۔

سلیم دردِ سر کی شدت سے ابھی تک سو نہ سکا تھا۔ وہ پلنگ پر پڑا کروٹیں لے رہا تھا۔ ناصر کو دیکھ کر بولا "اوہ ناصر! تم نے اس وقت کیوں تکلیف کی۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ یونہیں سر میں خفیف سا درد ہو رہا ہے"۔

ناصر۔ (گرج کر) "اب تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ میں نے تمہیں اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ لیکن خدا کو منظور نہ تھا کہ ایک دغاباز احسان فراموش یوں کسی بے گناہ کی جان لے۔ اُس نے تمہارے ہی ہاتھوں مجھے بیدار کرا دیا۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم صبح ہی یہاں سے چلے جاؤ۔ چونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے اس لئے میں تمہیں کوئی نقصان

نہیں پہنچانا چاہتا۔ کیونکہ مجھ میں کچھ انسانیت ہے میں تمہاری طرح حیوان نہیں ہوں"۔

سلیم نہایت تعجب سے یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ اس نے بہتیرا ہی ناصر کو اپنی بے گناہی کا یقین دلایا۔ لیکن ناصر نے اسکی ایک بات نہ مانی۔

اس واقعہ سے ایک روز پہلے ناصر کو ایک گمنام خط ملا تھا جس میں لکھا تھا کہ "سلیم تمہاری جان لینا چاہتا ہے" اس کے ساتھ ہی سلیم کو بھی اس مضمون کا ایک خط ملا کہ "ناصر اب تم سے بہت اکتا گیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں گھر سے نکال دے۔ چنانچہ وہ عنقریب کسی حیلے کے ساتھ تمہیں اپنے سے الگ کردے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم خود ہی اسے چھوڑ دو۔ تاکہ اُس وقت ندامت نہ اٹھانی پڑے"۔

اس وقت تو ان دونوں نے ان خطوں کے مضمون کا خیال نہ کیا۔ لیکن آج انہوں نے ان پر یقین کرلیا سلیم نے ارادہ کیا کہ جس طرح ناصر نے میری محبت کو ٹھکرا دیا ہے۔ اب میں کبھی اسے صورت نہ دکھاؤں گا۔ اُس نے فوراً وہاں سے رخصت ہونے کی تیاری شروع کردی اور صبح تک بالکل تیار ہوگیا۔ جب وہ وہاں سے روانہ ہونے لگا۔ تو اُس کی آنکھوں کے سامنے گذشتہ اٹھارہ سال کا تمام نقشہ کھینچ گیا۔ اس نے بہتیرا ضبط کرنا چاہا مگر آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک چشمہ اُبل پڑا۔ وہ بڑی دیر تک روتا رہا۔ آخر اٹھا اور یہ سوچ کر کہ آخری مرتبہ ناصر کو بھی دیکھ لوں اُس کے کمرے کی طرف گیا ناصر کمرے میں نہایت اضطراب کے ساتھ اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ اسے اس وقت جو روحانی تکلیف پہنچ رہی تھی وہ اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔ سلیم اُس کے قریب گیا اور بولا "میں اُس محبت کا جو آپ نے آجتک مجھ سے کی تھی دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چونکہ اب آپ مجھے محبت کے قابل نہیں سمجھتے۔ اس لئے میں آیندہ آپ کو کبھی اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔ میں اس لئے یہاں آیا ہوں کہ جانے سے پہلے ایک مرتبہ اپنے بے وفا دوست کو دیکھ لوں"۔ ناصر نے کہا "سلیم! اب اس دیدہ دلیری سے مجھے زیادہ تکلیف نہ پہنچاؤ، میرا دل پک گیا ہے، اب میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کرو۔ میں بہت ضبط کر رہا ہوں جو تمہیں کچھ نہیں کہتا۔ مگر تم میری شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مجھے اور تنگ کر رہے ہو۔ سلیم! اگر میں تمہاری بندوق اپنے کمرے میں گری نہ پاتا تو بخدا! مجھے تم پر اس قدر بھروسا تھا کہ میں اپنی آنکھوں کا بھی اعتبار نہ کرتا۔ مجھے تم پر ایسی امید نہ تھی بلکہ میں تو یہ بھی خیال نہ کرسکتا تھا کہ تم کبھی مجھ سے جُدا ہوگے"۔

سلیم نے ایک حسرت بھری نگاہ اُس کے چہرے پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہاں سے نکل کر وہ اس ندی کے کنارے جو اُن کے مکان کے قریب ہی بہتی تھی، درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچا۔ یہ جگہ ان دونوں کو بہت پسند

تھی۔ اور اکثر شام کا وقت وہ یہیں گزارا کرتے تھے۔ اس نے ایک وداعی نظر اُس جگہ پر ڈالی اور باچشم نم وہاں سے چلا آیا۔

سلیم کی گاڑی جب وہاں سے روانہ ہوئی تو ناصر اسے کھڑکی میں سے دیکھتا رہا۔ جب گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو وہ پلنگ پر گر پڑا اور بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رونے لگا۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک وہ یونہیں رویا کیا۔ لیکن پھر اُس نے سوچا کہ "میں کس قدر بیوقوف ہوں جو اپنے دشمن کے لئے رو رہا ہوں۔ اُس نے تو اٹھارہ سال کے رشتۂ محبت کو دولت کی خاطر اس بے دردی سے توڑ ڈالا اور میرے دل میں ابھی تک اُس کی محبت باقی ہے۔ مجھے اب اسے بھول جانا چاہیئے"۔

سلیم نے قریب ہی ایک قصبہ میں رہنے کے لئے مکان لے لیا۔ اب اُسے دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرتا تھا۔ اس کا مکان جس سڑک کے کنارے واقع تھا اُس پر سے وہ اور ناصر شکار کی غرض سے کئی دفعہ گزر چکے تھے سلیم تمام دن کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر گزرنے والی گاڑیوں کو دیکھا کرتا۔ اس امید پر کہ شاید کبھی ناصر ادھر سے گزرے اور وہ اسے ایک نظر دیکھ لے۔ ہر دور سے آنے والی گاڑی پر اس کی منتظر آنکھیں جم جاتیں۔ اس کے تاریک دل میں اُمید کی ایک کرن چمک اُٹھتی۔ لیکن افسوس کہ اُس کی نگاہیں کبھی کامیاب نہ ہوتیں۔

ناصر نے سلیم سے جدا ہونے کے بعد گھر سے نکلنا ترک کر دیا۔ وہ نہ کبھی سیر کو جاتا نہ شکار کو۔ اکرم کبھی اُس کے پاس آتا اور نہایت ہمدردی سے کہتا "آپ کیوں اس قدر افسردہ خاطر رہتے ہیں۔ آپ کی صحت بہت خراب ہو رہی ہے خدا کے لئے اپنے حال پر رحم کیجیئے"۔ وہ جواب دیتا "اکرم! میرے دل سے اُس بے وفا کی محبت نہیں نکل سکتی جس نے میری زندگی میں داخل ہو کر چند سال کے لئے اسے نہایت خوشگوار اور پر لطف بنا دیا تھا۔ خواہ اُس نے مجھ سے بے وفائی کی لیکن پھر بھی میں باوجود ہزار کوشش کے اُسے نہیں بھول سکتا"۔

ایک دن اکرم نے سوچا کہ اب وحید کو اپنا کارنامہ سنانا چاہیئے۔ یہ سوچتے ہی اُس نے وحید کے پاس جانے کی تیاری شروع کی دوسرے روز وہاں جا پہنچا اور اُس سے کہا "لو میں نے سلیم اور ناصر پر فتح پا لی ہے۔ اب اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھ آؤ کہ سلیم ناصر کے پاس نہیں ہے"۔ وحید کو یہ سن کر سخت رنج ہؤا۔ لیکن اس نے اکرم سے اپنا رنج چھپایا اور ہنس کر کہا "بھئی بڑے حضرت ہو۔ لیکن یہ تو کہو یہ ہؤا کیونکر؟"۔ اسی طرح تدبیر کے ساتھ تمام بات اُس سے معلوم کر لی کہ کس طرح اس نے سلیم اور ناصر کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔ اکرم کے جاتے ہی وحید نے یہ تمام واقعہ ناصر اور سلیم کی طرف الگ الگ خطوں میں لکھ دیا۔

ناصر کو جب یہ خط پہنچا تو خوشی اور رنج کی دو متضاد کیفیتوں سے اس کی عجیب حالت ہوگئی۔ کبھی وہ اس بات سے

خوش ہوتا کہ سلیم بے گناہ ہے اور وہ دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے ملنے والے ہیں اور کبھی اس بات سے اسے رنج پہنچتا کہ اُس نے سلیم کے دل کو کس طرح توڑ ڈالا تھا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ اسی دن سلیم کے پاس جا کر اس سے معافی مانگے اور اسے پھر اپنے پاس لے آئے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک آدمی نے آکر اس کے ہاتھ میں ایک خط دیا۔ لفافہ پر سلیم کی تحریر دیکھ کر ناصر نے نہایت اضطراب سے لفافہ چاک کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔ "میں دنیا میں صرف چند گھنٹے کا مہمان ہوں۔ اور مرنے سے پہلے ایک بار آپ کو دیکھ لینا چاہتا ہوں۔ اگرچہ آپ مجھے بھول چکے ہیں اور مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ آپ سے اس استدعا کے پورا ہونے کی اُمید رکھوں۔ لیکن میں آپ کو اُس بھولے ہوئے عہد محبت کا واسطہ دیتا ہوں (جب کہ آپ مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور میری ہر آرزو کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے) کہ میری آخری تمنا پوری کر دیجئے"۔

یہ خط پڑھ کر ناصر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ وہ رونے لگا اور بولا "سلیم! خدا نہ کرے اب تم مجھ سے جدا ہو۔ خدا تمہیں زندہ رکھے"۔

ناصر گھبرایا ہوا سلیم کے کمرے میں داخل ہوا اُس نے پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا کہ سلیم اب آخری سانس لے رہا ہے۔ ملازم نہایت افسوس سے اپنے مہربان آقا کے زرد چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور ڈاکٹر اُسے وحید کا خط سنا رہا تھا۔

ناصر کی طرف دیکھ کر سلیم نے کہا "ناصر! تم آگئے۔ میری روح تمہیں دیکھنے کے لئے بے قرار تھی، اور تمہارے ہی انتظار میں وہ میرے جسم سے اب تک جدا نہ ہو سکی۔ اب میں اطمینان سے مر سکوں گا۔ یہ موت اور یہ چند روزہ جدائی مجھے سب ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ ناصر! میری روح تم سے اب بھی جدا نہ ہو گی۔ میری محبت، میری دعائیں عمر بھر تمہارے ساتھ رہیں گی"۔

وہ پلنگ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ناصر نے یہ کہتے ہوئے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا "سلیم! مجھ بدنصیب کو معاف کر دو۔ مجھے تم سے اسی طرح محبت ہے، اور میں نے تم سے جدا ہونے کے بعد کبھی چین نہیں پایا"۔ سلیم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "ہاں میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم بے گناہ تھے۔ ناصر نے سلیم کو پلنگ پر لٹانا چاہا۔ لیکن سلیم کے بازو اُس کی گردن کے گرد سخت ہو گئے۔ ناصر نے بمشکل اُسے اپنے سے علیحدہ کر کے بستر پر ڈال دیا۔

سلیم ایک بے جان جسم تھا، مگر اُس کے سفید ہونٹ متبسم تھے۔ ناصر نے جھک کر اُس کی نیم وا آنکھیں بند کر دیں اور اُس کی پیشانی کو چوم لیا +

ع - ب

میری جھونپڑی

سب وسعتوں سے آگے اک ارضِ رنگ و بو ہو
ہو دور اِس جہاں سے نزدیکِ بزمِ ہُو ہو
انسان کا تصوّر معذورِ جستجو ہو
اُس خلوتِ سکوں میں دنیائے آرزو ہو
خاموش زندگی ہو
اور میری جھونپڑی ہو

جب محملِ شفق میں لیلائے شام آئے
دوشیزۂ سکوں جب بالائے بام آئے
جب کاروانِ انجم مستِ خرام آئے
جب سازِ خامشی سے شب کا پیام آئے
اک مستِ تیرگی ہو
اور میری جھونپڑی ہو

جب مسکرا رہے ہوں زریں قبا ستارے
جب گیت گا رہے ہوں کچھ نغمہ زا ستارے
جب تھرتھرا رہے ہوں مستِ حیا ستارے
جب جھلملا رہے ہوں جانِ ضیا ستارے
ہلکی سی روشنی ہو
اور میری جھونپڑی ہو

وہ چاند وہ حسینہ وہ تاجدارِ زریں
چھا جائے جب جہاں پر بنکر بہارِ زریں
گردوں پہ بہ رہا ہو اک آبشارِ زریں
اٹھ اٹھ کے جھومتی ہو موجِ خمارِ زریں
پُرکیف چاندنی ہو
اور میری جھونپڑی ہو

جب کوثرِ شفق سے موجِ شراب اُٹھے
گلریز وادیوں سے بوئے گلاب اُٹھے
وہ صبح کی حسینہ جب بے نقاب اُٹھے
جب وقت مسکرا کر تیرا شباب اُٹھے
تو مستِ بےخودی ہو
اور میری جھونپڑی ہو

جب شام کی خموشی پیمانۂ سکوں ہو
دامانِ بزمِ فطرت کاشانۂ سکوں ہو
ہر منظرِ مسکّر میخانۂ سکوں ہو
اے کاش اس وقت میری بیگانۂ سکوں ہو
تو گیت گا رہی ہو
اور میری جھونپڑی ہو

جب کوندتے ہوں جلوے طوفانِ رنگ و بو میں
جب گونجتے ہوں نغمے ہیجانِ رنگ و بو میں
جب جھومتی ہوں بوندیں نیسانِ رنگ و بو میں
جب کھیلتی ہوں حوریں دامانِ رنگ و بو میں
ہاں! شغلِ مے کشی ہو
اور میری جھونپڑی ہو

روش صدیقی

کسرِ نفسی

پست ہمت اور اخلاق کو کمزور کرنے والے امراض میں کسرِ نفسی میں حد سے تجاوز کر جانا ایک مہلک ترین مرض ہے اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنی کم بضاعتی اور ہیچ میرزی کا ذکر بڑے ذوق وشوق سے کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو ذلیل، سیہ کار اور ناچیز جرم خاک کہتے ہیں حالانکہ خدا نے انہیں سلطان، امیر اور مرد وعورت پیدا کیا۔ اس لئے انہیں چاہیئے کہ اپنی نیک خلقی اور پاکیزہ سرشتی کا ذکر تشکر اور تفاخر کے ساتھ کریں۔

خدا تعالےٰ نے انسان کو بلند فطرت بنایا۔ تاکہ وہ قدرت کی مخالف قوتوں کا مقابلہ عزم واستقلال سے کر سکے اپنی تذلیل وتحقیر کرنا اُس کی بارگاہ میں انتہا درجہ کی ناشکر گزاری اور بدترین گناہ ہے۔

تذلیلِ نفس کی عادت اخلاقِ فاضلہ کے حق میں سم قاتل ہے۔ انسان اپنی نگاہوں میں خود بے اعتبار ہو جاتا ہے آزادی اور اطمینان ضایع ہو کر وہ بے ریڑھ کی ہڈی کا ڈھانچ رہ جاتا ہے۔ پاکیزہ سیرتی اور خوش اخلاقی جو شریف طبیعت کا خاصہ ہے تباہ ہو جاتی ہے۔

اکثر لوگوں کی افتاد ہی ایسی ہوتی ہے کہ مجلس میں وہ سب سے پیچھے اور حتے الوسع ایسے مقام پر بیٹھتے ہیں جہاں لوگوں کی نظریں اِن پر نہ پڑیں انسان فطری طور پر تذلیلِ نفس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے فطرت اس امر کی مقتضی ہے کہ وہ آزادانہ طور پر زندگی بسر کرے۔ اُس کے خیالات آزاد ہوں اور اپنے تئیں وہ ہر لحاظ سے اشرف المخلوقات کہلانے کا اہل بنائے۔ دنیا بھی ایسے آدمی سے محبت کرتی ہے۔

اس مرض کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تمہاری طبیعت ایسے لوگوں سے متنفر ہو چکی ہے جو اپنے تئیں حقیقت سے کہیں بڑھ کر ظاہر کرتے ہیں تم متواتر ان کو ذلیل وخوار دیکھ کر قابلیت کے اظہار سے بھی نفرت کرنے اور اپنے آپ کو ہیچ اور ناچیز شمار کرنے لگتے ہو۔ لیکن یاد رکھو کہ تذلیلِ نفس سے نہ کوئی دنیا میں کامیاب ہؤا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے اور اپنی قابلیت کے صحیح اندازہ کے بعد اپنی ذات پر اعتماد کرنے میں بہت فرق ہے۔

اپنی عزت آپ کرنا اور اپنے متعلق اعلےٰ خیالات رکھنا انسان کو گناہ کی خواہش ہی سے نہیں بچاتا بلکہ اُس کو ناکامی کی تلخی سے بھی آشنا نہیں ہونے دیتا۔ اُس شخص سے جو اعلےٰ خیالات رکھتا ہے کبھی کمینہ حرکات سرزد نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ خفیہ سازشوں اور ذلیل کوششوں کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

دنیا کی نظر میں تمہارا رتبہ کچھ بھی ہو۔ تم کبھی اپنی تحقیر نہ کرو اگر زر ومال جاتا ہے تو جانے دو۔ جائداد تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے ہر شے سے مفارقت اختیار کرو۔ لیکن خدا کے لئے خود داری کو ہاتھ سے نہ دو۔ (سویٹ مارڈن)

محمد حنیف

تیری یاد میں

آہ بھر بھر کے تجھے یاد کیا کرتا ہوں
دل کو اس طرح سے برباد کیا کرتا ہوں

میری آنکھوں میں رہے میرا ستارہ یارب
شب کو رو رو کے یہ فریاد کیا کرتا ہوں

تیرا فرماں تھا کہ اُلفت میں مری خوش رہنا
غم سے اپنے تجھے ناشاد کیا کرتا ہوں

جب سے میں تیری محبت میں گرفتار ہُوا
ہر گرفتار کو آزاد کیا کرتا ہوں

دلِ غمگیں کو ترے شاد کرے تا کہ خدا
غم زدہ جو ہیں اُنہیں شاد کیا کرتا ہوں

سنگ دل جو ہیں اُنہیں دل سے دعائیں دے کر
اُن کی بیداد پہ بیداد کیا کرتا ہوں

شام ہوتی ہے تو میں حُسنِ تصوّر سے ترے
دل کے ویرانے کو آباد کیا کرتا ہوں

اُسے معلوم ہے کیا شے دلِ بیدل ہے بہارؔ
آہ بھر بھر کے جسے یاد کیا کرتا ہوں

بہارؔ

سرابِ نظر

وہ تھیئیٹر کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔

رائیلے نے اُسے پکڑ لیا اور اندر داخل ہونے سے باز رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس نے کہا "نہیں برونو! یہاں نہیں! طرب گاہوں میں اُس کی تلاش بے سود ہے"۔

مگر شکستہ دل ملاح نے جو اپنی بیوی کی جدائی میں دیوانہ ہو رہا تھا نہایت روکھے پن سے اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے چھڑا لیا اور ایک عزمِ آہنی کے ساتھ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا "تم چاندی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا گنوا کر اُسے ادھر اُدھر ڈھونڈتے پھرتے ہو اور مَیں جس کا خزانہ لُٹ گیا اُس کو تلاش نہ کروں"۔

برونو اپنی بیوی کو عصمت کی دیوی اور نیکی کا فرشتہ سمجھتا تھا وہ اُسے تمام گرجوں اور خانقاہوں میں آبادی کے ہنگاموں اور جنگل کی عزلتوں میں ڈھونڈھ رہا تھا۔ برونو کا دوست رائیلے اُس کے اِس جنون میں اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ رائیلے کو معلوم ہو چکا تھا کہ میڈیلون اسی تھیئیٹر میں اکٹریس کی حیثیت سے کام کر رہی ہے اور اس لئے وہ برونو کو ہر ممکن طریقے سے وہاں جانے سے روک رہا تھا۔ رائیلے کو یقین تھا کہ برونو اُس بیوی کو جس پر اُسے اس قدر حسنِ ظن ہے اِس پست حالت میں دیکھ بالکل ہی دیوانہ ہو جائے گا۔

لیکن قبل اس کے کہ وہ اسے دوبارہ روک سکے برونو نے ٹکٹ والے کی طرف ایک سکہ پھینکا اور تماشائیوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

روشنی کے طوفان، موسیقی کے شور، زر و جواہر اور رنگ و زیبائش کے وفور سے برونو کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں اور اُس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ وہ ہجوم کے درمیان جہاں خود اُس نے اپنے آپ کو لا پھنسایا تھا ایک ستون کی مانند کھڑا تھا۔ اُس کا بلند و بالا قد سب سے اونچا نظر آ رہا تھا، اُس کی وحشت آمیز، درد مند آنکھیں ایک زخمی شیر کی طرح ہر طرف دیکھ رہی تھیں، اس کی قمیص کا گریبان کھُل کر پیچھے کی طرف ہٹا ہوُا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے سیاہ بال لہریں لیتے ہوئے اس کے گندمی چہرے کے پر شکوہ اور سخت و درشت نقوش کی مخالف سمت چلے گئے تھے۔ وہ لوگوں کے ہنستے ہوئے ہجوم کے درمیان بالکل ایک صحرائی درندے کی مانند گھرا ہوُا تھا۔

سٹیج پر پریوں کے ملک کا ایک نظارہ پیش کیا جا رہا تھا اور لوگ اُسی کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے اور تالیاں بجا

رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک اور گھنٹی بجی۔ اس دفعہ ایک ایسا نظارہ سامنے آیا جس میں جنگل اور پانی، سیمین چشمے اور گلاب کے تختے دکھائے گئے۔ سفید پروں والی پریاں درختوں کی ٹہنیوں پر اُڑتی پھرتی تھیں۔ اور دوشیزہ لڑکیوں کی جماعتیں جن کے لباس دنیا کے ایک ایک پھول کی طرح ترتیب دیئے گئے تھے موسیقی کی ہر بہر لَے کے ساتھ مل مل کر رقص کر رہی تھیں۔
ریویرا کے ماہی گیر کے لئے یہ سب کچھ حقیقی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی بھوری آنکھیں حیرت آمیز خوف کے ساتھ اس نظارے کو دیکھ رہی تھیں۔ اُس کے کند دماغ میں جادو کی وہ کہانیاں چکر لگا رہی تھیں جو اُس نے اپنے بچپن میں سنی تھیں جو اُن ملکوں کے متعلق تھیں جہاں اُس کے خیال کے مطابق کسی فانی انسان کے قدم نہیں پہنچ سکتے۔ وہ بالکل سیدھا کھڑا تھا، حیران، بے حس و حرکت۔ آواز کے زیر و بم، حرکات کی ہم آہنگی، اور روشنی کی جوت نے جو رات کی تاریکی میں سے یہاں آ کر اُس کی نظر کو خیرہ کر رہی تھی اُس کے سر کو چکرا دیا +

اِس تمام عرصہ میں اُس کی نظر رقص کرنے والی ہزاروں لڑکیوں کے مجموعی حسن میں سے ایک ایک کے چہرے پر متجسسانہ پڑ رہی تھی ــــــ اُس چہرے کے تجسس میں جس کو وہ آج تک نہ پا سکا تھا۔

پھولوں کی کیاریوں کو پھاندتی ہوئی اور مخملیں جادوں کو طے کرتی ہوئی ایک عورت کی سراپا شوکت صورت نظر آئی جس کا لباس کنول کے پھول کی طرح سجایا گیا تھا۔ اُس کا جسم "لباس کے پھول" کی سفید اور سبز پنکھڑیوں میں بمشکل چھپ رہا تھا۔ اُس کے سنہری بال ایک جوئے زریں کی طرح لہرا رہے تھے اور اُس کی نیلی نیلی آنکھیں مسرت وانبساط سے ہنس رہی تھیں۔

کوریاس جب لیک کر "پھول لڑکیوں" کے حلقہ میں آئی تو ایسا معلوم ہوا گویا وہ ابھی اپنے اُٹھتے ہوئے شباب کی فصلِ بہار میں ہے۔ اور جب اُس نے گانا شروع کیا تو اُس پر کسی بلبلِ خوشنوا کے ہلکے ہلکے اور میٹھے میٹھے نغموں کا گمان ہونے لگا۔

معاً اُس کے نغموں کو چیرتی ہوئی ایک آواز آئی "یہ وہی ہے"!

ایک لمحہ کے لئے وہ بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں روشنی سے چمک رہی تھیں۔ اُس کا سینہ ابھرتا تھا اور گرتا تھا۔ پھر وہ ایک ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا ہوا لوگوں کے سروں پر سے پھاندتا ہوا اور ایک نشست سے دوسری نشست پر کودتا ہوا اُس جگہ پہنچ گیا جہاں وہ کھڑی تھی۔

کوریاس کے لبوں کی موسیقی گنگ ہو گئی۔ "پھول لڑکیوں" کا حلقہ اُسے اکیلے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اُس کی چمکتی ہوئی آنکھیں مجرمانہ ہراس سے بھر گئیں۔ وہ بے قوت اور بے حرکت اُس شخص کی طرف دیکھنے لگی جس کی عزت کو

اُس نے تباہ وبرباد کر دیا تھا۔ اُدھر سازندوں پر اور حاضرین پر ایک خوف آمیز خاموشی چھا گئی۔

برونو نے اپنی باہیں اُس کے لئے پھیلا دیں۔ اور اُس کی آواز خاموشی کو لرزاتی ہوئی نکلی "میڈیلون، میڈیلون! تم جنت میں ہو اور مجھے بھلا چکی ہو! کیا یہ حقیقت ہے؟"

اُس کا سارا جسم مرجھا گیا، اُس کے اعضا کی قوت سلب ہو گئی، وہ کانپ اُٹھا اور پھر ایک سکتے کے عالم میں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ ہجوم کے شور وغل اور متحیر حاضرین کی چیخ اور پکار میں کیا طاقت تھی کہ وہ اُس کے کانوں تک پہنچ سکیں۔ وہ صرف اُس عورت کی طرف دیکھ رہا تھا جسے اُس نے اس سنسان دنیا میں ڈھونڈھ پایا تھا ـــــ اُس عورت کی طرف جو اُس سے اجتناب کر رہی تھی اور اُس سے خوف کھا رہی تھی۔

وہ مجرمانہ دہشت جو برونو نے اس وقت اپنی بیوی کی آنکھوں میں دیکھی اُس کے دل وجگر کو ایک خنجر کی طرح چیر گئی اُس لرزا دینے والے خوف وہراس کے ساتھ جو اس وقت اُس کے حواس میں رواں دواں تھا ایسا معلوم ہؤا کہ اُس کے ہوش پھر بجا ہو رہے ہیں۔ اُس نے اپنا سر اوپر کو اُٹھایا، اِس طرح جیسے کوئی شیر ایک جانکاہ زخم کھا کر ایک آخری بار اپنے دشمن کو دیکھنا چاہے۔ اُس نے ایک نگاہ غصّے سے بھرے ہوئے اور طیش سے وارفتہ تماشائیوں پر ڈالی اور پھر ایک دفعہ اور اپنی بیوی کو دیکھا ـــــ اُس کے برف جیسے سفید اعضار کو، اُس کے سینے کو جو اُس کی زریں پوشاک میں سے کھلا ہؤا اُبھر اور گر رہا تھا، اُس کے رنگ آلود حسن کو جو نزدیک سے شباب کی تمام رعنائیوں سے معرا نظر آتا تھا۔

اُس وقت اُس پر روشن ہؤا کہ یہ جنت نہیں بلکہ دوزخ ہے اور اِس روشنی نے اُس سرابِ نظر کو جو اُس کی آدھی زندگی تک اُسے دھوکا دیتا رہا چیر کر دو ٹکڑے کر دیا۔ اُس نے اُسے پکڑ لیا، اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، پھر اُس کے نرم ونازک جسم کو بھینچ ڈالا اور ایک چیخ کے ساتھ جو تمام لوگوں کے دلوں سے اس طرح گزر گئی جیسے وہ سب یک دل ویک روح تھے اُس نے اُسے دھکا دے کر ایک طرف پھینک دیا۔

"تم میری بیوی نہیں ہو گو تمہاری شکل وصورت ویسی ہی ہے! آہ، اے نابکار ظالم شیطان! تو میرا منہ چڑاتا ہے۔ آہ! تو نے اُس کے ساتھ کیا کیا جس سے میری روح محبت کرتی تھی؛ تو اُس کے اعضا سے زیاں کاروں کی آنکھوں کی دعوت کرتا ہے، تو اُس کا حسن شہوت پرست ہجوم کے درمیان لٹاتا ہے اور وہ ہونٹ جو صرف میرے چومنے کے لئے تھے تو اِن تماشائیوں کے سامنے پیش کرتا ہے! مجھے بتا! وہ روح کہاں ہے جس کی میں پرستش کرتا تھا؟ وہ زندگی کہاں ہے جس سے مجھے محبت تھی؛ وہ خدا کی تھیں۔ تو اُن پر اپنا تصرف نہ کر سکتا تھا! وہ اُسی کے ہاتھ میں ہیں تو اُن پر اُس کے جسم کی طرح قبضہ نہ کر سکتا تھا!

ایک پل کے لئے وہ اِس طرح کھڑا رہا جیسے ایک جوانمرد سینے میں گولی کھا کر کھڑا رہتا ہے۔ پھر اُس کی شعلہ بار آنکھیں جنہیں اب کچھ نظر نہ آتا تھا اُن گروہ در گروہ تماشائیوں پر اٹھیں جو اب اپنی نشستیں چھوڑ چکے تھے۔ اُس کے چہرے پر اس وقت نامرادی و ناکامی کی ایک ناقابلِ اظہار شان نمایاں تھی۔ اُس کے ٹوٹے ہوئے دل سے ایک زور کی چیخ نکلی، پھر وہ اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنے سر کی طرف لے گیا اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اُس کی پیشانی اُس کی بیوی کے سینے پر آ رہی۔ اُس کے منہ سے لہو جاری ہو گیا اور اس خون سے نرگس کے وہ پھول جو اُس کی بیوی کے لباس میں پروئے گئے تھے سُرخ ہو گئے۔ جب لوگوں نے اُسے اُٹھایا تو وہ مر چکا تھا ——— وہ بیس سال سے مر رہا تھا +

"اودا" **منصور احمد**

غزل

کر گئے کام ولولے دل کے
قیس ہے ساتھ ساتھ محمل کے

توبہ کر بیٹھے مے کشی سے وہ
بن گئے جام جب مری گل کے

رکھ کے آنکھوں پہ لے گئے عشاق
سارے حلقے مری سلاسل کے

اب وہ طوفانِ زندگی کیسا
موج آغوش میں ہے ساحل کے

کس قدر تُند تھی شرابِ عشق
ہو گئے ٹکڑے شیشۂ دل کے

کیوں نہ بھٹکیں مسافرانِ عدم
پھیر میں آ گئے ہیں منزل کے

موجزن ہے حیات کا طوفاں
قطرہ قطرہ میں خونِ بسمل کے

گل کھلاتی رہی چمن میں بہار
زخم جب تک ہرے رہے دل کے

اللہ اللہ رے خمارِ ستم!
لڑکھڑاتے ہیں پاؤں قاتل کے

کر دیا فاش رازِ ناخنِ غم
کھول کر عقدے میری مشکل کے

اٹھتے جاتے ہیں باری باری سے
بیٹھنے والے تیری محفل کے

چھٹ گیا دامنِ امید تپش
رہ گئے خالی ہاتھ سائل کے

شیخ عبداللطیف تپش بی اے

محفلِ اَدب

ارتقائے حقیقت

جناب رگھوپت سہائے صاحب فراقؔ بی۔ اے کی یہ نظم ٹامس ہارڈی کی ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے جس کے بحر و قوافی کی ترتیب وہی ہے جو اصل نظم میں ہے۔ جناب فراقؔ کہتے ہیں کہ انگریزی نظموں کے ترجمے اردو نظم میں اکثر ہوئے ہیں لیکن غالباً یہ امر پہلی بار اس ترجمے میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کہ ترجمہ کا ہر مصرع اُسی بحر میں ہو۔ جس بحر میں اصل مصرع ہے۔

(نغمۂ ماہ وسال) (۱)

اب تک کھل نہ سکا یہ راز
کیوں ہے عالم سوز و گداز
کیوں قدرت نے
کیوں فطرت نے
ہر اک شے سے چھیڑ دیا ہے درد بھرا یہ نغمۂ ساز

(۲)

بے حس و بے جان
کچھ تغییر
خواب پریشان
کی تصویر
بے خبر اس سے کہ ہے کس حال میں ذی احساس ہر اک دلگیر

(نغمۂ ترحم) (۳)

کیا ہوگی نہ یہ ظلمت دور
کیا ہوگی نہ یہ غفلت دور
رفتہ رفتہ
درجہ بدرجہ
کیا نہ دلِ فطرت بدلے گا ہو کے محبت سے مجبور

(۴)

جو یہ حالت
یوں ہی رہی
جو یہ اذیت
کٹ نہ سکی
مٹ کے فنا ہو جائے تو اچھا ہر چلتی پھرتی ہستی

(آخری ترانہ) (۵)

لیکن کچھ ہے فضا لرزاں
جوشِ تموج سے ہے عیاں
ساری بلائیں
غم کی صدائیں
مٹ جائیں گی اور نہ چلیں گے دکھتے دلوں پر پھر پیکاں
فطرت کو جوش آئے گا دنیا ہو جائے گی رشکِ جناں

"نگار"

افلاطون کا فلسفۂ عشق

جب وہ عارف، جو عالمِ عینی کا گہرا مشاہدہ کر چکا ہے، کسی حُسن کے دیوتا کے چاند سے چہرے میں حسنِ حقیقی کا جلوہ دیکھتا ہے یا کسی قدِ موزوں کی دلفریبی پر نظر ڈالتا ہے۔ تو وہ سارے بدن سے لرز اُٹھتا ہے۔ اور اُس پر ویسی ہی مقدس ہیبت طاری ہو جاتی ہے جیسی حسنِ مطلق کے نظارہ سے ہوتی ہے۔ اُس وقت وہ اُس نوجوان، اُس خدائے حُسن کی دل و جان سے عبادت کرتا ہے بلکہ اگر اُسے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ اُسے احمق سمجھیں گے تو وہ اُس کے سامنے قربانی کرتا، جس طرح کسی بُت یا دیوتا کے سامنے کی جاتی ہے۔ اِس نظارہ کے عالم میں اُس پر عجیب و غریب واردات گزرتی ہے۔ اُس کے جسم کا ارتعاش جاتا رہتا ہے اس کی جگہ بے انتہا حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ پسینہ میں ڈوب جاتا ہے۔ حُسن کی کرنیں آنکھ کی راہ اُس کے وجود میں اُتر جاتی ہیں اور مرغِ روح کے گرد ایک جال سا بنا کر اُس کے بازوؤں کو گرما دیتی ہیں۔ یہ گرمی ساری سختی اور جمود کو جن سے پروں کے نکلنے میں رُکاوٹ تھی پگھلا دیتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے بازوؤں کی جڑیں حرارت سے غذا پا کر پنکھ بن جاتی ہیں اور پنکھ میں پر جم آتے ہیں۔ کیونکہ روح میں کسی زمانہ میں پر لگے تھے۔ وہ مجسّم بال و پر تھی۔ غرض روح گرمی سے کھولنے اور اُبلنے لگتی ہے اور جس طرح بچوں کے مسوڑوں میں دانت نکلتے وقت گُدگُدی اور ٹیس ہوتی ہے۔ اسی طرح روح میں بھی پر نکلتے وقت میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے اُسے بخار سا محسوس ہوتا ہے اور تپک اور ٹیس۔ جب کبھی اُسے معشوق کے حُسن کا نظارہ نظر آتا ہے۔ اُس کے آرزو کی کلی کِھل جاتی ہے حُسن کی حرارت سے گرما کر وہ درد سے نجات پاتی ہے اور خوب ہنستی کھیلتی ہے لیکن محبوب سے جدا ہوتے ہی وصل کی پیاسی روح پھر تڑپنے لگتی ہے۔ بازوؤں کی جڑیں سُوکھ کر بند ہو جاتی ہیں۔ اِس لئے پنکھ حرکت نہیں کر سکتے۔ اب مقید آرزو اور جکڑے ہوئے پر و بال نبض کی طرح اُچھلتے ہیں اور زنجیروں کو توڑ کر نکلنا چاہتے ہیں۔ اس لئے روح جس میں ہر طرف سے نشتر چبھ رہے ہیں درد سے بے چین ہو جاتی ہے۔ اگر کسی چیز سے فرحت ہوتی ہے تو معشوق کی یاد سے۔ لذت اور درد کے یوں مل جانے سے روح اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتی ہے، نہ رات کو نیند آتی ہے نہ دن کو چین آتا ہے۔ آرزو کی بے تابی کھینچ کر وہاں لے جاتی ہے۔ جہاں حسن کے مالک کو ایک نظر دیکھنے کی اُمید ہو۔ جب روح اُسے دیکھ لیتی ہے اور آرزو کو نکلنے کی راہ مل جاتی ہے۔ تب جا کر قیدیوں کو رہائی اور تازہ ہوا میں سانس لینا نصیب ہوتا ہے۔ روح کانٹوں کی خلش سے نجات پاتی ہے اور چند لمحوں کے لئے بے پایاں مسرت کے مزے لیتی ہے۔

"تعلیم و تربیت"

ایک تاریخی انکشاف

گذشتہ سال کے ماہ ستمبر میں۔ رومتہ الکبریٰ کے جو سکّے انگلستان میں برآمد ہوئے ہیں وہ تاریخی حیثیت سے

انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انگلستان میں روما کے عہدِ حکومت کے سب سے بڑے ماہر پروفیسر آر۔ جی۔ کولنگ وڈ، کا خیال ہے کہ ان سکوں کا وجود انگلستان میں روما کے دورِ حکومت کی تاریخ کو پلٹ دے گا۔ اور دوسری تاریخ لکھنی پڑیگی کیونکہ مؤرخین نے اپنے قیاسات کی بنا پر جو تاریخ لکھی ہے وہ غلط ہے اور جو نتائج انھوں نے مرتب کئے ہیں وہ قطعی بے دلیل ہیں۔

پروفیسر موصوف کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ تاریخِ انگلستان کا سنگِ بنیاد اُکھاڑ پھینکا جائے گا، اور جدید معلومات کی روشنی میں نئی بنیاد رکھی جائے گی۔

علمِ تاریخ کے شیدائی منتظر ہیں کہ دیکھیں تجدیدِ تعمیر کس ڈھب سے ہوتی ہے اور انگلستان کی قدیم تاریخ کے بدل جانے سے وہاں کے محققین اور ماہرین کے کمالات کی قلعی کس شان سے اُترتی ہے۔

"شمع"

قرآنِ پاک عرب عیسائی کی نگاہ میں

فلسطین میں سرکاری مدرسوں کے اعلےٰ مدرسین کی کانفرنس اس غرض سے منعقد کی گئی تھی کہ فلسطین کے مدارس کا نظام و نصاب مقرر کیا جائے۔ اس کانفرنس میں استاذ انیس صیداوی نے جو مسیحی ہیں اور یافہ کے مدرسہ ثانویہ کے مدرس اعلیٰ ہیں یہ تجویز پیش کی کہ سرکاری مدرسوں کے اعلےٰ درجوں میں قرآن کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ تاکہ عیسائیوں کی آیندہ نسل قرآن کی بلاغت کے فائدہ سے محروم نہ رہے اور اُن کی زبان درست ہو اور ملکۂ زبان حاصل ہو۔

سامریوں کی توراۃ

سامری فرقے کے اُن موسیوں کے پاس جو نابلس (شام) میں رہتے ہیں، حضرتِ موسےٰ کی پانچوں کتابوں کا سب سے قدیم نسخہ موجود ہے۔ جو مطبوعہ اور مشہورہ نسخہ سے جو موجودہ یہودیوں کے پاس ہے مختلف ہے۔ سامریوں کا دعوےٰ ہے کہ یہ نسخہ حضرتِ موسےٰ کی اولاد میں سے ایک کا لکھا ہوا ہے، اور یہ بنی اسرائیل کے کنعان میں داخل ہونے کے تھوڑے دن بعد لکھا گیا تھا۔

"معارف"

چینی مزدوروں کے گیت

میری بڑی بہن کپڑا بنتی ہے، میرا بڑا بھائی کپڑا بیچتا ہے۔ کپڑا بیچتا ہے اور چاول خریدتا ہے، ہمارے خالی پیٹ بھرنے کے لئے۔

میری بڑی بہن کپڑا بنتی ہے، میرا بڑا بھائی کپڑا بیچتا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی کے کپڑے پھٹے رہتے ہیں مگر ان کو پیوند لگانے کے لئے کوئی کپڑا نہیں ملتا۔

میری بڑی بہن کپڑا بنتی ہے، میرا بڑا بھائی کپڑا بیچتا ہے۔ کپڑا کون خریدتا ہے؟ وہ امیر آدمی جو سامنے رہتا ہے بدیسی کپڑا سستا ہے، دیسی کپڑا سخت ہے۔ بدیسی کپڑا عمدہ ہے امیر آدمی اُسی کو خریدتا ہے۔ دیسی کپڑا کوئی نہیں پہنتا میرا بھائی اور میری بہن بھوکے مرتے ہیں۔

(۲)

تم چاول بوتے ہو، میں کپڑا بنتی ہوں، وہ اینٹیں بناتا ہے۔ ہینگ ہو۔ ہینگ ہو۔ ہینگ ہو۔

آٹھ گھنٹے کام، آٹھ گھنٹے آرام، آٹھ گھنٹے مطالعہ، سب جو محنت اور مشقت کرتے ہیں انسانوں کے سے دماغ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ پڑھنا سیکھو۔

کتابیں پڑھو، مزدور احمق نہیں ہے، پڑھو اور سیکھو، سیکھو اور پڑھو۔

آٹھ گھنٹے مطالعہ، آٹھ گھنٹے آرام، آٹھ گھنٹے کام، سب جو محنت اور مشقت کرتے ہیں انسانوں کا سا دماغ پیدا کرنا چاہتے ہیں +

تبصرہ

تجلّی سفید رنگ کا سرمہ ہے جو آنکھوں کے تمام عوارض کے لئے مفید تسلیم کیا گیا ہے۔ جناب موجد نے اس سرمہ کا ایک پیکٹ ہمارے پاس بھیجا تھا جسے ہم نے دو تین ضرورت مند اشخاص میں تقسیم کر دیا۔ استعمال کے بعد سب نے تعریف کی ہے۔ جن اصحاب کو ضرورت ہو وہ ایک مرتبہ ضرور اس سرمہ کو آزمائیں۔ قیمت پانچ روپے فی تولہ ہے۔ تین ماشے سے کم روانہ نہیں کیا جاتا۔

ملنے کا پتہ:۔ منیجر کارخانہ تجلّی۔ شاہ دولہ گیٹ۔ گجرات (پنجاب)

مارچ ۱۹۳۶ء

اٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا

بیادگارِ علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوںؔ مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر ـ بشیر احمد ـ بی ـ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر { حامد علی خاں ـ بی ـ اے
منصور احمد

فہرستِ مضامین

جلد ۱۳ — بابت ماہِ مارچ ۱۹۲۸ء — نمبر ۳

تصویر:- چھٹی کی ایک رسم -

اِعلان

طلبہ کے لئے ہمایوں کے چندہ میں تخفیف

ہمایوں اُردو زبان کا بہترین رسالہ ہے۔اِس کے ظاہری اور باطنی محاسن پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ ملک بھر کے علما و اُدبا کی تحریریں ہر مہینے "ہمایوں" کے اوراق کی زینت بنتی ہیں۔اِس کے علاوہ اُس کی عنانِ ادارت نہایت قابل ہاتھوں میں ہے۔صحتِ زبان اور سلامتِ ذوق کے اعتبار سے یہ ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اِسی لئے اِس کی اشاعت کا ایک معقول حصّہ سکولوں اور کالجوں میں جاتا ہے۔ہم طلبہ کے فائدہ کے لئے اعلان کرتے ہیں کہ اگر وہ مارچ کے مہینے میں "ہمایوں" کے خریدار بنیں گے تو اُن سے سالانہ چندہ پانچ روپے کی بجائے صرف تین روپے لیا جائے گا جو دراصل "ہمایوں" کا ششماہی چندہ ہے۔

ہمیں امید ہے کہ وہ اِس موقع سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔ ۳۰ مارچ کے بعد کسی فرمائش کی طرف توجہ نہ کی جائے گی۔

مینیجر رسالہ "ہُمایوں"

۲۴-مزنگ روڈ- لاہور

جہاں نما

فطرت کا انتقام

تہذیب نے حواسِ انسانی کو کُند کر دیا ہے

فطرت جو چیز ہمیں عطا کرتی ہے اُس کی قیمت وہ وصول کر لیتی ہے۔ مہذب انسان اب تہذیب کی قیمت ادا کر رہا ہے۔

فطرت نے انسان کو ادنیٰ حیوانوں کی بہ نسبت زیادہ پیچیدہ اور زیادہ گہرے دماغی آلات عطا کر رکھے ہیں مگر اب وہ اُن کی قیمت کا مطالبہ کر رہی ہے۔ تہذیب کے اس عطیہ کے لئے اگر وہ عطیہ کہلائے جانے کے قابل ہے ہم جو کچھ ادا کر رہے ہیں وہ ہمارے ہوش و حواس ہیں۔ جس قدر ہمارا دماغ ترقی کرتا ہے اتنا ہی ہمارے حواس ہمیں جواب دیتے جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر وہ بیکار ہو رہے ہیں۔ اس کے ثبوت میں یہاں ہم کچھ مثالیں پیش کریں گے۔

ہاتھیوں کی ایک ٹولی جنگل کی زمین کو پامال کر رہی ہوتی ہے کہ یکایک کہیں سے سانبھر کے ڈکرانے کی آواز آتی ہے۔ ہاتھی ہوا میں اپنا سونڈ اٹھا کر سونگھتا ہے۔ وہ اپنے کان کھڑے کر کے سُنتا ہے مگر اُسے کوئی آواز نہیں آتی۔ ایک لمحہ کے بعد تمام ہاتھی بھاگ اُٹھتے ہیں۔ اُن کو کچھ نظر نہیں آیا نہ انہوں نے کوئی آواز سُنی مگر پانچ میل کی دُوری سے انہوں نے اپنے دشمن انسان کی بُو پالی۔

قدیم زمانوں میں جب انسان اپنی دشمن قوتوں سے بھری ہوئی دنیا میں آوارہ پھرتا تھا اس دنیا میں جس میں وحشی درندے اور اُس کی اپنی نوع اُس کے در پئے آزار رہتی تھی۔ تو اُس کی قوتِ شامہ بہت تیز تھی۔ اُسے اپنے دشمن کی بُو دُور ہی سے آجاتی تھی۔ وہ ہوا میں سے معلوم کر لیتا تھا کہ دشمن کونسے راستوں سے گزر گیا ہے۔ مگر مہذب انسان اپنے حواس کو استعمال نہیں کرتا۔ اسی کی سزا قدرت اب اُسے دے رہی ہے۔

دریائے ٹیمز میں طغیانی آئی تو چوہے اپنے بلوں میں سے نکل نکل کر بھاگ گئے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے طوفان کی آواز سُن لی ہو یا ممکن ہے کہ اُن کو پانی کی بُو آگئی ہو۔ کچھ بھی ہو یہ چھوٹے چھوٹے حقیر جانور تجربہ کار انسان سے جسے طوفان نے آلیا جہد للبقا کے لئے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئے۔ وہ سیلاب زدہ مکانوں کے پردوں کے ساتھ چمٹ گئے درآں حالیکہ انسان پانی میں ڈوب رہے تھے۔

یہی حال ہماری سماعت کا ہے۔ کسی امریکی وحشی کے ساتھ جنگل میں چلے جاؤ، تم اُس کی باتیں سُن سُن کے حیران ہو گے کہ وہ کبھی کہیں دُور سے صرف ہرن کے پاؤں کی آہٹ سُن کر تمہیں اُس کا پتا دیتا ہے اور کبھی کسی دریائی بچھڑے کے دانت کٹکٹانے کی آواز کی خبر دیتا ہے۔

وہ کیا چیز ہے جس نے تمہارے کانوں کو اس وحشی کے کانوں سے مختلف بنا دیا ہے؟ اس کا جواب "تہذیب" ہے! کُتے کی سیٹی کو بجاؤ، اُس سیٹی کو جس کی آواز انسانی کان نہیں سن سکتے۔ تمہارا کتا اُسے سن کر دوڑ آتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ باوجود اپنے گھریلو پن کے قدرتی زندگی بسر کرتا ہے۔ اور اسی لئے اُس کے کان ہلکی سے ہلکی آواز سے بھی آشنا ہیں۔ تہذیب نے انسان کے بعض حواس کُند کر دیے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیئے کہ اُس کی قوتِ شعور صحیح طور پر اپنے فرائض انجام نہیں دیتی۔

صدارتِ جمہوریہ امریکہ

ریاست ہائے متحدہ کی سینات نے ایک قرار داد منظور کی ہے کہ کوئی وطن پرست شہری تیسری مرتبہ صدر منتخب ہونے کی کوشش نہ کرے۔ ساتھ ہی یہ ترمیم بھی پیش کی گئی کہ مسٹر ہربرٹ ہوور جماعتِ جمہوریہ کی طرف سے صدارت کے اُمیدوار ہوں گے۔ کیلون کولج پہلی دفعہ انتخاب کے ذریعہ سے صدر مقرر نہ ہوئے تھے بلکہ صدرِ منتخب کے انتقال پر وہ نائب صدر کے عہدہ سے ترقی کر کے صدارت تک پہنچے تھے۔ دوسری مرتبہ وہ منتخب ہوئے۔ سینات کی قرار داد غالباً صدرِ موصوف کے تیسری مرتبہ منتخب ہونے کے خلاف ایک آواز ہے۔ سینات کو دستور میں کوئی ترمیم کرنے کا اختیار حاصل نہیں مگر اُس کی اس قرار داد سے ایک غیر تحریری روایت کا اجرا ہو گا کہ دو مرتبہ سے زیادہ کسی شخص کو صدر منتخب نہ ہونا چاہیئے۔

گوشۂ ہائیڈ پارک

لندن کا سب سے بارونق حصّہ

لندن کا سب سے زیادہ بارونق حصّہ پکیڈلی سرکس سمجھا جاتا تھا لیکن ماہِ جولائی کے ایک خوشگوار دن میں جب گزرنے

والی گاڑیوں کا شمار کیا گیا تو معلوم ہوُا کہ سب سے زیادہ گاڑیاں گوشۂ ہائیڈ پارک کی سڑکوں سے گزریں۔ ان کی تعداد ۱۴۴۴۵۵ تھی اس کے بعد ٹریفالگر کا چوک اور ماربل آرک تھے۔ پکیڈلی سرکس میں سے جو چوتھے درجے پر تھا ۱۰۷۴۹۳ گاڑیوں کا گزر ہوُا +

اس شہر کے متعلق بعض دوسرے اعداد و شمار بھی نہایت عجیب و غریب ہیں۔ مثلاً لنڈن میں ٹیلیفون کے تاروں کی مجموعی لمبائی ۱۹۸۹۵۹۴ میل ہے۔ اور ہر سال ٹیلیفون پر ۹۲۲۹۰۰ ۱۵ مرتبہ گفتگو کی جاتی ہے۔

لندن کے بازاروں کی مجموعی مسافت ۲۲۲۱ میل ہے۔ اور ٹریم وے کی لائن کا طول ۳۵۷½ میل۔ لندن میں ۹۳۴۹ ہوٹل اور قہوہ خانے وغیرہ ہیں۔ اور وہاں کی پولیس کے آدمیوں کی تعداد ۲۰۰۵۸ ہے۔ سالانہ ۴۱۰۱۹ حادثات پیش آتے ہیں۔ ایک سال میں وہاں ۲۳۷۱۳ معاملات کی تفتیش ہوئی اور ۴۹۱۹ مقامات پر آگ لگی +

دل کو مضبوط بنانے کا طریقہ

دل کو مضبوط بنانے کا دراصل ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ مسلسل، باقاعدہ اور کافی ورزش کی جائے۔ ورزشوں میں بلندیوں پر یا سیڑھیوں پر چڑھنا سب سے زیادہ مفید تصور کیا گیا ہے۔ جس شخص کی نبض ایک مرتبہ سیڑھیوں پر چڑھنے سے پچاس سے ساٹھ ضربوں تک پہنچ جاتی ہو اُسے چاہئے کہ وہ ہر روز سو مرتبہ سیڑھیوں پر چڑھے اور اُترے۔ ایک مہینے تک یا اس سے کچھ زیادہ عرصے تک ایسا کرنے سے اُسے معلوم ہو جائے گا کہ اب اس مشقت کے باوجود اُس کے دل کی حرکت معمول سے نہیں بڑھتی بلکہ ورزش نے اُس کے اس حیاتبخش عضو کو ایک لوہا کوٹنے والے لوہار کے عصبات کی طرح مضبوط بنا دیا ہے اور اس میں طاقت اور قوتِ برداشت حیرت انگیز طور پر پیدا ہو گئی ہے +

اسی قدر نہیں بلکہ دل کی کمزوری کی وجہ سے عضلات میں جو گرانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور سوءِ ہضم کے باعث جو بے آرامی محسوس ہوتی ہے اُس کے انسداد کے لئے بھی یہ طریقہ نہایت مفید ہے۔ سیڑھیوں پر چڑھنے اور اُترنے سے صرف ٹانگیں ہی مضبوط نہیں ہوتیں بلکہ چھاتی بڑھتی ہے۔ دل انحطاط سے بچ جاتا ہے۔ معدہ کے عصبات اور ہضم کرنے والے اعضاء مضبوط ہو جاتے ہیں۔ اور تمام جسم کھائی ہوئی غذا سے پورا پورا فائدہ حاصل کرتا ہے +

چھٹی کی ایک رسم

جننے کے بعد چھٹی کی رات کو دالان کے آگے چوکی بچھاتے ہیں۔ اور زچہ اور بچے کو بناؤ سنگار کرا کے باہر چوکی پر کھڑا کرنے لاتے ہیں۔ ماں بچے کو گود میں لے کر آتی ہے۔ دو عورتیں دونوں پہلوؤں میں ننگی تلواریں لئے ساتھ ہوتی ہیں۔ دائی آٹے کی چومک[1] اُٹھائے آگے آگے چلتی ہے۔ ماں بچے کو گود میں اور قرآن شریف کو سر پر رکھکر آسمان کی طرف دیکھتی اور چوکی پر کھڑی ہو کر سات ستارے گنتی ہے۔ اُس وقت دونوں تلواروں کی نوک سے نوک ملا کر زچہ کے سر پر قوس بنا دیتے ہیں۔ تاکہ اوپر سے جن اور پری کا گزر نہ ہو سکے۔ گویا آج سے جن و پری کے سایہ کا خوف دور ہو جاتا ہے۔ اِدھر ماں تارے دیکھنے جاتی ہے اُدھر لڑکے کا باپ تیر کمان لے کر زچہ کے پلنگ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور بسم اللہ پڑھ کر چھت میں تیر لگا کر گویا فرضی مرگ مارتا ہے چنانچہ اس رسم کا نام ہی مرگ مارنا پڑ گیا ہے۔ مرگ مارنے کا نیگ ساس داماد کو دیتی ہے۔

زچہ تارے دیکھ کر پلنگ پر آ بیٹھتی ہے۔ پلنگ کے آگے دسترخوان بچھایا جاتا ہے۔ چوکی میز کی طرح لگا دی جاتی ہے۔ اُس پر تورہ (چوبہ) چنا جاتا ہے جس میں پکی ہوئی سات ترکاریاں اور مختلف طرح کے کھانے ہوتے ہیں۔ سات سہاگنوں کے ساتھ مل کر زچہ رانی ذرا ذرا سا چکھ لیتی ہے۔ جسے چوبہ چکھانا کہتے ہیں۔ مبارک سلامت سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ گانا شروع ہو جاتا ہے:۔

جچا جب دیکھنے کو آئی تارے	ستارے چرخ گرداں نے اُتارے
ہوا فرزند یہ سب کو مبارک	کہو لڑکے کا باوا مرگ مارے
چھٹی کی دھوم جو پہنچی فلک تک	قمر اور مشتری دونوں پکارے
خدا نے کیا خوشی دونوں کو دی ہے	دمامے بج گئے گو بجے نقارے

اس کے بعد زچہ کے آگے کے تورے اور چومک میں روپے ڈال کر دائی کو دیتے جاتے ہیں +

ماخوذ از "رسوم دہلی"

منصور احمد

---

[1] آٹے کا ایک چراغ چومہا بنایا جاتا ہے۔ اُس میں چار بتیاں اور گھی ڈال کر جلاتے ہیں +



چھٹی کی ایک رسم

مُبادیٔ سیاسیات

حصّۂ اوّل، سیاسیاتِ نظریہ

مملکت اور اُس کے ہم جنس ادارات - اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ سیاسیات میں ایک مخصوص معاشری ادارہ یعنی مملکت کے تخیل، اس کے ارتقاء، اسکی مختلف صورتوں، اس کے آلۂ کار یعنی حکومت و دیگر مسائلِ متعلقہ پر بحث کی جاتی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نفسِ مملکت کے مفہوم کو واضح کر دیا جائے۔ اور جہاں تک ہوسکے اُس کے اور اس کے ہم قسم ادارات جیسے معاشرۂ انسانی، قوم، مُلک اور حکومت کے مابین فرق ظاہر کر دیا جائے +

آبادی - مملکت کی تعریف تقریباً ہر ایک سیاسی مُفکّر نے مختلف انداز سے کی ہے، لیکن اِن تمام تعریفوں میں چند عناصر مشترک پائے جاتے ہیں، اور اگر غور کیا جائے تو اِن مُفکّروں کے تخیلات کے درمیان کوئی اصولی فرق نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ مملکت کے قیام کے لئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ انسانوں کی ایک کثیر آبادی ہے۔ اس امر کا تعین ناممکن ہے کہ مملکت کی آبادی کتنی ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ تاریخ میں ایک طرف تو ایسی چھوٹی چھوٹی مملکتوں کا ذکر آیا ہے۔ جیسے یونانِ قدیم میں الیسؔ اور دورسؔ یا قدیم بنی اسرائیل کی مملکتِ کنعانؔ جن کی آبادی چند ہزار نفوس سے زیادہ نہ تھی، دوسری طرف چنگیز اور تیمور، کنشکؔ اور اشوکؔ کی عظیم الشان سلطنتیں ہیں اور زمانۂ موجودہ میں ممالکِ متحدۂ امریکہ اور بولشوی جمہوریۂ روس کو بھی مملکتوں کا ہی لقب دیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے آبادی کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بہت کم نہ ہونی چاہئے +

اراضی - مملکت کے لئے دوسرا جزوِ لاینفک ایک مستقل مُلک بھی ہے۔ خانہ بدوش اقوام جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی ہوں مملکت نہیں کہلائی جاسکتیں، خواہ اِن میں کتنی ہی تنظیم کیوں نہ ہو۔ مثلاً لوطؔ قوم نے اس وقت تک مملکت کی شکل اختیار نہیں کی جبتک وہ مغرب میں اسپینؔ اور مشرق میں جزیرہ نمائے بلقان کے ساحل پر آباد نہ ہوگئی۔ اگر کوئی قوم جغرافی حدُود کے اندر مستقلاً آباد ہو اور پھر کسی سبب کی بنا پر اپنے مساکن چھوڑنے پر مجبور ہو جائے تو نقلِ وطن کے دوران میں اس کی شانِ مملکت باقی نہ رہے گی +

مقتدرِ اعلےٰ - مملکت کے قیام کے لئے دو مزید امور لازمی ہیں۔ اوّل تو ایک ایسی شخصیت جس کو یہ حق

حاصل ہو کہ افرادِ معاشرہ کی تنظیم قائم رکھنے کے لئے ایسے احکام صادر کرے۔ جن پر کاربند ہونا ہر ایک فرد اور ہر ایک جماعت کا فرضِ عین ہو، اور خلاف ورزی کی حالت میں ملزم کو سزا بھی دی جا سکے۔ یہ شخصیت مفرد بھی ہو سکتی ہے اور مرکب بھی، یعنی اس کا مرکز شخص واحد بھی ہو سکتا ہے۔ اور بہت سے لوگوں کی جماعت بھی، لیکن دوسری صورت میں اس جماعت کے مجموعی احکام قابلِ نفاذ سمجھے جائیں گے۔ اس حاکم کو مقتدرِ اعلیٰ اور اس کے اختیارات کو اقتدارِ اعلیٰ کا لقب دیا جائے گا +

خود مختاری ۔ مملکت کے قیام کے لئے خود مختاری بھی ایک نہایت ضروری عنصر ہے۔ خود مختاری کی دو شقیں کی جا سکتی ہیں۔ ایک تو وہ صورتِ حال جس میں ملک ہر قسم کے بیرونی دباؤ سے آزاد ہو، یعنی نہ صرف اندرونی معاملات میں اسے آزادیٔ تامہ حاصل ہو بلکہ بین الاقوامی قوانین اور معاہدوں کے علاوہ خارجی معاملات میں وہ کسی بیرونی قوت کا پابند نہ ہو۔ عام طور پر مملکت ایسے ہی سیاسی ادارہ کو کہا جاتا ہے، لیکن آج کل کے زمانہ میں بعض طاقتور ممالک کی جوعِ ارضی کے باعث شاید ہی کوئی بیچارہ کمزور ملک ایسا رہا ہو گا۔ جس پر کوئی نہ کوئی خارجی بندش عائد نہ کر دی گئی ہو کہیں تو جملہ خارجی معاملات کسی بڑی سلطنت کے سپرد ہیں۔ جیسے ہندوستانی ریاستیں، کہیں کسی مخصوص سیاسی اصول کے تحت کمزور ملک پر مختلف قسم کی بندشیں عائد کر دی گئی ہیں، جیسے مسقط، کویت اور زنجبار پر کہیں خارجی معاملات کے دائرہ کو چھوڑ کر ملک کے مالیات پر قبضہ کر لیا گیا ہے جیسے چین میں، اور کہیں برائے نام اندرونی اور خارجی اختیارات دے کر ماتحت ملک میں فوج رکھ کر اس کی آزادی میں خلل ڈالا گیا ہے جیسے مصر میں، غرض اگر مملکت کا معیار یہی ہے کہ ملک کو اندرونی اور خارجی آزادیٔ تامہ حاصل ہو تو علاوہ پانچ سات سلطنتوں کے اور کسی کو مملکت نہیں کہا جا سکیگا۔ اس لئے بنظرِ سہولت علم سیاسیات کو مفید بنانے کی خاطر مناسب یہ ہے کہ مملکت میں اِن ممالک کو بھی شامل سمجھا جائے جن کو کم از کم اندرونی معاملات میں آزادی حاصل ہو +

مملکت کی تعریف ۔ الغرض انسانوں کی ایسی منظم جماعت کو مملکت کا لقب دیا جاتا ہے۔ جو کسی مخصوص جغرافی رقبے میں سکونت پذیر ہو، جس کے افراد کے مابین حاکم و محکوم کے تعلقات پیدا ہو گئے ہوں۔ اور جسے کم از کم اپنے اندرونی معاملات کے انصرام و انتظام پر معمولاً قدرت حاصل ہو +

حکومت ۔ اس تعریف سے یہ معلوم ہؤا کہ مملکت دراصل انسانوں کی ایک منظم جماعت کا نام ہے۔ جو سیاسی رشتہ میں منسلک ہو گئے ہوں۔ نیز یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ نہ صرف آج کل کے زمانہ میں جب کہ مملکتوں کے حدود وسیع سے وسیع تر ہو رہے ہیں، بلکہ یونان کی شہری مملکتوں میں بھی، باشندوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انتظامِ مملکت ہر جگہ

ایک نسبتاً مختصر جماعت کے سپرد کر دینا پڑا۔ اسی لئے مملکت کا ایک جزو لاینفک یہ ہے کہ باشندوں کے آپس میں حاکم و محکوم کے تعلقات پیدا ہو جائیں، اور حکومت اس مشین کا نام ہے جس کے ذریعہ سے مملکت کے کاروبار انجام کو پہنچتے ہیں یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے کہ حکومت کو بعض مرتبہ تمام مملکت پر حاوی سمجھ لیا جاتا ہے۔ مملکت اور حکومت کا وہی رشتہ ہے جو آقا اور ملازم کا ہے، جس طرح آقا اپنے ملازم کو تبدیل کر سکتا ہے اور ملازم کی علیحدگی کی وجہ سے اس کی ہئیت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں پیدا ہوتی اسی طرح حکومتیں بدلتی رہتی ہیں، مگر مملکت اس وقت تک مسلسل قائم رہتی ہے جب تک وہ منظم اور کم و بیش خود مختار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی ایسے ملک میں جہاں موروثی بادشاہ کی حکمرانی ہو، بادشاہ مرتا ہے۔ تو اس کے ولی عہد کے اعلان جانشینی سے پیشتر ہی فوراً اس کو حکمران تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ بادشاہ کوئی ہو، وزیر کوئی ہو، پارلیمنٹ نشست کر رہی ہو یا برخواست ہو گئی ہو، مملکت کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آتا اور اگر مملکت کے لازمی عناصر مثلاً تنظیم، آبادی اور آزادی قائم رہیں اور طرزِ حکومت بدل جائے، یعنی ملوکیت سے جمہوریت یا جمہوریت سے دستوری بادشاہی ہو جائے تو بھی مملکت برابر قائم رہتی ہے +

قوم۔ مملکت کو ایک اور ادارہ سے ممیز کرنا ضروری ہے۔ آج کل تقریباً ہر ایک حصہ دنیا میں سب سے زیادہ جس سیاسی اصطلاح کی آواز کانوں میں گونجتی ہے وہ لفظِ قوم ہے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ گو مشرق میں بھی ہر ایک شخص قوم، قوم پکارتا ہے اور مغرب میں بھی معاملات قومی اثر سے متاثر ہوتے ہیں، لیکن مشکل سے دو ممالک کے باشندے ایسے ہوں گے جو اس لفظ کے ایک ہی معنی سمجھتے ہوں۔ آج کل کے زمانہ میں ایک طرف اینگلوسیکسن قوم میں نہ صرف انگلستان ممالک متحدہ امریکا اور آسٹریلیا کے باشندے شامل سمجھے جاتے ہیں، بلکہ خدا جانے کیوں جنوبی افریقہ کے ولندیزی، کناڈا کے فرانسیسی، ویلز کے کلٹ اور سکاٹلینڈ کے مرکب النسل باشندے بھی اینگلوسیکسن قومیت کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ فرانسیسی قوم میں صرف وہ افراد شامل سمجھے جاتے ہیں جو جمہوریہ فرانس کے تحت اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن مشرقی بلجیم کے والون اور مغربی سوئیزرلینڈ کے فرانسیسی بولنے والے معلوم نہیں کیوں اس نعمت سے محروم ہیں۔ بعض مرتبہ تو قوم اور قومیت کی وجہ سے ملک کے ملک غیر آباد ہو گئے ہیں، مثلاً صلحنامہ لوزان کی رو سے یہ قرار پایا کہ قسطنطنیہ کے یونانی بولنے والے باشندوں کے علاوہ جمہوریہ ترکیہ کے تمام یونانیوں کو یونان کے تمام ترکوں سے تبدیل کر لیا جائے اور اس فعل سے جو صعوبتیں اور مشکلات اٹھانی پڑی ہونگی اس کا اندازہ مشکل ہے۔ بہرحال مغربی اعتبار سے قوم کے معنے کم و بیش ہم نسل مجموعۂ افراد کے ہو گئے ہیں اور عام میلان یہ معلوم ہوتا ہے کہ حتی الامکان ایسے ہم نسل افراد کو ایک ہی مملکت میں شامل ہونا چاہیے +

لیکن ایسی مثالیں کم یاب نہیں کہ ایک ہی بنیادی قوم کے مختلف مجموعوں نے مختلف ممالک میں آباد ہو کر اپنی اپنی مملکتیں قائم کرلیں، اور اِن میں ایسا تشخص پیدا ہو گیا کہ ہر ایک مملکت کے باشندے اپنی قوم علیحدہ علیحدہ تصور کرنے لگے۔ برازیل اور پُرتگال کے باشندے ہم نسل، ہم زبان، اور ہم مذہب ہیں اور دونوں کی روایات یکساں ہیں، لیکن آج یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پرتگالی اور برازیلی ہم قوم ہیں، یہی کیفیت ان اقوام کی ہے جو جنوبی امریکا کے مختلف حصوں میں آباد ہیں، اور باوجودیکہ اِن کے رسم ورواج، زبان اور مذہب ایک سے ہیں لیکن وہ محض اپنی جُداگانہ انفرادی حیثیت کی وجہ سے متحد نہیں ہوتے۔ اسی طرح ایسے بھی ممالک ہیں جہاں متعدد اقوام دوش بدوش آباد ہیں اور ہر ایک اپنی انفرادی حیثیت کو قائم رکھے ہوئے ہے جیسے بلجیم میں والون اور فلیمنگ، سوئیزرلستان میں جرمن، فرانسیسی اور اطالوی +

اب مشرق کی طرف آیئے۔ جہاں مغرب میں عموماً قوم کے معنی ہم نسل افراد کے مجموعہ کے لئے جاتے ہیں وہاں ہندوستان میں قوم سے مراد ہم مذہب اشخاص سے ہوتی ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں جو مسلمان ہیں ان کا صرف بارہواں حصہ ابتدائً غیر ممالک سے آکر یہاں آباد ہوا ہوگا، اور اس قلیل تعداد میں سے شاید نصف بھی ایسے نہ نکلیں جن کے اجداد اپنی بیویوں سمیت یہاں آئے ہوں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے ہندی مسلمان ایک قوم نہیں۔ یہی کیفیت اس ملک کے عیسائیوں سکھوں اور دیگر اقوام کی ہے۔ اصل میں اسی التباس کو رفع کرنے کی غرض سے یہاں کی سیاسیات میں عام طور پر "قومی" ادارہ اس ادارے کو کہتے ہیں جو کسی مذہب کے پیروؤں کے ساتھ مختص ہو اور "ملکی" کا لقب ان ادارات کو دیا جاتا ہے جن کا تعلق بلاتفریق مذہب تمام ملک سے ہو[۱]۔

چند سال پیشتر تک مشرقی دنیا کے تقریباً ہر ملک کے باشندوں کی تقسیم کم وبیش اسی اصول پر کی جاتی تھی، چنانچہ جب ۱۹۱۲ء میں ملک چین میں جمہوریت قائم ہوئی تو وہاں کے عَلَم پر ملک کی پانچ ممتاز اقوام کے لئے ایک ایک رنگ رکھا گیا لیکن پہلی جنگِ عظیم کے بعد مغربی ایشیا میں جو ہلچل پیدا ہوئی۔ یعنی ترکی میں جمہوریہ قائم کیا گیا، اور ایران میں خاندانِ قاچار ہمیشہ کے لئے تخت سے محروم کیا گیا، تو ساتھ ہی ساتھ اِن ممالک میں بھی کم وبیش مغربی طرز کی قوم کا تخیل پیدا ہو گیا، جس کا ایک نہایت دلچسپ مظاہرہ یہ ہے کہ ہندوستان کے پارسی یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اِن کے "ہم قوموں" یعنی ایرانیوں اور خود اِن کے درمیان ربط واتحاد بڑھ جائے۔ اسی طرح فلسطین کے باشندوں کی جو فریق بندی ہے۔ اس میں عام عربی بولنے والے فلسطینی خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان ایک طرف نظر آتے ہیں، اور عبرانی بولنے والے یہودی

---

[۱] ہندوستانی اقوام کی ترکیب وساخت کا مفصل بیان میرے والد ماجد حاجی محمد موسےٰ خانصاحب نے اپنے رسالہ "ہندی قوم" (مطبوعہ مطبع ملیہ علیگڈھ) میں کیا ہے اس کا مطالعہ خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ خاص طور پر ملاحظہ کیجئے اس رسالے کا عنوان موسومہ "ہندی قوم کا باغیچہ" صفحہ ۳۰

دوسری طرف +

ریاست۔ مملکت کو ایک اور ادارہ یعنی ریاست سے بھی ممیز کرنا چاہئے ویسے تو ریاست کے لغوی معنے ایک ایسے مجموعۂ افراد کے ہیں جن کا کوئی سرگروہ یا رئیس ہو لیکن سیاسیات کی اصطلاح میں اس لفظ کا انطباق عام طور پر آزاد مملکتوں پر نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا اس سے پیشتر بیان کیا جاچکا ہے دنیا میں بہت سے ممالک ایسے ہیں جن پر کسی نہ کسی طاقتور سلطنت کا اثر ہے، اور اِن پر یہ سلطنت براہِ راست حکومت نہیں کرتی۔ بلکہ اپنی سہولت کی غرض سے اس نے اکثر اندرونی انتظامات کو وہیں کے مقامی حکمرانوں پر چھوڑ رکھا ہے۔ علاوہ ازیں دنیا میں ایسے بھی ممالک ہیں جن پر خواہ جغرافی وسعت کے سبب سے، خواہ تاریخی تنوع کے لحاظ سے براہِ راست حکومت نہیں کی جاتی بلکہ چند اختیارات جو ملک کو متحد اور طاقتور رکھنے کے لئے ضروری ہوں مرکزی حکومت کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں، اور ایسے اختیارات جن کا تعلق انفرادی بود و ماند سے ہو، مقامی ادارت کے قبضہ میں رہنے دیئے جاتے ہیں؛ ساتھ ہی یہ قاعدہ بنا دیا جاتا ہے کہ مرکزی حکومت کو ان اختیارات میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان دونوں قسم کے ادارات کو، یعنی جہاں کسی بیرونی ذی اقتدار سلطنت نے اندرونی انتظامات کسی مقامی حاکم کے قبضہ میں رہنے دیئے ہوں، یا ملک کے مختلف حصوں کے اختلافِ روایات کے باعث انہیں بعض شعبہ جاتِ حکومت میں مختارِ کلی بنا دیا گیا ہو، سیاسی اصطلاح میں "ریاست" کہتے ہیں۔ اول الذکر قسم کی ریاستوں کی بہترین مثال ہندوستانی ریاستیں ہیں اور دوسری قسم کی ریاستوں کی بہترین مثال ممالکِ متحدہ امریکا، جرمنی اور روس کی منفرد ریاستیں ہیں جہاں اکثر اندرونی اختیارات ریاستی حکومتوں کو حاصل ہیں اور مرکزی حکومت صرف ایسے اختیارات پر قناعت کرتی ہے جو ملک کی عظمت و اقتدار کے اجزائے لاینفک ہوں۔ بہر حال اگر ہم مملکت میں ایسے انسانی مجموعوں کا شمار کریں جن کو اندرونی اختیاراتِ تامہ حاصل ہوں پھر بھی ریاستوں سے ان کی تفریق کر دینا مناسب ہوگا۔ آزاد ممالک کے مختلف اجزا کو تو کسی حالت وصورت میں ممالک کا لقب نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ عام طور پر بہت سے داخلی معاملات پر بھی مرکزی حکومت حاوی ہوتی ہے، جیسے سکہ سازی، شاہراہوں اور قومی ریلوں کا انتظام، بعض محاصل عائد کرنے کا اختیار وغیرہ، اب رہا ماتحت علاقوں کا سوال، یہاں غور طلب یہ امر ہے کہ آیا ذی اقتدار سلطنتِ غیر نے محض اپنی سہولت کی خاطر ان رقبوں کے قبضے میں اندرونی اختیارات چھوڑ دیئے ہیں، یا ملک کی رفتار آزادی کی جانب ہے اور اِن اختیارات سے اس غیر سلطنت کو مجبوراً دست بردار ہونا پڑا ہے۔ ہندوستان کی اکثر و بیشتر ریاستوں کو مملکت کا لقب نہیں دیا جاسکتا، اس لئے کہ جس طرح خارجی معاملات میں اِن پر قیود عائد ہیں اسی طرح اندرونی معاملات میں بھی اگر صاحبِ اقتدار سلطنت چاہے تو ان پر دباؤ ڈال سکتی ہے، بلکہ

چھوٹی موٹی ریاستوں میں تو شاید رئیس کو تخت سے بھی اُتار سکتی ہے۔ گویا جہاں تک ایسی ریاستوں کا تعلق ہے ذی اقتدار سلطنت اندرونی اور بیرونی دونوں قسم کے اختیارات پر پورے طور سے حاوی ہے۔ "مملکت" کا لقب زیادہ سے زیادہ اُن ممالک کو دیا جا سکتا ہے جہاں کی اندرونی حکومت پر کسی غیر مُلک کا حقیقتاً کوئی اثر نہ ہو۔ ممکن ہے کہ سلطنتِ برطانیہ کو جنوبی افریقہ یا کناڈا کے اندرونی معاملات پر ہر قسم کا قانونی اختیار حاصل ہو[۱]، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کے لئے ان اختیارات کو کام میں لانا خارج از امکان اور خارج از بحث ہے، اور بعض معاملات پر سلطنتِ برطانیہ کا جو اختیار باقی رہا ہے اس کا سبب سلطنتِ برطانیہ کی سہولت نہیں بلکہ خود جنوبی افریقہ یا کناڈا کی سہولت ہے، اس لئے کہ وہ بالفعل اس کے لئے تیار نہیں کہ ایسے ایسے معاملات سے بھی جیسے بحری مدافعت، خارجی امور وغیرہ ہیں، بالکلیہ انگلستان کی پشت پناہی کو مسترد کر دے۔ ایسے ترقی یافتہ سیاسی مجموعہ کو مملکت کا لقب دینا یقیناً غلط بیانی نہ ہوگی۔

ہارون خان شروانی

اصطلاحاتِ جدیدہ

ابوی	Patriarchal	شہنشاہی	Imperial
اقتدار اعلےٰ	Sovereignty	مفکّر	Thinker
اموی	Matriarchal	مقتدر اعلےٰ	Sovereign
جمہوریہ	Republic	ملوکیت	Monarchy
حکومت	Government	نظریۂ جبر	Theory of force
دستوری	Constitutional	ولندیزی	Dutch
سوئیٹزرستان	Switzer land		

---

[۱] ہمارے نزدیک ۱۹۲۶ء کی برطانوی شہنشاہی کانفرنس کی آخری قراردادوں کے بموجب برطانیہ کو کسی قسم کے قانونی دباؤ کا حق باقی نہیں رہا۔

حیاتیات

خاکِ ناچیز ہو گردشت میں چکر نہ لگاؤ
بحرِ مردار ہو گر تم کوئی طوفاں نہ اُٹھاؤ
نوجوانو! تمہیں ہم مردہ یقیں کر لیں گے
اپنی ہستی سے نہ دنیا میں اگر دھوم مچاؤ

ترقی کی اُمنگوں سے پرِ پرواز پیدا کر
وگرنہ چھو نہیں سکتا تو ہرگز بامِ شہرت کو
مرے شہپر کے سایہ میں ہے سارا عالمِ امکاں
اگر دیکھوں ذرا پھیلا کے میں بازوئے ہمت کو

طوفانِ حوادث سے لڑ سینہ سپر ہو کر
آتی ہیں یہ آوازیں پیہم لبِ دریا سے

چٹکنا بھی تجھے مشکل ہے غنچہ کی طرح غافل!!
گلستاں کی فضا لبریز ہے شورِ عنادل سے

ہر ایک سطرِ نفس میں غافل ہزاروں اسرار جلوہ گر ہیں
ورق ورق کھول کر نہ دیکھی یہ زندگی کی کتاب تو نے

ایک دانہ بھی مرے خرمن کا جل سکتا نہ تھا
صاعقے بربادیوں کے تلملا کر رہ گئے
رزمگاہِ زندگی کرتی تھی مردوں کو تلاش
ہمتیں کچّی تھیں جن کی ہچکچا کر رہ گئے
عقلِ انسانی نہ سمجھی آج تک رمزِ حیات
عالمِ فطرت کے جلوے مسکرا کر رہ گئے

وحیدالدّین سلیم

تاریخ دُنیا پر ایک نظر

حصّۂ دوم ۔ مشرق کے قدیمی تمدّن

(۹)

مصر

ملک مصر اور اُس کے اصلی باشندے ۔ چھٹی صدی ق م میں جب یہودا کے بادشاہوں نے عظیم الشان بابلی شاہنشاہ کے خلاف مصر کے ساتھ رابطہ پیدا کیا تو اس ملک کی طاقت اس سے پہلے ہی کمزور ہو چکی تھی ۔ لیکن اس کمزوری کی جگہ کبھی وہ قوت وتمدن جلوہ گر تھا جس کی غیر معمولی شان وشوکت دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی ۔ مصر کا تمدن قدیم ترین تمدنوں میں سے تھا ۔ بعض فاضل مورخین کا تو خیال ہے کہ مصر تمدن کا پہلا گھر تھا اور نیل کی وادی ہی میں انسان نے پہلے پہل متمدن زندگی کے فنون سیکھے ۔ لیکن حال کے اکتشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی افریقہ میں نہیں، بلکہ جنوب مغربی ایشیا میں، بابل میں اور اس سے بھی پہلے ایلم کی قدیمی سرزمین میں اوّل اوّل تمدن کی بنیاد پڑی ۔

تاہم مصری تمدن کی انتہائی قدامت اور رفعت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ۔ مصر کی زمین کا محلِ وقوع ابتدائی زراعت کی آباد کاری اور ایک پُرامن حکومت کے نشوونما کے لئے نہایت موزوں تھا ۔ یہ ایک غیر معمولی سرسبزی کا خطہ تھا جس کا سب سے بڑا سبب نیل کی طغیانیاں اور کوہستانِ ابی سینیا کی نئی زمین کی زرخیز مٹی تھی جو یہ عظمت آب دریا اپنے ہمراہ لاتا اور چاروں طرف کھیتوں میں بکھیر دیتا ۔ اس کی آب وہوا پیداوار کے لئے مفید اور نوع انسان کے لئے آرام دِہ تھی ۔ اور یہ بات بھی کچھ کم نہ تھی کہ قدرت نے مصر کو جنگی اور آوارہ گرد بدویوں کے حملوں سے بچائے رکھنے کی صورت پیدا کر دی تھی ۔ اس کے تین طرف لق ودق صحرا اور چوتھی طرف سمندر تھا صحرائے اعظم کے وسیع دشت لیبیوں سے اُسے محفوظ رکھتے تھے نوبیا کے صحرا حبشیوں کو یہاں تک پہنچنے سے روکے ہوئے تھے اور سینا کا اجاڑ جزیرہ نما عرب اور اُسکے درمیان حائل تھا لیکن اگرچہ مصر محفوظ تھا وہ دنیا سے علیحدہ نہ تھا ۔ یہ ایک بڑی نتیجہ خیز بات تھی کیونکہ اگر علیحدگی ہوتی تو رکاوٹ بھی ساتھ ہی پیدا ہو جاتا ۔ اگرچہ حملہ آور فوجوں کی وہاں تک رسائی نہ تھی لیکن گلہ بانوں اور تاجروں کے چھوٹے چھوٹے قافلے ایک نخلستان

سے دوسرے نخلستان تک آسکتے تھے اور آئے۔ بیرونی دنیا سے اِن تعلقات کے قیام و تسلسل نے مصری ذکاوت کو تیز تر کردیا +

مصری آب وہوا کی قلتِ باراں اور نیل کی پہنچ سے دُور اُس کی مٹی کے ریتیلے پن کے باعث مصر کے آثارِ قدیمہ کا ایک مکمل اور مختلف النوع سلسلہ نہایت عمدگی کے ساتھ آج تک محفوظ رہا ہے۔ اِن سے ظاہر ہے کہ مدتیں ہوئیں حجریہ زمانوں میں اس خطہ کا اُن خانہ بدوش شکاریوں اور صحرانورد گلہ بانوں کو علم تھا جن کے ہم نسل بعد میں قرب وجوار کے صحراؤں اور سبزہ زاروں میں گھومتے رہے۔ اِن اصلی باشندوں کو (جو غالباً حبشی النسل تھے) ۵۰۰۰ ق م کے قریب حامی نووارد ملک سے نکال کر یہاں بس گئے جو عرب سے چل کر بحرِ احمر کے پار آئے اور نیل کی وادی کے بالائی حصے میں جہاں بعد میں کوپٹس، ابی دوس، تھیبز، اور کارنک کے شہر واقع تھے آباد ہو گئے +

اس دوران میں نیل کے دہانے کے قریب اس مثلث نما قطعے میں جو دریا کے بھراؤ سے بن گیا تھا مغرب سے لیبیا کی قومیں اور مشرق سے سامی گلہ بان آباد ہو رہے تھے +

قیامِ سلطنت۔ مصر کا حقیقی تمدن نیل کی بالائی وادی کے گہوارے میں پھولا پھلا۔ یہ تمدن ۵۰۰۰ سے لے کر ۳۵۰۰ ق م تک وضع ہوا۔ یہاں اس تنگ زرخیز خطے میں جس کے دونوں طرف لق ودق صحرا تھے جفاکش لوگوں کی دیہاتی جماعتوں نے دریا کے اتار چڑھاؤ کی روش دیکھی زرخیز کرنے والی طغیانیوں پر قابو پانے اور اُن سے فائدہ اُٹھانے کا فن دریافت کیا اور اِسی دوران میں معاً ایک تقویم نکالی، ایک فنِ تحریر ایجاد کیا اور ایک منتظم حکومت کی بنیاد ڈالی +

غالباً شروع میں بہت سی صدیوں تک اِن کثیر تعداد نوآبادیوں میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی۔ لیکن جوں جوں بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریاتِ زندگی زیادہ ہوئیں۔ اس قسم کی حکومت کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ دریا پر سب کی زیست کا انحصار تھا۔ اس لئے قحط سالی کے زمانے میں لازم قرار پایا کہ کوئی مشترک حاکم آبپاشی کے طریقوں اور غلہ کے ذخیروں کا مناسب انتظام کرے۔ غرض اس طرح بتدریج یہ جدا گانہ خودمختار آبادیاں مصر بالائی کی ایک سلطنت میں مربوط ہو گئیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ چونکہ دریا جس کا منبع کسی کو معلوم نہ تھا اور جس کے چڑھاؤ اتار کا بھید کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آیا کسی خدا کا ہدیہ سمجھا جاتا تھا۔ لہذا بادشاہ یا فرعون کی بابت رفتہ رفتہ خیال پیدا ہو گیا کہ وہ خدا کا اعلےٰ ترین نمایندہ بلکہ خود ہی مجسم خدا ہے۔ اس طور پر مذہبی حرمت نے اس کے عہدے کو اتنی فوقیت دے دی کہ کوئی فردِ بشر اُس کے حکم کے آگے چون وچرا نہ کرسکتا تھا +

مرورِ زمانہ کے ساتھ غالباً ۳۵۰۰ ق م کے جلد ہی بعد مصر بالائی کے بادشاہ نے مصرِ اسفل پر اپنا اقتدار جمالیا

اس تاریخ سے مصر کے "خاندانِ شاہی کی تاریخ" شروع ہوتی ہے۔ وہ فنِ تحریر جس کی ایجاد زیادہ تر شاہی احکام کو اِس نادر الشکل سلطنت کے کونے کونے تک پہنچانے کے واسطے ہوئی تھی اُسی کے نتیجے ہیں۔ چٹانوں اور تختیوں کے وہ کتبے جن سے آئندہ تین ہزار سال کے چھبیس خاندانوں کے حالات ہم تک پہنچے ہیں۔ تین خاندان توابی وادیس ہیں کچھ نامعلوم سے رہے۔ چوتھے خاندان نے اپنا دار السلطنت دہانۂ نیل کی مثلث کے سرے پر بمقام ممفس بنایا اور اس شہر کے قریب جوار میں بطور مقبروں کے وہ اہرام (اندازاً ۲۹۰۰ ——— ۳۰۰۰ ق م میں) تعمیر کئے جو ابھی تک دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتے ہیں +

لیکن مصری تاریخ کے پُرامن دوران میں ۲۰۰۰ ق م کے قریب ایک بڑا ہولناک حادثہ ہؤا۔ حملہ آوروں کے ایک گروہ نے جو مشرق سے سینا کے رستے سے آئے تھے سلطنت پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیا۔ وہ ہیکسوس یا صحرا کے شاہی شہزادے کہلاتے ہیں۔ چار صدیوں (۱۵۸۰ ق م) تک مصر برابر اُن کی ذلیل غلامی میں رہا +

عرُوجِ سلطنت اور زوال ۔ اجنبی ہیکسوسوں کے مظالم کا خاتمہ یوں ہؤا کہ مصریوں نے خود بخود مصر بالائی میں بغاوت کا جھنڈا بلند کردیا۔ اس وقت تک وادیٔ نیل کے باشندے جنگجو نہ تھے۔ امن و محافظت اور معتدل آب وہوا نے اُن کے طبائع کو نرم بنا رکھا تھا۔ ہیکسوس جو جنگی رتھوں اور گھوڑوں کو لئے ہوئے مصر پر چڑھ آئے با آسانی فتح یاب ہوئے۔ لیکن طویل غلامی کی مصائب نے امن پسند مصریوں کے مزاج میں ایک بڑا تغیر برپا کردیا۔ چنانچہ ہیکسوسوں کو ملک سے باہر نکال کر انہوں نے جارحانہ جنگ و جدل کا سلسلہ شروع کردیا اور ایک مصری قلمرو کی بنیاد ڈالی جس کی حدود اپنے عروج کے وقت مشرق میں فرات اور شمال میں ایشیائے کوچک کی سرحد تک پہنچتی تھیں۔ جنوب کی طرف نوبیہ کو نیل کے تیسرے آبشار تک ملحق کرلیا گیا۔ سب سے زیادہ شان و شوکت کا زمانہ اٹھارہویں شاہی خاندان کے وقت میں تھوتمس سوم (تقریباً ۱۵۰۱ تا ۱۴۴۷ ق م) کے عہد سے امین ہٹپ دوم (تقریباً ۱۴۱۲ تا ۱۳۷۶ ق م) کے عہد تک کا تھا +

امین ہٹپ سوم کی موت پر وہ بادشاہ تخت آرا ہؤا جو بلاشبہ زمانۂ قدیم کی عظیم ترین ہستیوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اس کا نام شروع میں امین ہٹیپ چہارم تھا لیکن قدیمی مذہب کو جس کا اعلےٰ ترین سردار وہ خود مانا جاتا تھا ترک کرنے کے ساتھ اس نے اپنا نام بدل کر آکن آٹن کرلیا۔ اُس نے مصر میں ایک خالص روحانی وحدانیت کو رائج کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ صرف ایک خدائے قدیر کی پرستش کرنی چاہئے جو سب انسانوں کا باپ اور سچا خدا ہے۔ اس مجوزہ مذہبی اصلاح کے خیال نے مصر میں ایک طوفان برپا کردیا اور مرکزی حکومت کی طاقت اس قدر کمزور ہوگئی کہ اس کی وسیع سلطنت کو سخت صدمہ پہنچا۔ آکن آٹن کی موت پر ۱۳۶۲ ق م میں پرانا مذہب پھر قایم ہوگیا اور توتنخ آمین

(۱۳۶۰ تا ۱۳۵۰ ق م) کے تحت میں جس نے پروہتوں کی فرمانبرداری کا اظہار کرنے کے لئے اپنا نام توتنخ امین کر لیا، وہ مذہب پھر اُسی قدیمی شکل میں رائج ہوگیا +

اُنیسویں شاہی خاندان کے عہد میں جو ۱۳۲۱ ق م میں قائم ہؤا مصری قلمرو پھر اُبھری اور رعمسیس دوم (تقریباً ۱۳۰۰ تا ۱۲۳۴ ق م) کے وقت میں وہ اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ایشیائے کوچک کے ہتیوں کے ساتھ ایک شدید و مضمحل کن جنگ کے بعد مصریوں نے فلسطین شام اور فینیقیا پر پھر اپنا قبضہ جما لیا۔ لیکن یہ قبضہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ انیسویں شاہی خاندان کے خاتمے پر (تقریباً ۱۲۰۵ ق م میں) آخر کار زوال کا زمانہ تیز رفتاری کے ساتھ شروع ہوگیا۔ خاص مصر میں شاہی طاقت کی جگہ پروہتوں کی نقاہت اثر حکومت نے لے لی۔ بیرونی دنیا میں نئی نئی طاقتیں اُبھریں جنہوں نے جلد مصر کے مقبوضات کو فتح کیا۔ اور بالآخر خود مصر کو مغلوب کر لیا۔ مصر کو یکے بعد دیگرے (۶۷۰ ق م میں) اشوریوں (۵۲۵ ق م میں) ایرانیوں (۳۳۲ ق م میں) اسکندر اعظم کے مقدونیوں اور (۵۱ ق م میں) رومیوں نے فتح کیا +

مصری تمدن - اِن فتوحات سے بہت عرصہ پیشتر مصری تمدن کے دِن بیت چکے تھے۔ مصر بےحس و حرکت اور منجمد ہوکر اور پروہتوں کے قدموں میں نڈھال پڑا تھا۔ بلکہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۲۵۰۰ ق م کے قریب ہی مصر کی بہترین آزادی اختراع کاری اور توانائی کا زمانہ ختم ہوچکا تھا۔ چوتھے اور پانچویں شاہی خاندان کے عہد میں اہرامِ عظیمہ کی تعمیر ہی سے ظاہر ہے کہ وہ ایک شاہی مطلق العنانی کا زمانہ تھا جب غلامی عام تھی اور موت اور آئندہ زندگی کا بہت چرچا رہتا تھا۔ اور یہ باتیں تنزل کی صریح نشانیاں ہیں۔ اُس وقت بھی مصریوں کی ذکاوت محض مقبروں اور مندروں پر صرف ہو رہی تھی جو بجائے خود عظیم الشان یادگاریں تھیں لیکن جن سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے دِل ضعیف الاعتقاد اور خیالات غلامانہ ہوچکے تھے۔

لیکن اپنے زوال سے پہلے مصر نے وہ بنیاد اُستوار کر دی تھی جس پر بعدہٗ موجودہ تہذیب نے اپنی عمارت بنائی۔ اپنے تمدن کی بیس تخلیقی صدیوں میں (اندازاً ۴۵۰۰ سے ۲۵۰۰ ق م تک) مصر نے وہ دریافتیں اور وہ ایجادیں کیں جو نوعِ انسانی کی معاشرتی میراث کا جزوِ لاینفک بن چکی ہیں۔ اُس نے زراعت کے فن اور آبپاشی کے طریقوں کو اعلےٰ معیار پر پہنچایا۔ اُس نے ایک تقویم بنائی جو سورج کی ظاہرہ حرکتوں پر مبنی تھی اور جس میں تھوڑا اسا رد و بدل کر کے موجودہ دنیا کی تقویم تیار کی گئی ہے۔ اُس نے اجرامِ فلکی کے درست مشاہدات قلمبند کئے جس سے بعد کے یونانی علمِ ہیئت کے لئے رستہ کھل گیا۔ اُس نے یا تو پہلے پہل دھاتوں کو دریافت کیا یا اُنہیں پہلے پہل استعمال کیا اور دھاتوں کے اوزاروں سے بڑھئی اور معمار کے کام کو بے انتہا ترقی دی۔ اپنی فلک بوس تعمیرات کے دور میں جب اُس نے اہرام، معابد، محلات اور مقابر بنائے اُس نے مساحت کا فن نکالا اور اپنے حیرت انگیز فہم و ذکاوت سے اُس نے ایسے ایسے نفیس نقشے

تیار کئے جن پر حال کے ماہرانِ تعمیرات عش عش کرتے ہیں۔ اُس نے بحری جہاز بنائے اور بیرونی دنیا سے تجارت کا ایک سلسلہ قائم کیا جس کے اجرا و استحکام کی غرض سے اُس نے ایک قسم کا سکہ رائج کیا اور مبادلہ کا طریقہ نکالا۔ اُس نے کاتنے اور بننے، ٹوکری اور برتن بنانے مینا کاری اور زیورات تیار کرنے کے فن و حرفت ایجاد کیے۔ نقاشی اور تعمیر، کتابت اور آرایش قانون اور حکمت، حکومت اور مذہب غرض متمدن زندگی کے ہر شعبے میں مصر نے ایسی ایسی ترقیاں کیں جو اُس سے پہلے کسی قوم سے یا کسی زمانے میں نہ ہوئی تھیں +

---

(۱۰)

ایشیائے کوچک اور بحیرۂ ایجین

اناطولیا کی سطحِ مرتفع - مصری قلمرو کی شمالی حدود اپنے کمال کے زمانے میں بھی طارس (کرامان) کے پہاڑوں سے جو شام اور ایشیائے کوچک کے درمیان حائل ہیں متجاوز نہ ہوئی تھیں۔ بلکہ اشوریوں کی زبردست جنگجو حکومت بھی جو مصر کے بعد مشرقِ قریب کے مقبوضات پر متمکن ہوئی اس کوہستان کے پرے اپنا اقتدار قائم نہ کر سکی +

کوہستانِ طارس کے مغرب کی طرف اناطولیا کی ناہموار وغیر آباد بلند سرزمین واقع ہے۔ یہ چونے کے پتھر کی ایک بڑی مرتفع سطح ہے جو کبھی ایک مدت سے خشک شدہ جھیل کی تہ آب تھی۔ اُس کی اوسط بلندی سمندر سے ۳۰۰۰ فٹ ہے اور اس میں کہیں کہیں اونچی اونچی آتش فشاں چٹانیں اپنا سر نکالے ہوئے ہیں سطحِ مرتفع کے گرد پہاڑوں کا ایک چکر ہے جو کبھی جھیل کے کنارے تھے اور جو اب گنجان جنگلوں سے ڈھکے ہیں۔ ان کے پرے زمین یک لخت سمندر کی طرف ڈھلوان ہو گئی ہے لیکن ان جنگلی کوہستانوں اور سمندر کے درمیان بالخصوص جنوبی جانب ایک محفوظ اور زرخیز ساحلی خطہ چلا گیا ہے جسے بحرِ متوسط کی نیلی لہریں تر و تازہ اور شاداب رکھتی ہیں اور جس کی آب و ہوا دنیا بھر میں اپنا نظیر نہیں رکھتی +

اس سطحِ مرتفع پر ہمیشہ سے ایک دلاور پہاڑی آرمینی یا آلپینی نسل کے لوگ آباد رہے ہیں۔ بے شمار سیاسی حکومتوں کے تغیرات کے باوجود ان کی سیرت اور طرزِ زندگی استوار رہی ہے۔ ان کا خاص پیشہ ہمیشہ گلہ بانی رہا ہے۔ سر ولیم ریمزے کی رائے میں انہیں لوگوں نے سب سے پہلے بھیڑ بکری اور سؤر کو پالتو بنایا اور انہیں اپنے کام میں استعمال کیا لیکن ان ابتدائی گلہ بانوں کے ہاں بالخصوص اُن قحط سالی کے دنوں میں جب ان کے گلے پیاس سے ہلکان ہو جاتے تھے

ساتھ ہی ساتھ سرسبز ساحلی آبادیوں پر جہاں زیادہ نرم مزاج اور صلح پسند قومیں آباد تھیں، چھاپے مارنا بھی معمولِ زندگی تھا۔
یہ واقعہ ہے کہ کئی صدیوں تک نہ صرف ایشیائے کوچک کے ساحلی خطّے بلکہ شام اور دو آبہ کے میدان یعنی اشوریا اور بابل کی سلطنتیں بھی بارہا ان اناطولیوں کی یورشوں سے تہ و بالا ہوئیں۔

یہ تباہ کن یورشیں، جب لوہا استعمال میں آنے لگا تو اور بھی ہیبت ناک ہو گئیں۔ کیونکہ اناطولیا کے شمالی پہاڑ جو دریائے ہیلس (قزل ارماق) کے مشرق کو واقع تھے اس زمانے میں کچے لوہے کا سب سے بڑا ذخیرہ تھے۔ یہاں اُن کے لوہے کے ہتھیار بنتے تھے اور یہاں سے مُسلّح ہو کر ان کوہستانی قوموں نے اپنے ہمسایوں پر دور دور تک اپنا اقتدار جما لیا۔

ہتّی سلطنت۔ اِن اناطولی لٹیروں کو اس زمانے میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ لیکن وہ نام جو سب سے زیادہ مشہور ہوا ہتّی تھا۔ سب سے پہلا مشہور ہتّی حملہ جس کا ذکر تاریخ میں آیا ہے ۱۹۲۵ ق م کے قریب ہوا جب ان لوگوں نے بابل کو فتح کیا وہاں کے بادشاہ کو مار ڈالا اور لوٹ مار کا سارا مال طارس (کوہ کرامان) کی حد کے پار لے گئے۔

ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ اِن ہتّیوں کے ہر وقت کے خوف و ہراس نے کس طرح اشوریوں کو ایک فوجی قوم بنا دیا جو ہر وقت جنگ و جدل میں منہمک رہتی تھی۔ لیکن ہتّی طاقت کا کمال چودھویں صدی ق م میں جا کر ہوا۔ جب مصر میں آکن آٹن (۱۳۷۰ تا ۱۳۶۲ ق م) کے مذہبی انقلاب کی خرابیوں نے فلسطین، فینیقیا اور شام پر مصری حکومت کا زور ہلکا کر دیا۔ اس وقت یہ ہتّی اپنے اُس بادشاہ کے تحت میں جس نے شُبّی لُلی اُوما کا عجیب و غریب نام فخریہ اختیار کیا (۱۳۸۵ تا ۱۳۴۵ ق م) اپنے سب سے بڑے شہر ختی سے جو موجودہ شہر بوغاز کی کے مقام پر واقع تھا نکلے اور انہوں نے ارمنی پہاڑوں سے لے کر سینا کے صحرا تک کا سارا وسیع خطہ فتح کر لیا۔

لیکن ہتّی تسلّط چند روزہ تھا۔ رعمسیس کے عہد میں (۱۳۰۰ تا ۱۲۳۴ ق م) مصری قوت کی بحالی نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ زمانۂ قدیم کی ایک سب سے بڑی خوفناک جنگ وہ تھی جو اورنٹیس پر بمقام قادیش رعمسیس (جو خود شریکِ جنگ تھا) اور ہتّیوں کے بادشاہ مُرسل کے درمیان تقریباً ۱۲۹۵ ق م میں ہوئی اور جس کا نتیجہ ہتّیوں کی تباہی اور مصر کا اپنے چھنے ہوئے علاقوں پر پھر قبضہ حاصل کر لینا ہوا۔

اس مشہور واقعہ کے بعد ہتّی اور مصری حکمتِ عملی میں ایک عجیب تغیّر واقع ہوا۔ دونوں طاقتوں نے آپس میں (۱۲۷۹ ق م میں) ایک اتحاد قائم کیا اور بعد میں اس کو مضبوط کرنے کی غرض سے باہمی شادیاں اور دونوں قوموں کے خداؤں کی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس عجیب تغیّر کا سبب یہ تھا کہ دونوں قوموں نے اشوریوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا جائزہ لے لیا

تھا۔ اور اس ہیبت ناک خطرے کو بھی تاڑ لیا تھا جو شمال اور مغرب کی اطراف سے بڑھتا ہؤا معلوم ہوتا تھا۔ یعنی ہندی یورپی نسلوں میں ایک ہیجان برپا تھا۔ دریائے ڈینیوب کے پار سے بحرِ اسود کے اُس کنارے سے ماوراء قفقاز کے میدانوں سے اور بحرِ خزر کے ساحلوں کے چاروں طرف خوفناک شکاریوں اور گلہ بانوں کی نئی قوموں کی موجودگی کا دنیا کو احساس ہو رہا تھا۔ اناطولیا پر وہ ہیلس (قول ارماق) اور سنگیریس (سکاریہ) کی وادیوں کی طرف سے خوب حملے کر سکتے تھے۔ لیکن ایجیئن میں ٹرائے کے علاقے میں تھیالیہ کے میدان میں مائی سینی کے قرب وجوار میں اور جزیرہ کریت کی سلطنت میں اُن کے حملوں کا پورا زور نظر آ رہا تھا۔ مصریوں اور ہتیوں کے باہمی عہد نامے سے بہت پہلے منوئی تمدّن کو اِن نئے حملہ آوروں نے سخت صدمہ پہنچایا +

کریتی بحری طاقت۔ اُن اکتشافات سے جو شلائی مان نے ۱۸۷۰ء میں پہلے قدیمی ٹرائے اور پھر مائی سینی کے موقعوں پر جاری رکھے اور پھر سر آرتھر ایونز نے جزیرہ کریت میں بمقام نوسوس اسی سلسلے میں کئے یہ بات جس کا کسی کو سان گمان بھی نہ تھا دریافت ہوئی کہ تقریباً ۳۰۰۰ سے ۱۲۰۰ ق م تک بحیرۂ ایجیئن اور اُس کے گرد و نواح میں ایک اعلیٰ درجہ کا تازہ و نادر تمدن قائم رہا۔ ہومری محاصرۂ ٹرائے جو روایتہً ۱۱۹۴ سے ۱۱۸۴ ق م تک جاری رہا یونانی تاریخ کے دلچسپ ناٹک کا صرف پہلا منظر ہی نہ تھا بلکہ وہ اُس شائستگی کے غمگین ناٹک کے آخری منظروں میں کا ایک تھا جو بعض صورتوں میں خاص یونانی تمدن سے بڑھ چڑھ کر تھا +

ایجیئن کا خطہ انسان کی رہائش کے لئے خاص طور پر موزوں تھا۔ وہاں سمندر جزیروں سے ہر طرف اس طرح گھرا ہؤا ہے کہ وہ تقریباً ایک جھیل سی بن گیا ہے اور اُس میں چھوٹے جہازوں اور کشتیوں کے لئے بھی جہاز رانی کرنا ایک آسان کام ہے۔ یہاں کی آب و ہوا خوش گوار ہے۔ سورج عموماً چمکتا رہتا ہے لیکن بہار کے دنوں میں اتنی کافی بارش ہو جاتی ہے کہ گیہوں اور باجرہ، انگور اور زیتون کی کاشت کچھ دشوار نہیں ہوتی۔ اندرونِ ملک اور ساحل کے پہاڑی علاقے میں ہری بھری گھاس اس کثرت سے ہوتی ہے کہ اس سے گلّوں کے لئے چارہ خود بخود فراہم ہوتا رہتا ہے +

اس خطے میں اور بالخصوص جزیرۂ کریت میں بتدریج ایک ایسی طرزِ زندگی کا نشو و نما ہؤا جس پر گو بعد میں مصر اور بابل دونوں کا معتد بہ اثر پڑا لیکن اُس میں اپنی ہی ایک شان و نزاکت تھی۔ یہ لوگ جن میں یہ ایجیئن شائستگی نمایاں ہوئی پست قد، گندم گوں "متوسط نسل" کے تھے اور اس لئے وہ آپ ہی ہتیوں، سامی فینیقیوں اور دہانۂ نیل کے حامی باشندوں یعنی اپنے تمام ہمسایوں سے مختلف النسل تھے۔ اُن کی قلمرو جو کچھ بھی تھی ایک بحری قلمرو تھی اور اپنے عروج کے دنوں میں تقریباً ۱۶۰۰ - ۱۵۰۰ ق م) کریت کے فرمانروا بعض اوقات بحری بادشاہ کہلاتے تھے۔ لیکن اُن کا واسطہ بجائے

تدبر و جنگ کے زیادہ تر حرفت و تجارت سے تھا۔ اُن کے شہر شروع شروع میں بے فصیل تھے اُن کے جہاز تجارتی جہاز تھے اور اُن کی زندگی امن کی زندگی تھی +

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگرچہ علاقہ ایجیئن کی سرحد پر کبھی کسی پرائم[1] نے شمالی حملہ آوروں کے خلاف اپنے شہر کی قلعہ بندی کی ہو اور کبھی کسی ہیکٹر[2] نے سدا کامران ایکلیز[3] کا مقابلہ کرنے کی جرأت کی ہو لیکن بہ ہیئتِ مجموعی ایجیئن بہت غیر محفوظ اور ممکن الفتح تھا۔ بالخصوص کریٹ کا جزیرہ جو منوئی تمدن کا منبع و ماویٰ تھا، حملہ آوروں کا جلد شکار ہو گیا۔ نوسوس میں اس کے بادشاہوں کا عظیم الشان محل جو قدیم شاہی محلات میں سب سے حیرت انگیز تھا ۱۴۰۰ ق م کے قریب مسمار کر دیا گیا۔ اس زمانے کے دو سو سال کے اندر اندر بحیرۂ ایجیئن کے جزیروں کے تمام ساحلی مقامات پر نئے وحشیوں کا قبضہ ہو گیا اور کریٹی شایستگی روپوش ہو گئی۔ لیکن یہ نئے وحشی یونانیوں کے آبا و اجداد اکائی اور دوریائی تھے اور اگرچہ انہوں نے اس تمدن پر پردہ ڈال دیا لیکن انہوں نے اُسے تباہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ اور اُن کے بعد آیونی اُس کے شیدائی ہو گئے اور اُسے آراستہ پیراستہ کر کے انہوں نے اُسے دُنیائے حال کے سامنے پیش کیا +

---

[1] پرائم (Priam) ٹرائے کا بادشاہ اور ہیکٹر اور پیرس کا باپ تھا۔ اس کا نام یونانی شاعری اور یونانی داستانوں میں اُس کے اور اُس کے خاندان کے اندوہ ناک انجام کے باعث مشہور ہو گیا۔ یہ مصائب خود اُس کے بیٹے پیرس کے ہاتھوں اس پر پڑیں۔ پیرس یونان سے ہیلن کو جو اپنے زمانے کی حسین ترین عورت تھی ٹرائے میں لے آیا تھا۔ یونانیوں نے ہیلن کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن پیرس نے اس سے انکار کر دیا۔ اس پر یونانیوں نے ٹرائے کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ دس سال تک انہوں نے شہر کا محاصرہ کیا اور آخر اُس پر غلبہ حاصل کر کے اُسے تاخت و تاراج کر دیا اور پرآیم کے بیٹے ہیکٹر کو اُس کی نظروں کے سامنے قتل کر دیا +

[2] ہیکٹر (Hector) بادشاہ پرائم اور ملکہ ہیکیوبا کا بیٹا اور اینڈرومیک کا خاوند ٹرائے کی افواج کا کپتان تھا اور اپنی قوم میں سب سے بہادر تصور کیا جاتا تھا۔ یونانیوں کو اس نے بہت سی شکستیں دیں لیکن آخرکار ایکلیز کے ہاتھوں مارا گیا۔ ایکلیز کو اُس کے تعاقب میں تین دفعہ ٹرائے کی دیواروں کے گرد چکر لگانا پڑا۔ ایکلیز نے اُس کی نعش کو اپنی رتھ کے پہیوں کے ساتھ باندھ دیا اور دیر تک اُسے گھسیٹتا رہا۔ جوپیٹر (زیوس) نے مداخلت کر کے حکم دیا کہ نعش پرآیم کے حوالے کر دی جائے جس کے بعد اس بہادر سپاہی کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ انسانوں میں کوئی انسان ہیکٹر کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اس جنگ میں محض منروا کے دھوکے سے اُسے ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ ایلیڈ کی داستان کا بہترین حصہ وہ ہے جہاں ہیکٹر اپنی بیوی اینڈرومیک سے رخصت ہو رہا ہے یہاں وہ ایک شہزادہ ایک خاوند اور ایک باپ ہونے کی حیثیت سے بہترین احساسات کا اظہار کرتا ہے +

[3] ایکلیز (Achilles) یونانی صنمیات کا ایک بطلِ عظیم تھا۔ اور ہومر کی کتاب الیڈ کا ہیرو۔ ہومر کے بیان کے مطابق وہ تھسلی کے

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

منوئی تمدن - اُن اکتشافات سے جو (۱۸۷۶ء میں) مائی سینی (۱۸۸۴ء میں) ٹرینز اور بعد میں (۱۸۹۳ء میں) ٹرائے میں ہوئے، کانسے کے زمانے کے ایک تمدن کا پتہ چلتا ہے، جس کی یادگاریں بڑی بڑی تعمیرات سنگتراشی کے اعلےٰ نمونے مٹی کے نفیس برتن اور دھاتوں کی مرصع کاریاں ہیں۔ لیکن کریتی تمدن کی صحیح شان وعظمت کا اندازہ اس وقت ہؤا جب سر آرتھر ایونز نے موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں بمقام نوسوس کریت کے بحری بادشاہوں کے عظیم الشان محل کو بے نقاب کیا۔ اس وقت تک اِس تمدن کے لئے "مائی سینی" کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ کیونکہ مائی سینی کے اکتشافات میں اس کے فن کے بہترین و مکمل ترین نمونے پائے گئے تھے۔ لیکن اس وقت سے اس کی جگہ "منوئی" کا لفظ استعمال ہونے لگا کیونکہ "منوس" ایک مشہور فرضی کریتی بادشاہ یا شاہی خاندان کا نام تھا اور "منوئی" سے یہ بھی ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اس تمدن کا منبع کریت کا جزیرہ تھا نہ کہ برِّ اعظم۔

نوسس کا محل جو ایک بڑی عمارت کیا ایک پیوستہ شہر تھا حیرت انگیز طور پر ایک زمانۂ حال کی تعمیر معلوم ہوتا ہے۔ اس کے وسیع ایوان، اِس کے برآمدے، اس کے شہ نشین، اس کے قطار در قطار ستون اِن سب کا تناسب اور خوبصورتی حیرت افزا ہیں۔ اس کی بدرروں کے مکمل نظام کی نہ صرف اُس وقت کے مصر یا بابل میں کوئی مثال مل سکتی تھی بلکہ ایک ہزار سال بعد تک بھی جب روما اپنے کمال پر تھا دنیا اس کی نظیر پیش نہ کر سکی۔ اس کی خستہ دیواروں کی تصویری آرائشیں ظاہر کرتی ہیں کہ ایک زمانے میں وہاں کا فنِ تصویرکشی اس قدر مائل بہ فطرت تھا کہ نیل یا فرات پر کہیں اس کا مقابلہ نہ ہو سکتا تھا۔ منوئی برتنوں کے نقشے کی نزاکت اُن کے رنگ و روغن کی خوبصورتی اور اُن کی میناکاری کی دِقّتِ نظر قابلِ دید ہے۔ ان سے بھی بڑھ کر اُس کا سونے کا جڑاؤ کام ہے جس میں انسانوں اور

بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ

ایک صوبے کے بادشاہ پیلیوس اور بحری دیوی تھیٹس کا بیٹا تھا۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا کہ اُس کی ماں نے دریائے سٹکس میں غوطہ دے کر اُس کے بدن کو ایسا مضبوط بنا دیا کہ اُس کو کوئی صدمہ نہ پہنچا سکتا تھا۔

سٹکس یونان اور روما کے صنمیات میں پاتال لوک کے ایک دریا کا نام ہے۔ جب دیوتا اپنی کسی قسم کی عظمت کو خاص طور پر ظاہر کرنا چاہتے تھے تو وہ اس ندی کی قسم کھایا کرتے تھے۔ سٹکس دراصل آرکیڈیا میں ایک چشمہ تھا جو ایک بلند ٹیلے سے پھوٹتا تھا۔ اس کا پانی انسانوں اور حیوانوں کے لئے زہرِ قاتل سمجھا جاتا تھا۔ دھاتیں اس میں گل جاتی تھیں اور برتن اس میں ڈالنے سے ٹوٹ جاتے تھے۔ اکیلیز کو غوطہ دینے میں اُس کی ایک ایڑی جہاں سے اُسے ماں نے پکڑ رکھا تھا سوکھی رہ گئی اور اس میں وہ قابلیت پیدا نہ ہوئی جو اس کے سارے جسم کو حاصل ہو چکی تھی۔ وہ پچاس جہازوں میں اپنی فوجیں ٹرائے والوں کے خلاف لیکر گیا۔ یونانیوں نے ٹرائے کا محاصرہ کر لیا اور بارہ ساحلی اور گیارہ اندرونی قصبوں کو تباہ کر دیا۔ میدانِ جنگ میں اکیلیز نے ہیکٹر کو قتل کیا اور اس کے علاوہ اور بہت سے شجاعت کے کام کئے۔ آخرکار پیرس کے ہاتھوں ایڑی میں ایک تیر کا زخم کھا کر مر گیا۔

جانوروں کی نفیس اور بانکی تصویروں سے ایک ایسا پختہ مذاق اور ایسا ہنر آئینہ ہوتا ہے کہ زمانۂ حال کی ہوشیاری اس کے آگے سرنگوں ہے +

حقیقت یہ ہے کہ منوئی تمدن جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے نہایت بلند پایہ تھا۔ صرف یونان کا تمدن جس کا یہ سرچشمہ تھا اس پر فوقیت لے گیا۔ اس کے علمی کارناموں سے ہم ابھی تک بے بہرہ ہیں کیونکہ اس کی تحریر ابھی تک ہمارے لئے اِک رازِ سربستہ ہے۔ اخلاقی لحاظ سے جہاں تک ہمیں علم ہے اس میں پستی وعیش پرستی کا عنصر شامل تھا۔ لیکن یہ اظہر من الشمس ہے کہ شمالی وحشی جو ۱۲۰۰ ق م سے آٹھ صدیاں پہلے یہاں وارد ہوکر ہر طرف اس سرزمین میں بس گئے اور آخرکار اس کے مقامات پر اپنا قبضہ جما بیٹھے۔ جب اس تمدن سے آشنا ہوئے تو انہوں نے گویا حیرت ومسرت کی ایک نئی دنیا اپنے سامنے جلوہ گر دیکھی +

بشیر احمد

زورقِ حیات

صبح صبح یہ آواز کانوں میں پڑی تھی کہ ہم کشتی میں سوار ہو کر جائیں گے، صرف تو اور میں، اور دنیا کا کوئی انسان ہمارے اُس مقدس سفر سے واقف نہ ہونے پائے گا جس کی نہ کوئی منزل ہے نہ کوئی انتہا۔

اُس بحرِ ناپیدا کنار میں لہروں کی طرح آزاد، الفاظ کے بندھنوں سے آزاد تیرے تبسمِ خاموش پر میرے گیت نغمے بن بن کر نکلیں گے۔

کیا ابھی وقت نہیں آیا؟ کیا ابھی کام باقی ہے؟ لو، شام ساحل پر چھا گئی اور ماند پڑتی ہوئی روشنی میں بحری پرندے اڑتے ہوئے اپنے گھونسلوں کی طرف آرہے ہیں۔

کون جانتا ہے کہ لنگر کب اُٹھے گا اور کشتی غروبِ آفتاب کی آخری شعاع کی طرح رات کی تاریکی میں غائب ہو جائیگی

(ترجمہ)

عبدالعزیز خاں

تجلّیات

پہنائے کائنات میں تیرے سوا ہے کیا! | تو مدعا ہے اور مرا مدعا ہے کیا!

پھر قلب بے قرار ہے سرشارِ آرزو | پھر اعتبارِ وعدۂ فردا ہوا ہے کیا؟

مے خانۂ نشاط ہے یا برقِ جاں گداز | معلوم کیا ہو وہ نگہِ فتنہ زا ہے کیا!

جس حُسن کی نقاب ہے رنگینیٔ مجاز | اب کیا کہیں وہ جلوۂ رنگیں ادا ہے کیا!

نا آشناسی وہ نگہِ آشنا ہے کیوں! | اُن پر بھی حالِ شوق مرا کھل گیا ہے کیا!

برہم ہوئے حضور مری عرضِ شوق پر | آخر یہی خطا ہے مگر یہ خطا ہے کیا!

نکلے گا اس سراب سے کب کاروانِ زیست | یارب طلسم بندیٔ صبح و مسا ہے کیا!

اے مطربِ بہار! محبّت کا راگ چھیڑ! | یہ فکرِ ابتدا و غمِ انتہا ہے کیا!

طوفانِ رنگ و بو میں مری روح کھو گئی | رنگینیٔ بہار میں تو ہی چھپا ہے کیا!

دارا و جم گدا ہیں اُسی بارگاہ کے | درِ دارا و جم کے در پہ تری التجا ہے کیا!

اس پر نثار کون و مکاں کا سکونِ عیش | اللہ! لذّتِ دلِ شورش ادا ہے کیا!

اپنی وفا پہ ناز ہے کیوں اس قدر اثرؔ
سوچا بھی ہے کبھی کہ ترا ادعا ہے کیا!

اثرؔ صہبائی

عدالتیں

پنجاب میں چار قسم کی عدالتیں ہیں

اوّل دیوانی عدالتیں۔ ان کے دروازوں پر دس بجے سے چار بجے تک متواتر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد مفصلہ ذیل قسم کی آوازیں دی جاتی ہیں

چلو پکوڑی چند اور قرض محمد

چلو کروڑی مل اور فاقے خاں

چلو لالہ کوڑی مل اور میاں مرہون الٰہی

یہ چل چلاؤ غدر کے بعد سے شروع ہؤا ہے اور شاید قیامت تک رہے۔ ان عدالتوں کے ہر فیصلہ کا دارومدار بارِ ثبوت پر ہے۔ عجب دیوانے لوگ ہیں کہ خواہ مخواہ بوجھ تلے دبتے ہیں مگر یہ ثبوت کا بوجھ بعض دفعہ ججوں کی توجہ سے آناً فاناً اِدھر کا اُدھر جا پڑتا ہے۔ اِن دیوانی عدالتوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ گاؤں میں رسم و رواج چاہے کچھ بھی ہو عدالت میں بعض دفعہ مسل میں وہ ایسا بدلتا ہے کہ خود وہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ بعض دفعہ سیدوں میں بیٹیاں لاوارث اور برہمنوں میں نواسیاں جائز حقدار قرار دی جاتی ہیں۔ مگر سب سے طرفہ داستان ان دیوانی عدالتوں کی یہ ہے کہ ان میں سچ (یا سچ نما جھوٹ) کے لئے بھی میعاد مقرر ہے۔ بارہ سال کے بعد سچ چاہے وہ کتنا ہی صادق کیوں نہ ہو جھوٹ ہو جاتا ہے اور بعض سچ تو بہت ہی جوانا مرگ ہوتے ہیں، تین سال سے زیادہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے +

دوم فوجداری عدالتیں۔ انہیں دیوانی عدالتوں پر یہ فوقیت ہے کہ ان کے بعض شائقین آواز کے محتاج نہیں۔ اپنے ساتھ لوہے کی زنجیر کے سرے پر ایک پولیس کا سپاہی اٹکا لیتے ہیں اور خود بخود داخل ہو جاتے ہیں۔ ان شائقین کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اِن پر بڑے سے بڑا بیرسٹر بھی، چاہے وہ لارڈ ریڈنگ ہی کیوں نہ ہو جرح کا سوال نہیں کرسکتا اور ان کو جھوٹ بولنے کا قانونی حق حاصل ہے۔ بعض دفعہ تو بڑے بڑے گھمنڈا سنگھ اور طرے باز خاں اس قانونی حق کا فائدہ اُٹھاتے ہیں مگر عام طور پر یہ حق نتھو خیرے، روپے اور نندے کے لئے مخصوص ہے۔

سوم مال کی عدالتیں۔ ان کا مرتبہ اول الذکر ہر دو سے بالاتر ہے کیونکہ ان میں اکثر گاؤں کے گاؤں کو طلب

کرلیا جاتا ہے ۔ دیگر عدالتوں میں تو انسانوں کی قسمت کا الٹ پھیر ہوتا ہے ۔ یہاں زمین کی تقدیر گردش میں رہتی ہے ۔ یہ عدالتیں اکثر خود بھی چکر میں رہتی ہیں ۔ بُدھو پور کا مقدمہ منگل پور ، منگل پور کی جمعبندی سنت آن پور ، سنسان پور کی فرزندی پور ۔ دریاؤں کی برد برآمد کی طرح (پنجاب کے دریا سمجھدار ہیں جسے فائدہ پہنچانا ہو اس کی زمین پہلے بُرد کر دیتے ہیں) ان عدالتوں میں جو ایک دفعہ بہ نکلے پھر وہ نکلتا ضرور ہے مگر عرصہ کے بعد ۔

چہارم اندھیری مجسٹریٹوں کی عدالتیں ۔ یہ سب سے انوکھی ہیں کیونکہ ان میں صلح صفائی کے بلاتنخواہ واعظ جلیس ہوتے ہیں ۔ مارپیٹ کا مقدمہ ہو کہ نقضِ امن کا اندیشہ ہو کہ اغوا کی واردات ہو سب کے لئے ایک ہی مجرب تلقین ہے یعنی راضی نامہ ۔ ان سب عدالتوں کا جو گرانقدر مجموعی احسان اہلِ پنجاب پر ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ۔ پنجاب کی عدالتیں پہلا سبق یہ سکھاتی ہیں کہ انسان اس دنیا میں صرف اپنے لئے زندہ نہیں چنانچہ ان کے فیضان سے گاؤں والوں کی کمائی سے عرضی نویس ، وکیل ، وکیلوں کے منشی ، عدالتوں کے اردلی ، اہلمد ، ناظر ، پولیس کے سپاہی ، دیوانی کے پیادے ، قیدخانے کے برقنداز علیٰ قدرِ مراتب اپنا اپنا حصہ وصول کرتے ہیں ۔ اس کے برعکس انگلستان کے خود پرست لوگ اس رواداری کے قریب نہیں پھٹکتے ۔ گواہ وہاں ایسی موٹی عقل کے ہیں کہ رشتہ داری ، قرابت ، دوستی ، دشمنی انہیں کسی کا کچھ پاس نہیں بلکہ ایسی عقل کی مار ہے کہ اکثر ملزم خود اقبالی ہو جاتے ہیں ۔ دوسرا سبق روحانی ہے ۔ ہر مذہب کی روحانی تعلیم کا نصب العین ایک ہی ہے یعنی فنا فی اللہ ہو جانا ۔ پنجاب کی تمام عدالتوں کی تقدیس اس ایک بات ہی سے ثابت ہے کہ انہوں نے اس عظیم الشان نصب العین کی پوری تکمیل اپنے ذمہ لے رکھی ہے یعنی اس طرح سے کہ پہلے اہلِ مقدمہ پوری طرح فنا ہوتے ہیں اور پھر یہ کہہ کر صبر کر لیتے ہیں کہ خدا کی مرضی ، گویا فنا فی اللہ ہو گئے ۔ صاف ظاہر ہے کہ جتنی عدالتیں زیادہ ہونگی اسی قدر روحانی ترقی کی رفتار تیز ہوتی جائیگی اس لئے ملک کے رہنماؤں کا اوّلین فرض یہ ہے کہ اور کاموں کو چھوڑ کر تمام کوششیں اس مرکزی اصول پر جمع کی جائیں کہ ہندوستان کی روحانیت کا تقاضا ہے کہ ہر گاؤں میں ہر قسم کی عدالت قائم ہو اور ہر عدالت کے ہر حکم کی اپیل در اپیل ہو سکے ۔ اس اصلاح میں ہر قسم کی اصلاح آجائیگی اور تمام انٹرنس فیل بلکہ مڈل فیل بزرگ بلا دِقت ملک کی خدمت میں لگ جائینگے ۔

تیسرا سبق اقتصادی ہے بشرطیکہ کوئی غور کرے ۔ مثلاً کہاں دریائے سندھ کے پاس چھچھ کا علاقہ کہاں لاہور کا مشہور بیرسٹر سر ولیم راٹیگن مگر چونکہ ذاتِ باری کو منظور نہ تھا کہ چھاچھی لوگ پکے مکانوں میں آسودہ ہو کر رہیں اس لئے اللہ تعالےٰ نے لاہور میں چیف کورٹ قائم کرا دیا ۔ چنانچہ چھاچھی جو پہلے قتل کے بدلے صرف قتل کرتے تھے چیف کورٹ قائم ہونے پر قتل کے ساتھ قتل کے علاوہ اپیل کے ساتھ وکیل کرنے لگے اور سابق مسٹر راٹیگن کے گھر چاندی کی نہر

بنگلی۔ صرف مسٹر راٹیگن ہی نہیں بلکہ بابو پرتول چندر چٹرجی (بعد میں سر پرتول چندر) بھی اسی زمرہ میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ عدالتیں تو اللہ جل شانہٗ کا الف لیلہ والا الہ دین کا عجیب وغریب چراغ ہیں۔ جس وکیل، بیرسٹر نے اس چراغ کو درست طریقے سے مل لیا۔ اس کے محل تیار ہو گئے۔ اس زندہ اور جاری معجزے کو دیکھ کر جو شخص ذاتِ حق پر یا کم از کم برٹش گورنمنٹ پر ایمان نہ لائے اس کا اقتصادی مذہب باطل ہے۔ عدالتوں میں دہقانوں کے روپیہ کے لئے وہ مقناطیسی کشش قائم ہو گئی ہے کہ ان کے ہوتے کوئی گاؤں کا رہنے والا اپنے آرام و آسائش میں مستغرق ہو ہی نہیں سکتا۔ صاف مشیت معلوم ہوتی ہے کہ پہلے ہر قسم کی نعمتیں شہریوں کو عطا ہونگی اور اس کے بعد مناسب موقع پر گاؤں والوں کو عقل دی جائے گی کہ وہ فارغ ہو کر افسوس کریں۔

اب یہ مضمون ختم ہوتا ہے مگر پڑھنے والوں سے اس امر کی داد کی توقع ہے کہ عدالتوں کے ذکر میں انصاف کا لفظ بھول کر بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ مرزا غالب مرحوم کے شعر

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

میں "تیرا" خداوند تعالٰے کی طرف راجع ہے۔ چونکہ حق تعالٰی انصافِ مطلق ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ انصاف کو مخاطب کر کے یوں یہ شعر نہ پڑھا جائے

لُٹ لُٹ کے ہر کچہری میں دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

یا روحانیت کا اظہار یوں کیوں نہ کیا جائے

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں میں جج کو

بعض کوتہ اندیش لوگ اکثر واویلا کرتے ہیں کہ مسجدیں غیر آباد ہیں اور مندر سنسان۔ کیا انہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ پنجاب میں نئے عبادت خانے جہاں لوگ شوق سے چڑھاوے لے کر جائیں بھرپور آباد ہیں یعنی عدالتیں*

"فلک پیما"

طوفانی رات

برسات کی گھٹائیں طوفاں اُٹھا رہی ہیں
سنسان جنگلوں میں ہلچل مچا رہی ہیں
خوابیدہ بستیوں کا بازو ہلا رہی ہیں
سنسار میں ہزاروں موتی لُٹا رہی ہیں

اک حشر موج زن ہے بارش کی رات کیا ہے
دنیا لرز رہی ہے، اک دو کی بات کیا ہے

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے رہ رہ کے آرہے ہیں
باغوں کی بھینی بھینی خوشبو لُٹا رہے ہیں
خوابیدہ دل میں لاکھوں ارماں جگا رہے ہیں
صہبائے بیخودی کے دریا بہا رہے ہیں

آجا رہے ہیں ہر سُو نغمے سنا سنا کر
جنگل میں سنسنا کر، بستی میں گنگنا کر

پُرشور بادلوں میں بجلی چمک رہی ہے
پارے کی ایک مچھلی گویا لپک رہی ہے
کندن کی طرح جس سے ہر شے دمک رہی ہے
ہر آنکھ خیرگی کے مارے جھپک رہی ہے

چونک اٹھے جنگلوں میں غفلت زدہ چرندے
جاگ اُٹھے گھونسلوں میں سوئے ہوئے پرندے

بادل گرج گرج کر ہر سُو مچل رہے ہیں
کاجل کی تہ میں لاکھوں موتی اُگل رہے ہیں
چُپ چاپ بہنے والے دریا اُبل رہے ہیں
موجیں اُبھر رہی ہیں طوفاں اُچھل رہے ہیں

برسات کی رگوں میں ہیجان آرہا ہے
سرسبز وادیوں میں طوفان آرہا ہے

اک شور مچ گیا ہے خاموش بستیوں میں
دھندلی بلندیوں پر تاریک پستیوں میں

کچھ لوگ الجھ رہے ہیں مینا پرستیوں میں　　کچھ محو ہیں شرابِ گلگوں کی مستیوں میں
کچھ نیند کے نشے میں کروٹ بدل رہے ہیں
کچھ ڈرتے ڈرتے اپنے گھر میں ٹہل رہے ہیں

دریا چڑھاؤ پر ہیں، تالاب بھر رہے ہیں　　جنگل ہرے ہوئے ہیں گلشن سنور رہے ہیں
باغوں کے ننھے پودے دھل کر نکھر رہے ہیں　　بادل گرج رہے ہیں چوپائے ڈر رہے ہیں
یہ ابر ہے کہ ہر سُو اٹھتا ہُوا دھوُاں ہے
یا آسماں پہ چھایا اک اور آسماں ہے

مدہوش ہیں مناظر پُرشور ہیں صدائیں　　تھرّا رہی ہیں دھندلی بھیگی ہوئی فضائیں
یہ ابر کی گرج ہے یا توپ کی صدائیں　　ساتوں طبق زمیں کے کیونکر دہل نہ جائیں
پھل پھول گر رہے ہیں پتے بھی جھڑ رہے ہیں
لاکھوں درخت اپنی جڑ سے اُکھڑ رہے ہیں

اُودی گھٹا نے ہر سُو دریا بہا دیئے ہیں　　دنیا پہ کالے کالے پردے چڑھا دیئے ہیں
سوئے ہوئے ہزاروں فتنے اُٹھا دیئے ہیں　　اپنی کڑک سے لاکھوں محشر جگا دیئے ہیں
باغوں میں ہر جگہ اک طوفاں بکھر رہا ہے
ہر ذرہ کانپتا ہے ہر پھول ڈر رہا ہے

بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہا ہے　　ہر ذرّہ ذرّہ پر اک ہنگامہ سا بپا ہے
مینہ کی جھڑی لگی ہے۔ اک شور سا مچا ہے　　محشر سا موجزن ہے، طوفان سا اُٹھا ہے
یہ رات، یہ سیاہی، یہ ابر، یہ اندھیرا
گویا کبھی نہ ہوگا دنیا میں اب سویرا

کیشوداس عاقل

تکمیلِ محبّت

(۷)

منظور و ثروت کی شادی کو اب نو برس ہونے کو تھے +

منظور جو جمیل کا دوست تھا اور منظور جو ثروت کا شوہر تھا فی الحقیقت دو مختلف الطبائع شخص تھے + کچھ یہ وجہ تھی کہ جمیل پندرہ سال کی عمر میں ابھی ایک ناتجربہ کار نوجوان تھا اُسے دنیاداروں کی سیرت کا صحیح صحیح اندازہ نہ ہوسکتا تھا اور کچھ یہ سبب تھا کہ منظور کی سیرت تھی ہی کچھ مستور و متلون۔ وہ گورنمنٹ کالج میں تاریخ کا اسسٹنٹ پروفیسر تھا اور تاریخ ہی کی طرح اُس کی طبیعت میں عجیب و غریب نشیب و فراز تھے +

وہ اپنے دوستوں سے کبھی دوستی رکھتا تھا اور کبھی بے اعتنائی برتتا تھا۔ وہ کبھی نہایت خوش مزاج ہوتا تھا اور کبھی اپنے آپ سے بھی بیزار۔ اُس کا جسم پُرصحت اور اس کی شکل وجیہ و دلکش تھی جس پر عینک نے سونے پر سہاگہ کردیا تھا۔ اُس کا لباس کبھی نہایت پُرفیشن اور کبھی نہایت مکروہ ہوتا تھا۔ اور اُس کے دوستوں میں اس "پروفیسریت" کا خوب مذاق اُڑایا جاتا تھا +

اُس نے علیم الدین کے گھرانے میں بڑے شوق سے شادی کی تھی کہ اِس میں اُس کی عزت افزائی تھی اور ثروت سے بھی اُس کا برتاؤ نہایت پُرخلوص و پُرمحبت تھا لیکن وہ جبلتاً نسوانی صحبت سے گریز کرتا تھا اور عادتاً اپنے دوستوں یاروں کی محفل میں رات رات بھر بیٹھے رہنے کا مشتاق تھا۔ یا پھر اُسے اپنی "ہسٹری" (تاریخ) کا خبط تھا۔ جب کبھی وہ اپنے بوسیدہ مسودات اور گبن اور الفنسٹن کی "عظیم الجثہ" کتابیں نکال کر انہیں اپنے دفتر میں پھیلا دیتا اور کام کرتے کرتے روشنائی کے بعض چھینٹے ساتھ کے "پلنگ کمرے" میں بھی ڈال دیتا تو ثروت کو اس علمی بدتمیزی پر بہت غصہ آتا۔ شادی کے تین سال کے بعد منظور نے کالج کا کام کرنا کم کردیا کہ اب وہ ایک کرائے کے گھوڑے کی طرح اپنے مقررہ راہِ عمل سے بخوبی آگاہ ہوگیا تھا اور اُسے بغیر زیادہ کوفت کے نہایت رسمی طور پر سُستی سے طے کرتا تھا۔ وہ چند دوستوں کی خاموش عملی ترغیب سے ناچ، وہ ناچ جو انگریزی تفریح گاہوں میں صرف تعلیم یافتہ اصحاب کی ضیافتِ طبع اور محض ذوقِ فن کی ترقی کی خاطر دیکھا جاتا ہے اور راگ رنگ، وہ جو فقط احباب کی مخفی شبانہ صحبتوں میں بعض آوارہ گرد نوجوان دوستوں سے سُنا جاتا ہے اور تھوڑی سی شراب اِتنی جتنی کہ انگریزی وضع کی سوسائٹی میں نہ صرف ممنوع ہے بلکہ وضعداری میں داخل اور فیشن کاری کے لئے

لازم ہے اور جوئے کی وہ متمدن شکل جس سے شناسائی ہر کلب والے کے لئے "کلبیت" کا جزو لاینفک ہے ان سب چیزوں
سے تھوڑا تھوڑا اور عموماً بالکل حدِ اعتدال کے اندر وہ محظوظ و متمتع ہوتا رہا۔ لندن اور پیرس میں ہم نہیں جانتے کہ اُس نے
عیش و عشرت میں حصہ لیا یا نہیں لیکن جب ولایت جانے سے پہلے اور بعد کے بڑے بڑے پارسا اور بیشتر میلے صحاب
ولایت میں عموماً آں کارِ دیگر می کنند کی تصویر بنے رہتے ہیں تو بیچارے منظور ہی نے کیا جرم کیا ہے کہ ہم اُس کے بعد کی
عشرت پسندیوں سے (اور وہ بھی اُن عشرت پسندیوں سے جن کو عشرت کہنا تازہ ترین شائستگی والوں کے نزدیک تنگ
خیالی اور جہالت کا مرادف ہے تو ان آزاد خیالیوں سے ہم) "قدیمانہ" بیزاری ظاہر کر کے اُسکی تاریخ زندگی کے "ولایتی زمانے"
میں اُس کے رویئے کی چھان بین کریں +

انصاف سے بعید ہوگا اگر ہم منظور کے چال چلن میں کسی قسم کا شک وشبہ کریں۔ وہ اُن بہت سے "انگلستانی"
ہندوستانیوں کی مانند تھا جو ندرت پسندی کے مرض میں مبتلا ہو کر فیشنی جدت کے پیرو اور شایستہ رنگ رلیوں کے نام لیوا
ہو جاتے ہیں اگرچہ اُن میں سے اکثر بہیمیت کی انتہائی کمزوریوں کا شکار ہونے سے بچے رہتے ہیں +

منظور کی یہ روش اُس کے خسر کو ناپسند تھی لیکن وہ مجبور تھے کہ اپنے داماد پر زیادہ زور نہ ڈال سکتے تھے۔ ثروت
کو کلب میں آنے جانے سے عار نہ تھا شریف مردوں سے ملنے جلنے میں اعتراض نہ تھا لیکن وہ دورِ حاضر کی تمام عشرت پسندیوں
کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اپنے شوہر کو اُن میں حصہ لینے سے روکنا چاہتی تھی + مگر بدقسمتی سے وہ اب منظور
نظر نہ رہی تھی۔ ثروت کی شادی کو اب نو برس ہونے کو تھے لیکن اُس کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا تھا نہ ہونے کی کچھ زیادہ اُمید
تھی۔ منظور ثروت سے محبت کرتا تھا اُسے دل سے چاہتا تھا مگر وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کے باپ کو پوتے
کی خواہش تھی جس سے اُس کی نسل قائم رہے اور اپنے بیٹے کا گھر بے چراغ دیکھ کر ماں کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا
تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ منظور دوسری شادی کرلے لیکن منظور کی خوش نصیبی سمجھئے کہ اُس نے اپنی مغربی تعلیم سے اتنا فائدہ
ضرور اُٹھایا کہ کثرتِ ازدواج کے معاملے میں کبھی لغزش نہ کھائی۔ ہاں یہ ہوا کہ ثروت کی طرف روز بروز اُس کے جذبات
سرد اور اُس کا رویہ بے پروا ہوتا گیا اور ثروت شادی کے تین چار سال کے بعد زیادہ تر اپنے میکے ہی میں رہنے لگی +

ثروت کی زندگی روز بروز زیادہ غمگین و اندوہ ناک ہوتی گئی۔ وہ اپنے باپ کو اپنے شوہر کی عادات پر خاموش رہنے
کی ترغیب دے سکتی تھی لیکن جس نعمت سے خدا ہی نے اُسے اب تک محروم رکھا تھا اُسے بغیر تائیدِ الٰہی کے وہ کیونکر پاسکتی
تھی؟ رونا دھونا اُس کا کام اور آہیں بھرنا اُسکی فطرتِ ثانی ہوگئی۔ وہ عبادت کی طرف مائل ہوتی گئی۔ ہر روز قرآن مجید پڑھتی
اور صبح کی نماز ادا کر کے گڑگڑا کر خلوص دل سے دعائیں مانگتی کہ بارِ خدایا یا مجھے اس دنیا سے اُٹھا لے منظور اور شادی کر

لے تو اُسے اک بچہ عنایت کرے اور یا مجھ عاجز کی گود ہری بھری کر دے کہ مجھ سے محبت میں یہ بے اعتنائیاں نہیں دیکھی جاتیں۔ مجھے غربت کی اٹواٹی کھٹواٹی پسند ہے مجھے کلفت کے درد و کرب مقبول ہیں مگر محبت کا گلا نہ گھونٹ سکنے والے دار و رسن مجھے کسی صورت منظور نہیں۔ پھر آہ بھر کر چپ ہو جاتی کہ خدایا مجھے معاف کریں کیا کہہ رہی ہوں؟ مجھے کیا منظور نہیں؟ جو کچھ بھی تو مجھ کو دے وہ سب مجھ کو بسر و چشم قبول کرنا ہے۔ جس روز سے میں منظور کے دل کی ثروت اور منظور میرا منظورِ نظر بنا اُس روز سے جو بھی میرے اُوپر گزر جائے وہ سب مجھے بصد شوق منظور ہے!

ثروت جس کی ظاہرہ شکل و صورت کو دستِ قدرت نے تکمیلِ حسن کے سانچے میں ڈھالا تھا اب زمانے کی گردش اور دنیا کی مصیبتوں نے اُس کی فطرت کو اپنے شکنجے میں دبا کر اُس کے باطن کو صدق و صفا کی جلا دی۔ ممکن تھا کہ دنیا کے عیش و عشرت میں پڑ کر وہ محض حسن کی اک دلکش پتلی ہو جاتی لیکن اب زندگی کے درد و کلفت نے اس غمگین حسینہ کو فرشتوں کی سی سیرت سے آراستہ کر دیا!

دن گزرتے گئے۔ راتیں لمبی ہوتی گئیں۔ ہفتے مہینے ہو گئے۔ مہینے سال بن بن کر نظر آنے لگے! لیکن اُمید کی صورت نظر شاید نہ آنی تھی نہ آئی +

اِس اندوہ والم میں ثروت کو تسلّی دینے والے یا اُس کے والدین تھے اور یا گذشتہ دو سال سے جمیل و عذرا +

ہم دیکھ چکے ہیں کہ شادی کے وقت سے جمیل اور منظور و ثروت میں غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی جو روز بروز بڑھتی گئی۔ شادی ہو کر نہ صرف دونوں کا نصیبہ جُدا جُدا ہو گیا بلکہ اُن کے گھرانوں میں بھی مغائرت سی ہوتی گئی۔ عزیزوں میں جب غیریت پیدا ہونے لگتی ہے تو وہ عموماً اجنبیت کی حد سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ ایسا ہی یہاں ہوا۔ اُدھر منظور و جمیل کی دوستی کا بھی اب کچھ نشان باقی نہ رہا تھا کہ جمیل کا منظور کے پاس آنا جانا باقی رہتا۔ لیکن باپ کی وفات کے بعد جمیل علیم الدین کو اپنا باپ سمجھ کر اُن کی انتہائی عزت کرتا تھا اگرچہ اُسے اُن سے نہ کوئی غرض تھی نہ کوئی واسطہ۔ اُدھر علیم الدین جن کی اپنے داماد سے چشمک تھی اِس نوجوان سے ہر طرح مروت کے ساتھ پیش آتے تھے اور اکثر "علیم منزل" میں اُس کے آتے رہنے کی خواہش ظاہر کرتے تھے۔ اس طرح جمیل اور عذرا کی آمد و رفت یہاں ہونے لگی +

جمیل اگرچہ ثروت و منظور کی ناچاقی سے باخبر تھا لیکن اب ثروت کو بار بار دیکھ کر اور اپنے چچا علیم الدّین کے ذریعہ سے مختلف حالات سے آگاہ ہو کر وہ اپنی گذشتہ بے مروتی اور روکھے پن پر بے انتہا نادم ہوا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ اور عذرا اب اکثر "علیم منزل" میں آنے جانے لگے +

عذرا اور ثروت کی گہری دوستی ہو گئی۔ ثروت کو اُس کے غم و مصیبت میں ایک نہایت سچے دل والی سہیلی مل گئی۔

جس کے آگے وہ بے تکلف اپنا دکھڑا کہہ سکتی + عذرا گھر جا کر یہ سارا حال جمیل کو سناتی اور کہتی کہ تم اُس کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہو انسانیت کا تقاضا ہے کہ تم کبھی کبھی اُس سے ہمدردانہ گفتگو کیا کرو۔ بچپن کے دنوں میں تمہارے دل میں اُس کے لئے اِک معصوم الفت کا جذبہ اٹھا۔ اُس کے بعد اُس کی اور تمہاری زندگی الگ الگ ہوگئی لیکن کیا وہ الفت اس قدر بودی تھی اور یہ اُس الفت کا ردِّعمل ہے کہ پھر اِس کی بجائے اک ضد آمیز بے اعتنائی تم میں پیدا ہوگئی + سرد مزاج طبیعتیں عموماً رشک و حسد سے پاک ہوتی ہیں۔ عذرا کے دل میں حسد کے جذبات مطلق نہ تھے۔

عذرا شروع میں بہ ظاہر ایک معمولی سیرت کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ پُر تخیّل و جدّت طراز جمیل کی عقلی و ذہنی عظمت کے مقابل میں اُس کی شخصیت بے حقیقت نظر آتی تھی۔ لیکن حق یہ ہے کہ باوجودیکہ بعض باتوں میں اُس کی اور جمیل کی فطرت میں زمین آسمان کا فرق تھا اُس نے جمیل کی زندگی کو عملی طور پر راستی کی اُس راہ پر لگا دیا جس سے ممکن ہے کہ وہ اپنے سرکش تخیل کے باعث بھٹک جاتا +

عذرا کے اس قابلِ تحسین اعتمادِ محبت کا اثر نہایت اچھا ہُوا۔ جمیل سے ثروت کی طرف برادرانہ الفت کا اظہار ہونے لگا اور ثروت کی جانب سے جمیل کی طرف خواہرانہ شکر گزاری کا بیان +

عذرا نے دونوں بچھڑے ہوؤں کو پھر ملا دیا اور ملانے والی کی شکر گزاری میں ملنے والوں کے جذبات نے وہی رنگ اختیار کیا جو انہیں اختیار کرنا چاہئے بھی تھا +

ثروت کی زندگی ابھی غم و افکار سے تیرہ و تار ہو رہی تھی لیکن خدا کا ہزار شکر تھا کہ اب کبھی کبھی اِس ظلمت کدہ میں عزیزانہ ہمدردی کی شیریں کرنیں چلی آتی تھیں !

ثروت اکثر کہا کرتی پیاری عذرا ! میں تمہارے احسان کبھی نہیں بھول سکتی۔ خدا گواہ ہے کہ اگر کبھی ضرورت پڑی جو خدا نہ کرے کبھی تم کو پڑے تو میں اپنی ناچیز خدمت تمہارے لئے پیش کروں گی۔ اب تو میرے پاس صرف ایک سچی محبت کا ناچیز تحفہ ہے اور بہن! وہ حاضر ہے !

* * * * * * * * * * * *

---

(۸)

ننھا عزیز ایک دن اپنے رنگین کھلونوں سے کھیل رہا تھا کہ اُس کی آیا نے اُسے گود میں لے کر پیار کیا اور

کہا میرے بچے! تیری ماں آسمان کے دیس چلی گئی!

عزیز نے کہا" ہاں! وہ مجھے آسمانی پریوں کی کہانی سنایا کرتی ہیں کہ وہاں بلور کے پہاڑ ہیں جن پر زمرّد کے درخت لہلہاتے ہیں۔ اُن پہاڑوں سے شہد کی سرخ اور سفید نہریں بہتی ہیں اور اُن درختوں میں رنگ رنگ کے یاقوتی پھول کھلتے ہیں۔ وہ میرے لئے وہاں سے ایک ننھی منی پری لائیں گی جس کے ساتھ مل کر میں اس گھروندے میں رہوں گا اور ان کھلونوں سے کھیلوں گا۔ وہ آئے تو میں اُسے اپنے سارے کھلونے دے دوں اور کھانے کو چیزیں دوں کہ پھر جانے کو اُس کا جی نہ چاہے"۔ آیا کا جی بھر آیا۔ اُس نے بچے کو اپنے گلے سے لگالیا اور اُس کے آنسو ٹپ ٹپ بچے کے رخسار پر گرنے لگے جو اس نے جلد جلد پونچھ دیئے۔ بچے نے شوخی سے کہا" رحیمہ آج تیسری بار تم نے میرا منہ دھویا ہے۔ امی جان آئیں گی تو میں ضرور کہوں گا کہ اگر اتنی بار منہ دھونا ہو تو وہ خود ہی دُھلا دیا کریں۔ رحیمہ تمہارے ہاتھ بڑے سخت ہیں امی جان کے ہاتھ بڑے پیارے اور نرم ہیں"۔

اتنے میں سامنے سے ثروت آگئی اور اُس نے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔

عذرا تین ماہ کی شدید علالت کے بعد آج دم توڑ چکی تھی اور دوسرے کمرے میں بچے سے تھوڑی ہی دُور بے حس وحرکت پڑی تھی۔ بہت سے عزیز وہاں جمع تھے۔ جمیل عذرا کے بسترِ مرگ پر سر جھکائے بیٹھا تھا اور آنسو زار قطار اُس کے چہرے پر رواں تھے۔

جب موت کا وقت قریب آیا تو عذرا نے ثروت کو اپنے قریب بلایا اور کہا کہ"میری پیاری بہن! تم کو اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں جاتی ہوں مگر اپنے لختِ جگر کو چھوڑے جاتی ہوں۔ وہ اب تمہارا بچہ ہے، ثروت اب تم اُس کی ماں ہو۔ دیکھنا میرے لال کو دُکھ نہ پہنچے۔ جب وہ پوچھے کہ امی جان کہاں ہیں تو تم کہنا کہ میں ہی تمہاری امی جان ہوں جو پریوں کے ملک سے اک پری بن کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ خدا حافظ بہن!"

عذرا کی موت سے جمیل کی زندگی تہ و بالا ہوگئی۔

عذرا جس سے جمیل نے شروع میں محض ایک نوع کی رسمی شادی کرنے کا ارادہ کیا تھا ایک ایسی شخصیت رکھتی تھی جس کے خاموش اثر سے بڑے بڑے خیال پرست بتدریج خود بخود عملی انسان بن جاتے ہیں۔ جمیل کی طبیعت شادی سے پہلے بھی کج روش نہ تھی لیکن اُس کی فطرت ابھی زمین پر پاؤں نہ رکھتی تھی، اُس کی جودت ابھی اُسے فلک پیمائیوں پر مجبور کرتی تھی۔ اگرچہ تکمیلِ تعلیم کے بعد اُس نے عارضی طور پر اپنے تئیں تخیل کے زور و ترغیب سے دنیا کے معمولات کا خوگر بنالیا تھا۔ عذرا سے اُس نے یہ سبق سیکھا کہ بغیر زورِ تخیل کے بھی انسان یہ معمولی زندگی بسر کرسکتا ہے اور ایسے

ہی اُسے زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ انسان ایک متنفس ہے کوئی پر دار فرشتہ نہیں، کھاتا پیتا بولتا چالتا ہے اَوروں کے ساتھ مل کر رہتا اور اَوروں ہی کی مدد سے کسبِ معاش وکسبِ کمال کرتا ہے اس لئے انسان کا پہلا فرض اپنی دنیائے معاشرت سے وابستہ رہنا، اُس کی خدمت کرنا اور اُسے برابر ترقی دیتے رہنا ہے۔ جب تک معاشرتی دستور تبدیل نہ ہوں یا کر نہ دیئے جائیں اُس وقت تک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدا مسجد بنانا نہ صرف بے سود ہے بلکہ قطعی ضرررساں! جمیل کی فطرت میں جو کمیاں یا زیادتیاں تھیں عذرا نے اُن کی اصلاح کی اور اُسے سیدھے رستے پر لگا دیا +

اِس کے علاوہ عذرا نے جمیل کی خانگی زندگی کو خوشگوار بنا دیا تھا اور اُس کے گھر بھر میں ایک ننھے منے چراغ سے چکاچوند کا عالم پیدا کر دیا تھا۔ اِس سے بڑھ کر اُسے دنیا کی زندگی میں اَور مل ہی کیا سکتا تھا کہ اِک وفادار بیوی ہو جو رنج وراحت میں اُس کی شریک اور نشیب وفراز میں اُس کی مُشیرِ کار بن کر زندگی کے اک ایسے جادۂ رواں پر اُس کی رہنمائی کرے جس پر وہ سلامت روی کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہو +

سچ یہ ہے کہ عذرا جمیل کی طبیعت کے پریشان اجزا کا مضبوط ومتناسب سانچا تھی۔ جب سانچا! ٹوٹ پھوٹ گیا، تو اجزا پھر پریشان اور پریشان تر ہو گئے +

غم کی گھٹائیں اُس کے دِل پر چھا گئیں اور رنج ومحن کی بجلیاں اُس کے خرمنِ حیات پر رہ رہ کر گرنے لگیں۔ راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ آرام وآسائش سے طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ بےچینی نے دل میں گھر کر لیا۔ رونے سے آنکھوں کا ستیاناس ہوا۔ فکر والم سے اعصاب میں کبھی اضمحلال اور کبھی انتہائی بےکلی پیدا ہونے لگی۔ اب کون تھا جس سے اس کرب وِ اندوہ کا تذکرہ کر کے وہ جی ہلکا کرتا۔ اُس کے خمیر میں تھا کہ جی کی بات کہے تو کسی ایسے دوست سے جو کسی اور کا دوست نہ ہو۔ اب کون باقی تھا جو فقط اُسی کا دوست اور محض اُسی کا رفیقِ زندگی ہو رہتا؟

جمیل کو اِس ظلمت سے بھاگ نکلنے کی کوئی راہ نہ سُوجھی۔ اُس کی ماں نے اُسے بہت تسلی دینی چاہی لیکن بیوی کے بارے میں ماں کی تسلی اُسے بُری معلوم ہوتی تھی۔ اُسے تسلی صرف وہی دے سکتا تھا جسے عذرا کی موت کا اُتنا ہی رنج ہو جتنا اُسے خود تھا۔ اِس لئے اب وہ عموماً اپنی خالہ کے ہاں آنے جانے لگا۔ عذرا اپنی ماں کی ایک ہی بیٹی تھی۔ عذرا کی موت سے اُس کی ماں بیچاری دیوانی سی ہو گئی، گھربار سے، دوستوں عزیزوں سے اُس نے روگردانی کر لی۔ لہٰذا اگرچہ جمیل کو کچھ عرصہ اپنی غم زدہ خالہ سے اِس مشترک غم میں ایک دلی مصاحبت ہو گئی لیکن اِس کا اثر اُس پر بجائے اچھا ہونے کے بُرا ہوا۔ کیونکہ جمیل ایک غایت درجہ حساس شخص تھا اور وہ اپنے غم کو نہ صرف جسمانی وقلبی بلکہ عقلی وذہنی طور پر بھی محسوس کرتا تھا۔ غرض غم جمیل کے رگ وریشہ میں سرایت کر گیا۔ باپ بھی سر پر نہ تھا کہ پدرانہ شفقت اور بزرگانہ

سطوت سے کچھ اثر ڈال سکتا۔ ماں کو جمیل کا روز بروز رنجیدہ دیکھنا زہرِ قاتل تھا۔ اپنے شوہر کی وفات کے بعد وہ نرم دل ہو چکی تھی۔ اب بیٹے کے رنج و غم سے اُس کی طبیعت بالکل گداز ہو گئی اور سب عزیزانہ رنجشیں اور گلے شکوے بھول بھلا گئی +

عزیز کبھی ثروت کے پاس ہوتا تھا اور کبھی اپنی نانی اماں کے پاس اور کبھی کبھی اپنی دادی اماں کے ہاں بھی چلا آتا تھا۔ ماں نے سوچا کہ اِسی گھر میں جس میں اُس کے بیٹے نے بیوی کی محبت دیکھی ہے ہر وقت وہی محبت بیٹے کی آنکھوں میں پھرتی ہو گی۔ بہتر ہے کہ کسی طرح وہ کچھ عرصہ یہاں نہ رہنے پائے + لہذا وہ علیم الدین کے پاس گئی اور اُن سے کہا کہ آپ اب جمیل کے باپ کی بجائے ہیں۔ غم سے اُس کا حال بُرا ہو رہا ہے۔ ذرا آپ ہی اُسے سمجھائیے۔ وہ آپ کی بات بہت مانتا ہے اور اُس پر آپ کے کہنے کا بڑا اثر ہے۔ علیم الدین نے کہا بہن! اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میری خواہش ہے کہ جمیل یہاں میرے پاس آجائے اور کچھ عرصہ "علیم منزل" ہی میں رہے۔ ماں نے بخوشی منظور کیا +

ایک روز جمیل کے پاس اُس کے چچا آئے اور کہنے لگے کہ بیٹا! میں چاہتا ہوں تم ہمارے پاس آجاؤ کم از کم کچھ عرصہ تو ضرور میرے قریب آکر رہو کہ مجھے کئی باتوں میں تمہاری مشورت کی ضرورت ہے۔ عزیز بھی مجھے اس قدر پیارا لگتا ہے کہ جب کبھی گاؤں چلا آتا ہے تو صبح کو میرا جی کام کاج کو نہیں چاہتا۔ وہ علے الصباح میرے بستر پر آجاتا ہے اور کبھی میری مونچھیں نوچتا ہے کبھی میرے گالوں پر تھپڑ مارتا ہے۔ وہ ثروت کے ساتھ رہتا ہے اور اُسے ہی امّی جان پکارتا ہے لیکن اکثر پوچھتا رہتا ہے کہ میرے ابا جان اب امّی جان کے پاس کیوں نہیں آتے؟

چچا کی پُرخلوص شفقت سے جمیل کا دل بھر آیا۔ اُس کے منہ سے کچھ بن نہ پڑا۔ بستر باندھ سامان لے ساتھ ہو لیا۔ چچا نے کہا جمیل ذرا اپنی کتابیں بھی ضرور ساتھ لے چلو کہ مجھے اُن سے دلچسپی ہو گی۔ بہن نے کتابیں بکس میں بند کر کے ساتھ کر دیں +

ثروت جمیل کے غم کا حال سُن سُن کر غمگین و ملول ہو رہی تھی جب آیا تو دیکھا کہ پہچانا نہیں جاتا۔ بچہ گود میں تھا آنسو نکل پڑے اور اپنے کمرے میں چلی گئی +

جب سے جمیل "علیم منزل" میں آیا سبھی نے یہاں تک کہ منظور نے بھی جو گاہے گاہے سسرال میں آیا جایا کرتا تھا اُس کی خاطر مدارات اور دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ثروت عموماً عزیز کو اُس کے پاس لے آتی۔ منظور کبھی اُسے یونیورسٹی کے جدید ترین حالات سناتا اور کبھی اُن دِنوں کا تذکرہ کرنے لگتا۔ جب پہلے پہل جمیل کی اُس سے دوستی ہوئی۔ علیم الدین کبھی جمیل کی کوئی پسندیدہ کتاب باہم مل کر پڑھنے میں اُسے مصروف کر لیتے اور بدر النساء کبھی اُس سے گھر کے بیرونی انتظامات کراتیں اور کبھی منظور کی بے رُخی اور ثروت کی غمگینی کا ذکر چھیڑ دیتیں +

لیکن ان سب حیلوں حوالوں سے جمیل کی طبیعت ٹھکانے نہ ہوئی۔ وہ دوسروں کا دل رکھنے کے لئے اُن کے ساتھ باتیں کرنے اور ہاں میں ہاں ملانے کی کوشش کرتا لیکن اُس کے دل بہلاؤ کی صورت عموماً پیدا نہ ہوسکتی +

آخر ایک دن ثروت عزیز کو لئے اُس کے پاس آئی۔ عزیز رو رہا تھا اور بڑے بڑے آنسو اُس کے پیارے چہرے پر جاری تھے۔ جمیل نے بے چینی سے پوچھا کہ کیوں میرے لال! کیوں روتے ہو؟ ثروت نے الگ ہوکر چپکے سے جمیل کے کان میں کہا کہ بھائی! بچہ کسی بات پر مچل رہا تھا کسی نالائق خادمہ نے جھنجھلا کر اُسے کہہ دیا کہ تیری امی یہاں ہوتی تو تُو یہ شرارتیں نہ کرتا۔ اسی پر وہ امی جان امی جان پکارتا میرے کمرے کی طرف دوڑ آیا +

جمیل آب دیدہ ہوگیا اور بیٹے کو گود میں اُٹھا کر کہنے لگا میرے چاند! جب تک تیری امی جان تجھے منع نہ کیا کریں جو تیرے جی میں آئے کئے جایا کر۔ کوئی اَور ڈانٹ ڈپٹ کرے تو تُو میرے پاس دوڑ آیا کر +

پھر کیا تھا؟ عزیز ذرا ذرا سی بات پر بجائے ثروت کے پاس جانے کے جمیل کے پاس اپنی پیاری پیاری تنکا بیتوں کی کہانی سنانے آجاتا اور اپنے ابّا سے مل کر اپنے بچپن کے کھیل کھیلنے لگ جاتا +

اِس طرح جمیل کے لئے اک چھوٹا سا مشغلہ پیدا ہوگیا لیکن بچے سے اوجھل ہوکر وہ اکثر غم و اندوہ میں مستغرق رہتا۔ چھ ماہ اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن ثروت حسبِ معمول عزیز کو اپنی گودی میں اُٹھائے آئی اور جمیل کے پاس بیٹھ کر کہنے لگی "بھائی! میں تم سے کچھ باتیں کرنی چاہتی ہوں + میں بچپن میں تم سے کھیلا کرتی تھی۔ اب اِس پیارے بچے سے کھیلتی ہوں۔ میں دیکھتی ہوں کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، یہ ابھی سے چشم بددور اس قدر فہیم و ذکی ہے کہ میں نے اپنی عمر میں ایسا بچہ نہیں دیکھا۔ تمہارے رنج و غم کے متعلق یہ کبھی کبھی سوال کر بیٹھتا ہے تو میں نہیں جانتی کہ اسے کیا جواب دوں؟ بھائی! اگر تمہارے غم کا ذرا سا سایہ بھی اِس پھول پر پڑ گیا تو یہ مرجھا کر رہ جائے گا۔ یہ تمہاری عذرا کی یادگار ہے یہ ہُوبہُو اُس کی تصویر ہے اور اُس کی تصویر بھی دلپذیر و بے نظیر۔ چینی کی اک مُورت عقل کا اک کھلونا سا معصومی کا اک پُتلا سا! اب تمہاری خوش دلی ضروری ہے اِس کی خوشی کے لئے!

اور بھائی دنیا میں غم کسے نہیں؟ کون ہے جس کے دل میں درد کی کسک نہیں؟ کون ہے جس کی زندگی میں رنج و محن کی آندھیاں برپا نہیں؟

بھائی میرا دُکھ تمہارے غم سے کم ہے لیکن پھر بھی دُکھ ہے اک پُرانا دُکھ دُور نہ ہونے والا +

جمیل (کانپ کر) ثروت بہن! میرے دل کی تمنا ہے کہ تمہارا پُرانا دُکھ بھی میرے حصے میں آجائے۔ جہاں اتنا بارِ غم ہے وہاں ایک اَور بھی سہی۔ مجھے تو اب غم سے محبت ہوگئی ہے۔

ثروت برلئے خدا غم سے یوں محبت نہ کرو۔

جمیل (آہ بھر کر) بہن! پھر اَور کس سے کروں؟ محبت تو محبت والی کے ساتھ گئی۔ اب میرے لئے محبت کا زمانہ ختم ہو چکا اب میری محبت فقط میرے خیالات تک محدود رہیگی! اور تمہارا دکھ! معاف کرنا آج میرے منہ میں زبان ہے۔ تمہارے دُکھ نے مجھے اور عذرا دونوں کو ملول کر رکھا تھا، آج عذرا کا اور اپنا دونوں کا ملال میرے سینے میں ہے تمہارے لئے میری بہن! خدا تمہیں اتنا ہی شاد و آباد کرے جتنا اُس نے مجھے اندوہ ناک و غمگین بنا دیا ہے +

ثروت میں ناچیز بجز اِس کے اَور کچھ نہیں کہہ سکتی کہ جو خدمت بھائی کی مجھ سے ہو سکے گی میں اُس کے لئے حاضر ہوں! بچپن کے دن گزر گئے لیکن بچپن کی یاد باقی ہے۔ عذرا چلی گئی لیکن وہ محبت جو وہ مجھ سے کیا کرتی تھی میرے پہلو میں چھوڑ گئی۔ عذرا جیتے جی میرے غموں کی غمگسار رہتی۔ مر کر اُس نے میرے لئے وہ ننھا سا تحفہ چھوڑا جو میری زندگی کی تنہا مسرت ہے +

جمیل مجھے خوشی ہے کہ عزیز کے دم سے تم بھی کچھ خوش ہو۔ عزیزے تمہاری محبت کا میں کیا صلہ دے سکتا ہوں؟ کچھ نہیں!

ثروت دے سکتے ہو بھائی دے سکتے ہو! بس یہی کہ خوش رہو اور خدا کے حکم پر شاکر! برائے خدا تم تنِ تنہا نہ رہا کرو۔ گھر میں ہو تو تمہارا اک چاند سا ٹکڑا ہے اور پھر ہم سب حاضر ہیں۔ باہر جاؤ تو ہر جا قدرتِ خداوندی کا جلوہ ہے اور خود خدا کا ہر طرف سامنا ہے! بھائی! گھر میں تنہا نہ بیٹھا کرو اِس سے کبھی کبھی باہر چلے جانا بدرجہا بہتر ہے کہ وہاں عزلت میں ایک صحبت ملتی ہے جو محبت کی پیامی ہے!

∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴

---

(۹)

جمیل خواب دیکھ رہا ہے!

باغ میں چاندنی رات ہے۔ فضا میں یہ کیفیت ہے گویا کسی نے چاندی کا بُرادہ ہر سُو بکھیر دیا ہے۔ زمین پر یہ عالم ہے گویا موسیقی عطر کا جامہ زیبِ تن کئے محوِ رقص ہے۔ اک عالیشان عمارت کا سامنا ہے، تالابوں اور آبشاروں کا سلسلہ ہے۔ اِسی نسیان وحسن کے چمن میں ایک ننھے سے جھرنے کے قریب دو کمسن ایک دوسرے کا ہاتھ سنبھالے بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں ـــــــ کہ اتنے میں ریل گاڑی شالامار کے بڑے دروازے پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ چند احباب و اقربا ایک نوجوان کو رخصت کرنے آئے ہیں . . . . ٹرین چل پڑتی ہے، چلتی ہے۔ دِ ن

گزرے جاتے ہیں لیکن وہ بدستور چلے جاتی ہے۔ نوجوان سمجھتا ہے کہ اب تک تو زمین کی ساری وسعت بھی ختم ہونے کو ہوگی، ہائے کی بار تو نے الحقیقت وہ کیسی اور کرۂ زمین کو جا رہا ہے۔ یہ سوچ کر ڈر سے کانپنے لگتا ہے ——— کہ آن کی آن میں اپنے سونے کے کمرے میں میز پر بیٹھا یہ لکھ رہا ہے:۔

"پیاری! میرے لئے تو کبھی سن رسیدہ نہ ہوگی۔ پیاری! میرے لئے تو ہمیشہ ہی نوجوان ہے، اس لئے کہ پیاری! میرے لئے تو ہمیشہ ہمیشہ اک دوشیزہ ہے! اے نیک و پاک! اے سچے دل والی! اے ہمیشہ وفادار! اے بندۂ پروردگار! تیرا حُسن تیری نیکی ہے اور تیری نیکی تیرا حسن!

جب میرا دل ابھی ایک نوخیز پودے کی طرح نرم و نازک تھا تو تیری محبت کی نسیم اُس کے چمن میں آئی اور وہ اُس کے جھولے میں جھولا۔ تجھے شاید علم نہ تھا کہ تیرا وجود میرے لئے کیا معنی رکھتا تھا؛ تجھے شاید پروانہ تھی کہ تیرے معصوم حُسن نے کسی کی دنیا کو کیونکر تہ و بالا کرنے کا سامان پیدا کر دیا؛ شاید برسوں بعد تجھے پتہ چلا کہ میں تیری خوبی و محبوبی کا دلدادہ تھا! (یہاں جی ہی جی میں اپنے سے بھی چوری چوری چاہتا ہے کہ کوئی آئے اور کسی طرح اِس لکھے ہوئے کو دیکھ پائے)

پھر میں عیش و تنعم کا دلدادہ ہو گیا اور تُو کلفت و اندوہ کا شکار! میں تیری محبت سے ناآشنا ہو گیا اور تیرے حال سے یکسر ناآگاہ!

لیکن آج بھی برسوں کے بعد" ——— یہ لکھتے لکھتے رُک جاتا ہے پھر یک لخت قلم میز پر پھینک کر کاغذ کو پرزے پرزے کر دیتا ہے اور "ہائے" کہہ کر ——— جاگ اُٹھتا ہے!

کمرے میں گھُپ اندھیرا ہے۔ گھر میں خاموشی چھائی ہے۔ باہر درخت سائیں سائیں کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی ہے!

جمیل کے روح و رواں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اُس نے ایک ایسی گہری سانس لی کہ اُس کے نظامِ عصبی کے کونے کونے میں اک برقی سا ارتعاش دوڑ گیا۔ اُس کی پیشانی عرقِ شرم سے پُرنم ہو گئی اور بڑے بڑے آنسو اُس کی آنکھوں میں بھر آئے۔

اُس وقت اُس کی حالت اُس حساس شخص کی سی تھی جو بغیر کوئی ظاہرہ گناہ کئے جی کے اندر ہی اندر اپنی لغزشوں سے یک لخت آگاہ ہو کر ساری دنیا کے آگے ہاتھ جوڑ دینے کو تیار ہو۔

بیچارا جمیل! اُسے خالق کے بنائے ہوئے اپنے مجبور و مقہور نفس پر کتنا اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنے مدفون جذبات کے اِس جبری انکشاف کا سدِ باب کر سکتا۔ بچپن کی یاد تو خیر معصوم تھی نوجوانی کا قصہ بھی کچھ ایسا مذموم نہ تھا لیکن وفادار

عذرا کی موت کے بعد شادی شدہ غم زدہ ثروت سے خواب میں بھی یہ مُخاطبت کبھی طرح روا نہ تھی + وہ نظری گناہ کا مرتکب نہ تھا لیکن اِس باب میں خیالی گناہ بھی اُس کے لئے سوہانِ روح تھا +

وہ بولا ثروت نے جو کہا درست کہا ۔ مجھے اپنے غموں میں مغموم نہ رہنا چاہئے ۔ اِن غموں نے مجھے سیدھی راہ نہیں دکھائی ۔ مجھے اب کسی اَور نامعلوم سرزمین کی طرف رُخ کرنا چاہئے جہاں کوئی ہم خیال رہنما مدت سے میرا رستہ دیکھ رہا ہے !

---

(۱۰)

دوسرے روز جمیل علی الصباح جب ثروت نماز پڑھ رہی تھی باہر لارنس باغ کی طرف اور وہاں سے شالامار کی جانب چل کھڑا ہؤا ۔ وہاں پہنچا تو عجب عالم تھا کہ سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم ، میدانی پرندے چہچہا رہے تھے ، باغبانی پھول لہلہا رہے تھے ۔ درخت جھومتے تھے اور سبزہ و گل کو چومتے تھے +

جمیل پر محویت کا اک عالم طاری ہوگیا + نہروں میں پانی کی روانی اور باغِ کہن میں درختوں کا سنّاٹا اُسے کہیں سے کہیں لے گیا ۔ وہ دنیا کے قریب تھا لیکن دنیا سے گویا کوسوں دُور ۔ وہی دن رات کے زمین و آسمان اُس کے پیشِ نظر تھے لیکن اُسے کچھ ایسا محسوس ہؤا گویا زمین پر وہ اور آسمان پر ربِ دو جہاں اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا اور کچھ کہتا ہے ۔ نہیں نہیں بلکہ اُس کی جلوہ پاشیاں عطرِ حسن بن کر زمین پر اپنی گنگا جمنی بارش کر رہی تھیں ۔ وہ پرندوں کے رنگین پروں وہ پھولوں کی نازک پنکھڑیوں وہ روشنی کی سیمین و زرّیں کرنوں میں پرتو افگن ہو رہا تھا نسیم سرگوشیاں کر رہی تھی ، چڑیاں شور مچا رہی تھیں اور پانی بھی بار بار یہ راگ اَلاپ رہا تھا کہ وہ یہاں ہے اور یہیں ہے ! جمیل نے سوچا کس قدر دلکش ہے یہ آسمان اور یہ فضا یہ زمین اور یہ سبزہ زار ، کتنے حسین ہیں یہ پھول پتے کتنی شیریں ہے پرندوں کی یہ چہکار ، پھر دنیا کیسے اپنے جادۂ منضبط پر رواں و گرداں ہے ۔ سورج کس قدر بڑا چاند کس قدر پیارا اور تارے کس قدر دور دراز ہیں + یہ منظر ہمارے پیشِ نظر ہے اور ہم وہی اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف ہیں منہمک ہیں ۔ زندگی کے بحرِ زخار میں ہمارے جسم و جان کی کشتی ڈگمگا رہی ہے لیکن چلی جاتی ہے جب تک کہ ڈوب نہیں جاتی + اور ہمارے دن رات کی خواہشوں اور کوششوں میں ہمارے روزمرہ کے حالات و واقعات میں اسباب و نتائج کا اک عجیب و غریب سلسلہ قائم ہے + یہ سب کچھ راست ہے اور راستی کی جانب رواں ہے + جمیل نے بآوازِ بلند کہا میرے رنج و محن اور میری کلفتیں بھی سب اے میرے رحیم و رحمٰن میری لغزشوں کی سزائیں اور میری ترقی کی راہیں ہیں +

وہ اِن خیالات میں محو و مستغرق تھا کہ یک لخت خدا جانے کیوں اک عجیب شوخی کے ساتھ وہ اچھل پڑا اور یکسر مسرور و شاداں ہوگیا اور بول اٹھا میرے اچھے دلبر! تُو جو کچھ کر رہا ہے میری بھلائی کے لئے۔ تو جدھر مجھے لے جا رہا ہے اسی لئے لے جاتا ہے کہ میں جلد سے جلد تجھے پالوں اور تیرے پیارے چہرے کا دیدار کروں، تیرا وہ چہرہ جو حسین و دلکش ہے تیرا وہ چہرہ جو دلپذیر و دلفریب ہے۔ ہائے تو مجھے اِس بھری دنیا سے اٹھا لے اور اپنے قدموں میں جگہ دے میرے پیارے آقا! ———

لیکن نہیں مجھ کو ابھی یہیں رہنا ہے تیرا حکم یہی ہے یہی تیری تمنا ہے مجھ سے۔ تو چاہتا ہے کہ میں اس تہ و بالا جہان میں تیرا کام کروں جب تک کہ کام میرے لئے ہو۔ میں کیوں نہ کروں گا کہ اب اِس کام کی کلفتیں بھی میری مسرتیں ہیں۔ مجھے تونے بھیجا ہے کہ بُرا بھلا جو کچھ مجھ سے بن پڑے میں کروں۔ تیری اس دنیا میں ہزاروں دُکھی ہیں میری اپنی ہی ہیچ میں صدہا غمگین و رنجیدہ بیسیوں بیچارے متکبّر و سرکش انسان ہیں جنہیں میری ہمدردی اور میری ناچیز رہنمائی کی ضرورت ہے۔ دنیا مجبورِ غم اور پامالِ فساد ہے اور میں ہوں کہ اک اپنا خودغرضی الم لئے ہوئے سر بہ گریبان ہوں۔ پیارے! میں کیا جانوں تیری خلوت میں میرے لئے کیا کچھ رکھا ہے؛ ہاں مجھے کامل یقین ہے کہ یہاں سے دُور بہت دُور رنگ و بُو کی اک پاکیزہ دنیا میں میرے بیتاب بچپن کی بھولی بھالی تمنائیں میری جوانی کی پُرجوش بے قراریاں اور میری بعد کی تباہ کن مایوسیاں اُس بچی طفلانہ مصاحبت اُس گہری پائدار محبت سے پھر دوچار ہوں گی جو میری مصیبت و ناکامی کے طوفانِ آتشیں میں سے گزر کر اب تیری حضوری کے سکون و اطمینان میں میرا انتظار کر رہی ہے۔

کس قدر کیف آور ہوگی وہ گھڑی جب اِک آسمانی فضا میں جہاں دنیا کے شور و غل کی رسائی نہیں میں عصمت و عفت کی آنکھوں سے اُس معصوم و مامون محبت کا نظارہ کروں گا جس کی کلی باغِ عالم کی مسموم ہواؤں میں پھول بننے سے پہلے ہی مرجھا جاتی ہے۔ کس قدر شیریں و رنگیں ہوگی وہ ساعت جب میری محبت اِن آنی جانی کامرانیوں سے آزاد ہو کر اُس ازلی حسن کی قوسِ قزح کے جُھولے میں جھولے گی جو کائنات کے افق پر اپنا پرتو ڈالے ہوئے ہے!

یہ سب نیہرے تحائف ہوں گے میرے لئے تو کیا اے چاند سے مکھڑے والے اے بچوں سے دل والے! تُو جو میری سچی خوشیوں کا امانت دار ہے کیا میں تیری رضا پر راضی نہیں۔ نہیں تیری خوشنودی اور تیری اُس محبت کی تمنا میں جس کے لئے برسوں سے میں سرگرداں ہوں میں اپنی زندگی کو بدل ڈالوں گا، اپنے نصب العین کو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھوں گا اور تیرے اُس جلوے سے تیری اُس صورت سے روز و شب دوچار رہوں گا جسے میں نے آج دیکھ پایا ہے۔ تُو ہے اور میرے لئے ہے جب تک کہ میں تیرے لئے ہوں۔ تو میرے سامنے ہے جب تک کہ میں تجھے دیکھتا رہوں۔ تو مجھ سے ہمکلام ہے جب تک کہ میں تجھے سنتا اور تجھ سے بولتا رہوں۔

جمیل کی اُس روز سے عجیب کیفیت ہوگئی۔ کوئی عالمِ طبیعیات کوئی ماہرِ نفسیات اُسے شاید دیوانہ کہتا مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ دیوانہ نہ تھا۔ اُسے ہر نظارے ہر شے اور ہر شخص میں ایک نور محسوس ہونے لگا۔ وہ تمام چیزوں اور تمام شخصوں میں ایک ہی رحیم و زندہ محبت کرنے والے خدائے قدیر کی شخصیت کو جاری و ساری دیکھنے لگا +

کیا یہ نہ تھی اُس پاکیزہ محبت کی تکمیل جو کبھی بچپن کے چمن میں ثروت کے معصوم حُسن کے ساتھ کھیلا کرتی تھی ؟

اُسے کسی شے سے نفرت نہ رہی اُسے ہر ایک سے محبت ہوگئی۔ وہ ہر بات کی تہ کو پہنچنا چاہتا وہ ہر کام میں قدرت کی کوئی غرض دیکھتا + بعض وقت وہ گزرتے ہوئے آدمیوں ہی کو بغور دیکھنے لگتا اور اُن کے چہروں کو استعجاب سے دیکھتا اور سبحان اللہ کہہ اٹھتا + اُس کا خیال ہوگیا کہ کوئی شخص بُرا نہیں صرف اُسے اپنی یا کسی دوسرے کی رہنمائی کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے حقیقی سود و زیاں کو سمجھ لے +

اِس انقلابِ روحانی اور اس وجدانِ قلبی کے ساتھ اُس کا کرب و اندوہ اطمینان و مسرت میں تبدیل ہوگیا +

لیکن وہ نچلا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ دِن رات اُسے یہ دُھن لگ گئی کہ کسی طرح اپنے عزیزوں اور دوستوں اور اَور بھی جتنے لوگوں کو ممکن ہو وہ دلبرِ حقیقی کا پیغامِ محبت اور سچی خوشی کا سیدھا عملی راستہ دکھا دے +

اور یہی اُس کا کام ہوگیا۔ اب وہ قلبی غم سے ناآشنا اور جسمانی کلفت سے ناآگاہ تھا۔ کیونکہ اگر کبھی (اور یہ کم اتفاق ہوتا) اُسے کوئی تکلیف یا مصیبت پڑتی بھی تو وہ یہ سمجھ کر اَور بھی مسرور و مطمئن ہوجاتا کہ یہ پیغام ہے میرے خدا کا میرے لئے + اِسی طرح اُس نے اَوروں کو قول و عمل سے نیکی و مسرت کی تعلیم دی +

ہر کوئی اُس کے علم و خلوص اور محبت و خیر طلبی سے بنہایت متاثر ہُوا۔ اور اُس کا تھوڑا بہت اثر اُن تمام اشخاص پر پڑا جن سے اُس کا واسطہ پڑا +

وہ رُوٹھے ہوئے عزیزوں کی غلط فہمیاں دور کرتا۔ غم دور دِل پر عقل و اعتقاد کا مرہم لگاتا۔ غربا و مساکین اور مدارس و مجالس کے لئے مناسب خیرات دینے کی ترغیب دیتا +

گو وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند نہ تھا اُس کے خیالات اک قسم کی گہری عبادت اور اُس کے تصورات اک نوع کی سچی معرفت تھے جن میں دِل کے اندر ہی اندر وہ روز و شب محو رہتا +

وہ تارک الدنیا نہ تھا اِس لئے عقل پسند اُس کی حقیقت بینی کو مذہبی جنون نہ کہہ سکے + وہ حریص و غرض مند نہ تھا اس لئے مذہبی لوگ اُس کی اصلاح و ترقی کی تحریکات کو حرص و ہوا سے تعبیر نہ کرسکے +

وہ عزیز جن کا اُس سے دن رات واسطہ پڑتا تھا اُس کی نیک روش سے متحیر رہ گئے + غصّے کا اُس کی طبیعت میں

شائبہ بھی نہ رہا۔ رشک و حسد سے وہ اجنبی ہوگیا۔ غرور کبھی اُس کے دل میں بھی محسوس نہ ہُوا +

اُس کی طبیعت کی کمزوریاں قوتیں ہوگئیں۔ وہ زرپرستی سے بیزار ہوگیا اور فقیروں اور نوکروں پر بھی اُس کی شفقت بھری نظریں پڑنے لگیں +

وہ بارہا اپنی گزشتہ لغزشوں کا علانیہ اعتراف کرتا تھا، اور اب بھی روزمرہ جو غلطیاں اُس سے سرزد ہوتی تھیں وہ فوراً اُن کا جی ہیں یا ضرورت ہو تو دوسروں کے سامنے اعتراف کرکے آیندہ کی اصلاح و بہبود کی طرف مائل ہوتا۔ اُس کا قول تھا کہ طُول طویل ندامتیں لاحاصل ہیں۔ اور استغفار سے ترکِ گناہ بدرجہا بہتر ہے !

اُس کی تبدیلیٔ فطرت اور تبدیل شدہ شخصیت کا سب سے نمایاں اور زبردست اثر "علیم منزل" میں رونما ہُوا +

ثروت جمیل کے اِس انقلابِ قلبی پر شروع شروع میں بہت خوش و مطمئن ہوئی لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے وہ حیران و مبہوت ہوتی گئی + کیا یہی وہ جمیل تھا جو بچپن کے دنوں میں اُس سے محوِ بازی رہتا تھا؟ جس کی نگاہیں عنفوانِ شباب کے زمانے میں برابر اُس پر جمی رہتی تھیں، جس کی پھر مدتوں اُس نے شکل بھی نہ دیکھی، جو بعد میں شاید دنیادار سا بن گیا اور اب یہ کیفیت ہے کہ اُس کی نگاہیں ہمدردی اُس کا چہرہ محبت اور اُس کی گفتگو کوئی آسمانی پیام معلوم ہوتی ہے +

اُس کی تنہائی سے کبھی اُس کا جی بھر آتا لیکن پھر اُس کو مطمئن دیکھ کر وہ اُس کا منہ تکنے لگتی کہ یہ کیسا انسان ہے جو تنہائی میں بھی یوں اطمینان رکھتا ہے +

ایک روز وہ نہ رہ سکی اور اُس سے کہنے لگی "میرے اچھے بھائی! میں تمہیں مطمئن دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتی ہوں لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ میں نے آج تک کبھی میں یہ بات نہیں دیکھی جو تمہاری بات بات میں عیاں ہے !

جمیل نے شرما کر جواب دیا: "مجھ سے کیسی عداوت سوجھی ہے کہ آج تم میری تعریف کرنے لگی ہو۔ بہن! میں اس مدح سرائی کے قابل نہیں +

ثروت نے کہا "افسوس! تم یہ کہتے ہو بھائی! اگرچہ تم خوب جانتے ہو کہ میں نے آج تک کبھی تمہاری بے جا تعریف نہیں کی لیکن اب تو میں تم کو دیکھتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ خدایا عزیزہ کے سر پر اُس کے اچھے باپ کو سلامت رکھیو +

ثروت کے دل پر تو عزیزہ کے باپ جمیل، بچپن کے ساتھی جمیل کی نیک شخصیت کا اثر ہونا ہی تھا۔ وہ کبھی اُس کے لئے خلوص سے دعا کرتی اور کبھی ایک لمبی سرد آہ بھرتی جس کی حسرت کے خدا جانے کیا معنی تھے۔ وہ تو روز بروز جمیل کی تعریف میں رطب اللسان ہوتی رہی لیکن تعجب یہ تھا کہ منظور بھی آہستہ آہستہ اُس کا حلقہ بگوش ہوتا گیا +

منظور جو کبھی سالوں ہوئے گورنمنٹ کالج میں جمیل کا سب سے گہرا دوست تھا ثروت سے شادی کرنے کے بعد جمیل

سے بالکل بے اعتنائی برتنے لگا اور یہ بے توجہی روز بروز بڑھتی گئی یہاں تک کہ آپس میں وہ بول چال کے روادار بھی نہ رہے لیکن عذرا کی موت کے بعد جمیل کے غم واندوہ سے کس پتھر کا دل تھا کہ موم نہ ہو جاتا۔ اور پھر اُس کے روحانی انقلاب کے بعد منظور پر بھی ثروت کا نفسی اثر پڑا۔ وہ گویا اک سورج تھا جس کے آگے نشاط وہوس کی تاریکیاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکیں۔ وہ گویا اک برقی قوت تھا جو آن کی آن میں دیکھنے والے کی روح وروان میں سرایت کر گئی +

ایک روز جمیل نے منظور سے کہا "بھائی! مجھے معاف کرنا میں نے اک مدت تک تمہاری دوستی کا حق ادا نہ کیا۔ تم مجھ سے روٹھ گئے اور میں نے تم کو منایا تک بھی نہیں" +

منظور کی پیشانی پر پسینہ آگیا اور اُس نے جواب دیا "جمیل! کیا کہتے ہو؟ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہو؟ معافی تو مجھے مانگنی چاہیئے نہ کہ تم کو۔ تم نے مجھے اِس گھر کی راہ دکھائی اور میں نے تمہارا رستہ نہ دیکھا + بھائی! آؤ پھر دوست اور بھائی بھائی بن جائیں۔ تم زندگی کی پیچیدگیوں میں میری کلیدِ مراد بنو + جمیل! میرے پیارے بھائی! تم نے مجھ سے معافی مانگ کر میری زندگی کی تنہا مسرت مجھ سے چھین لی + تمہیں معلوم نہیں کہ میں تمہیں دیکھ دیکھ کر کتنا نادم ہوتا رہا ہوں۔ آج تم نے خود موقع دیا کہ میں اپنے تئیں تمہارے سپرد کر دوں + جب سے تم یہاں آئے ہو میں اپنی زندگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگا ہوں" +

جمیل نے کہا "ہرچند میں تمہاری عنایات کے قابل نہیں ہوں لیکن تمہاری دوستی اب پھر میرے دل میں موجزن ہے۔ البتہ اس پر ایک تاریک بادل چھایا ہؤا ہے جو سچ پوچھو تو تمہاری ساری زندگی کو بھی تیرہ و تار کر رہا ہے + منظور کیا یہ ثروت کا قصور ہے کہ اُس کے ہاں ابھی تک بچہ پیدا نہیں ہؤا۔ اُس کی بدقسمتی پر تمہاری بے اعتنائی! آہ! تمہارے نزدیک یہ کیونکر روا ہو سکتی ہے؟ + کہتے ہیں مغرب میں عورت سرکش ہے تو کیا یہاں مرد ظالم وجابر نہیں؟ پھر جب خدا و انسان دونوں ہی عورت کے خلاف سازش کریں تو اُس بیچاری کی خبر لینے والا اُس کے ساتھ انصاف کرنے والا کون ہو؟ بھائی! عذرا جب تک زندہ رہی مجھ میں اُس میں سچی محبت قائم رہی میں نے مقدور بھر اُس کی دلجوئی کی پھر بھی جب سے وہ مجھے اِس دنیا میں تنہا چھوڑ گئی ہے دن میں بیسیوں بار میں اپنے تئیں ملامت کرتا ہوں کہ حیف ہے مجھ پر فلاں روز میں نے اُسے یہ کیوں کہا اور اُس کے لئے وہ کیوں نہ کیا! منظور خدا گواہ ہے کہ میری زندگی کی دلی تمنا یہ ہے کہ تم دونوں کو دوبارہ متحد اور باہم گروابستہ دیکھوں +

منظور نے کہا بھائی! میں اس درخواست سے پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا ہوں لیکن جو ستم ثروت پر میں آج تک ڈھا چکا ہوں اُس عذاب دہی کی تلافی اب کیسے کروں؟

جمیل بولا: ۔ پچھلے گناہوں کو آئندہ نیکیاں ہمیشہ دھو ڈالتی ہیں۔ اور محبت کو تو پچھلے گلے شکوے بھول جانے کی خاص

عادت ہے۔ میرے اچھے بھائی! اپنے چاند کی چاندنی کو اپنے دل میں بس جانے دو۔ اس زندگی کے دن تھوڑے ہیں۔ یہ راتیں گئی پھر واپس نہ آئیں گی!

اُسی رات منظور ثروت کے کمرے میں گیا۔ ثروت حیران ہوگئی کہ آج اس غیر معمولی وقت پر آنے کے کیا معنی ہیں؟

ثروت خیر تو ہے؟

منظور میری پیاری ثروت میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔

ثروت کاہے کی؟

منظور اپنی عمر بھر کی بے پروائیوں کی۔

ثروت (آنکھوں میں آنسو بھر کر) کبھی مرد بھی عورت سے معافی مانگتے ہیں؛ معافی تو صرف بیچاری عورت کے لئے بنی ہے آخر وہ کیا وجہ ہوئی کہ آج تم مجھ بدبخت کے پاس آگئے؟

منظور اب جمیل پہلے کی طرح میرا دوست ہے اور تم پہلے کی طرح میری رفیقِ زندگی۔ پیاری ثروت! کیا تم مجھے معاف نہ کرو گی؟

ثروت میں تو پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ مرد بھی قصور کرے تو معافی ہمیشہ عورت ہی مانگتی ہے + لیکن منظور تم نے سب کچھ سوچ لیا ہے؛ میرے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ کیا تم یہ بھول گئے؟

منظور بیوی رفیقِ زندگی ہوتی ہے محض تولیدی کل نہیں ہوتی۔

ثروت حضور کہیں سے آج بہت سی عقل سیکھ کے آئے ہیں یہ کیا ماجرا ہے؟

منظور یہ سب جمیل کی عنایات ہیں ہم پر۔

ثروت (آہ بھر کر۔ کچھ توقف کے بعد) اب تم پھر مجھے وہی پرانے منظور معلوم ہوتے ہو۔ میں تو وہی بدقسمت ثروت ہوں مگر ہوں تمہاری بیوی جو تم سے مرتے دم تک وابستہ رہے گی!

منظور نے ثروت کو گلے سے لگا لیا اور دیر تک میاں بیوی میں محبت کی باتیں ہوتی رہیں +

ثروت کے لئے یہ رات شبِ برات سے کم نہ تھی۔ مصیبت کے دھوآں دھار بادلوں میں سے چاند نے پھر اپنی جھلک دکھائی تھی۔ اُس کا کھویا ہوا موتی پھر اُسے مل گیا تھا +

جب منظور چلا گیا تو ثروت کا دل جمیل کے لئے اک اُداس شکرگزاری کے جذبۂ الفت سے لبریز ہوگیا۔ نمگین خوشی کے آنسو اُس کی آنکھوں میں ڈبڈبانے لگے +

جمیل نے جو بچپن میں ناکام محبت تھا جس نے عین شباب میں دستِ اجل کا صدمہ سہا اُس نے اب اپنی زندگی کی تنہائی میں بچھڑے ہوئے دلوں کی باہمی مصالحت و قُربت کا سامان پیدا کر دیا +

جمیل کے لئے ثروت کی خانگی مسرت خوشی کا باعث ہوئی لیکن جمیل کو دنیا کی کونسی خوشی حاصل تھی جس سے ثروت مسرور و مطمئن ہوتی +

---

(۱۱)

اِس کے دس ماہ بعد ثروت کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام جمیل کے کہنے پر نکہت رکھا گیا +

جمیل کی دعا سُنی گئی۔ ثروت کا ایثار درگاہِ حق میں قبول ہوُا۔ منظور کا استغفار پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا !

اس کے دو ماہ بعد جمیل سخت بیمار ہو گیا اور ایک ہفتہ کے اندر اندر راہئ ملکِ عدم ہوُا +

---

(۱۲)

تیرہ سال بعد کا واقعہ ہے !

وہی تیرھویں کا چاند آسمان پر جلوہ گر تھا۔ وہی تارے کہیں کہیں ٹمٹما رہے تھے۔ اُسی طرح کچھ ننھی ننھی بدلیاں فضا میں منڈلا رہی تھیں + شالامار کے وسطی خطے میں آبشار و چادرِ آب کا زور اور فواروں کے ٹپکتے ہوئے پانیوں کا یہ شور تھا کہ ساون بھادوں کے قریب کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی !

فضا میں اک جانفزا خاموشی کا عالم طاری تھا۔ باغ میں اک دلکش شورش کے شادیانے بج رہے تھے + ایک نوجوان اور ایک حسین دوشیزہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے آخری خطۂ باغ میں آبجو کے کنارے کنارے محوِ گلگشت تھے :

نوجوان نے کہا "میری پیاری تُو باغِ حیات میں میرے دل کے پھول کی نکہت ہے" !

حسینہ نے کہا۔ "میرے عزیز تُو دنیا بھر میں مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے" !

ثروت نے اِک چنبیلی کے پودے کی آڑ میں یہ شیریں گفتگو سُن پائی۔ پہلے وہ ذرا مُسکرائی پھر کچھ آبدیدہ ہوئی لیکن آخر مسرت کی اک برقی رو اُس کے روح و رواں میں دوڑ گئی +

اِس کے چار سال بعد عزیز و نکہت کی شادی ہو گئی +

یہ تھی تکمیلِ محبت !

بشیر احمد

درسِ توکّل

تجھے کیا فکر ہے اے دل، تجھے کس بات کا کھٹکا
خدا کا نام لے، اُٹھ اور سرگرمِ سفر ہو جا
اگر دشوار ہے منزل تو ہونے دے، نہ تو گھبرا
نہیں زادِ سفر ممکن، نہ ہو اس کی نہ کر پروا
خُدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

تذبذب تا بکے اب شانِ استقلال پیدا کر
تلاشِ رہبرِ منزل نہ کر، خود اپنا بن رہبر
بھروسا رکھ خدا پر اور اپنے دست و بازو پر
تجھے کیا غم، اگر کوئی نہیں ہے ہم سفر تیرا
خُدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

یہ مانا راستہ پُرخار ہے اور دُور ہے منزل
نئی افتاد ہے ہر ہر قدم پر اور نئی مشکل
مگر صدقِ طلب کے روبرو اوہام ہیں باطل
کوئی سنگِ گراں رستہ میں حائل ہو نہیں سکتا
خُدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

نہ کر کچھ فکرِ تنہائی، نہ گھبرا شامِ غربت سے
ہر اک منظر نظر کش ہے زیادہ صبحِ جنت سے
مبدّل ہو گا یہ رنجِ سفر اک روز راحت سے
یقیناً کامیابی کا بندھے گا تیرے سر سہرا
خدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

بس اب عزمِ سفر کر بے نیازِ این و آں ہو کر
قدم آگے بڑھا اپنا تو میرِ کارواں ہو کر
لگا دے راہ پر سب کو عناں گیرِ جہاں ہو کر
بتا دے بے تکلف سب کو یہ گُر کامیابی کا
خُدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

ابوالفضل آزرؔ چاندپوری

تصویرِ وفا

(۱)

ہرمز نے اپنے سامنے والی دوشیزہ سے اک ذرا نظر ملائی تھی کہ اس کا منچلا دل اس کی سرور آفرین نظروں میں ہچکولے لینے لگا۔

اپنی بے اختیار سانس کو بہ ہزار دشواری قابو میں کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "آہ تم نے! تم نے بڑی محبت کا ثبوت دیا ــــــ بڑا ایثار برتا۔ اور پھر یہ سب کچھ میرے لئے! ــــــ تمہاری محبت کے صدقے۔ بڑا احسان کیا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر بفرضِ محال تم خسرو کو منظور کر لیتیں؟ ــــــ وہ اپنے باپ کے سارے کاروبار اور جائداد پر عنقریب بلا شرکتِ غیرے پورا اختیار حاصل کرلے گا۔ پھر خیال تو کرو تم کتنے بڑے مالدار کی بیوی ہوتیں"۔

"مگر مجھے مالدار بننے کی کبھی تمنا ہی نہیں ہوئی۔ ہرمز! میں تو اپنی زندگی کے دامن کو نمائشی اطمینان و آسائش سے بچا کر مسرتِ حقیقی کی گلکاریوں سے مزین دیکھنا چاہتی ہوں جو تم ہی انصاف سے کہو کتنی متبرک اور انمول شے ہے ــــــ اور پھر بھلا اس شخص سے جس سے مجھے کوئی اُنسیت ہی نہ ہو اپنی قسمت وابستہ کرنے کے بعد کسی خوشی کا وہم و گمان ہونا میری نادانی نہ ہوتی؟ ــــــ لیکن سچ کہنا۔ تمہیں میری جان کی قسم کیا واقعی تم کو مجھ سے محبت ہے؟"

وہ یہ کہہ کر مسکرادی ــــــ اس ادا سے جس میں شاعرانہ مبالغہ سے برطرف واقعی ایسا معلوم ہوا کہ صدہا بجلیاں کوند گئیں۔ کتنے ہی موقعے ایسے گزر چکے تھے کہ اس نے یہ سوال محض اس لالچ اور تمنا سے کیا تھا کہ وہ اس کا حسبِ دلخواہ جواب ایک بار پھر اُسی زبان سے سُن لے جو اس کی ساری آرزوؤں اور ارمانوں کا حاصل تھا ــــــ کہنے کے ساتھ ہی وہ شرمائی لجائی ایک دلفریب ادا کے ساتھ سامنے والی میز پر جھکی اور الھڑپن کی لاپروائی سے اپنا نازک مرمریں ہاتھ پھیلا دیا۔ اس کی سبک اُنگلی میں ایک خوشنما ہیرے کی نئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

مذہبی اصُول پر آج صبح ہی ان کی شادی ہوئی تھی ــــــ وہ شادی جواب تک صیغۂ راز میں تھی اور ہر طرح خفیہ طور پر عمل میں لائی گئی تھی۔ دونوں نو آموزِ الفت۔ نوعمر۔ بیس بائیس کا سن۔ ناتجربہ کار۔ دنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف ــــــ مگر رشتۂ محبت میں اس طرح جکڑے ہوئے کہ کوئی دنیاوی ہستی ان کو جدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔

خفیہ شادی کا لازمی نتیجہ لڑکی والوں کی ناخوشی کا اظہار تھا۔ لڑکا حقیقتاً خوشحال نہ تھا۔ کہنے کو وہ اپنے آپ کو فوٹو گرافر

مصور۔ سب ہی کچھ کہتا اور مہینے میں پچاس ساٹھ اس ذریعہ سے کما بھی لیتا مگر وہ خود اس کے ذاتی مصارف کے لئے کافی نہ ہوتے تھے چہ جائیکہ اب ایک اور شریک زندگی کے اخراجات!۔ ظاہرا کوئی صورت اضافۂ آمدنی کی بھی نہ معلوم ہوتی تھی۔

لڑکی کا باپ! شہر کا بڑا سوداگر مسلمہ رئیس۔ وہ اور اس کے گھر والے روپے کی قیمت اور اس کے اصراف کے طریقوں سے بخوبی واقف تھے۔ دوشیزہ باخود بے حد حسین تھی۔ نازک اندام۔ چھریرہ جسم۔ لمبے لمبے سیاہ بال۔ بتبسی۔ جیسے مخملی ڈبیا میں سچے موتیوں کی دو قطاریں۔ بڑی بڑی۔ سیاہ پلکوں والی مخمور آنکھیں۔ گلابی کاغذی ہونٹ۔ غرض یہ کہ اس کی شباب آفرین ہستی کسی کی آغوش تمنا سے ہم کنار ہونے کی تلاش سے مستغنی تھی۔ سینکڑوں تھے جو ہر دم اس پر پروانہ وار نثار ہونے کو تیار تھے اور سینکڑوں ایسے بھی تھے جو اس کی ایک ادائے تبسم پر نقد دل۔ نقد جان۔ سب ہی کچھ قربان کرنے پر آمادہ تھے۔ مثالاً مذکرہ بالا خدّو کو لیجئے۔ وہ واقعی اس کی محبت میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کے والدین بھی اُس کو سر آنکھوں پر لیتے ——— مگر لڑکی!۔ محبت کی دیوی۔ محبت کی پجاری۔ اور محبت ہی کی بھوکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ سب طرف سے آنکھیں موند کر اس نے ایک غریب نادار مصور کو محض محبت کے نشہ سے بے خود ہو کر اپنا سرمایۂ حیات سپرد کر دیا اور ہمیشہ کے لئے کر دیا۔ گو عام اصطلاح میں مشہور بھی ہوا کہ وہ اس کے ساتھ "بھاگ" گئی۔

اس طرح یہ دونوں ناتجربہ کار ہستیاں اپنا اسباب وغیرہ لپیٹے شام کی گاڑی سے کہیں باہر چلے جانے کو تیار تھے یا یوں کہئے کہ اپنے لئے تخلیقِ مصائب کا سامان پیدا کرنے میں "اپنی کلہاڑی اپنا پاؤں" کا مصداق کر رہے تھے۔ مگر پھر بھی ان کے دل ہمت افزا۔ ان کی پیشانیاں خندہ تھیں۔ محض اس لئے کہ ان کی ہر حرکت اور ارادے میں خلوص اور محبت کی نورانی شمع روشن تھی۔

ایک غیر معروف ہوٹل کے گوشہ والی میز کے سامنے دونوں بیٹھے تھے۔ دو ایک پلیٹوں میں معمولی طور پر جو کچھ سامان رکھا تھا وہی ان کی برات کا کھانا تھا۔ اور لڑکی کے ہاتھ کی انگوٹھی ان کا سارا جہیز۔

دوشیزہ نے اک حیا آموز ادا کے ساتھ کہا۔ "ہرمز! تم جانتے ہو۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں اس وقت دنیا کی ساری عورتوں میں غالباً سب سے زیادہ خوش نصیب اور مسرور ہوں۔ مجھے اپنی کامیابی پر بجا ناز ہے"۔

ہرمز۔ "عزیز ترین تہمینہ! تم انشاءاللہ ہمیشہ یوں ہی شاد رہو گی ——— مگر مجھے ڈر ہے کہ وہ . . . . وہ لوگ مجھے تم سے جدا کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے"۔

تہمینہ۔ اوئی کون؟

ہرمز۔ کون! تمہارے والد۔ تمہاری . . . .

تہمینہ۔ (سر ہلا کر) وہ اپنی کوششوں کو بے سُود پا کر خود ہی بیٹھ رہینگے ——— تم دیکھنا خدا نے چاہا تو وہ مجھے تم سے ہرگز علیحدہ نہ کر سکیں گے۔

ہرمز۔ پھر بھی ایک قسم کی لڑائی تو جاری رہے گی۔

تہمینہ۔ رہے! مگر میں تو تمہاری مدد کے لئے ہر دم سایہ کی طرح ساتھ ہوں۔ ہرمز! تم کو قدرت نے غیر معمولی ذوقِ مصوری ودیعت کیا ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ تم اس دور میں ایک نہ ایک دن مصوری کا درخشندہ ستارہ بن کر چمکو گے اور خدا نے چاہا تو ضرور چمکو گے۔ اس وقت کے لئے۔ اس ساعت کو قریب تر لانے کے لئے۔ بس۔ میری تمام کوششیں۔ میری تمام دعائیں تمہاری کامیابی کے لئے وقف ہونگی۔

ہرمز۔ پیاری تہمینہ . . . . (جوشِ مسرت میں اسکی آنکھیں ڈبڈبا آئیں)

دونوں وہاں سے اُٹھ کر اس کمرہ کی طرف چل دیئے جو انہوں نے شبِ عروسی گزارنے کے لئے کرایہ پر حاصل کر لیا تھا اور جو ہر عروسانہ آرائش سے بے نیاز تھا۔ دروازہ پر پہنچتے ہی ان کو معلوم ہؤا کہ ان کے انتظار میں کوئی اندر بیٹھا ہؤا ہے۔ باہر موٹر کھڑا تھا۔ دوشیزہ نے پہچان لیا ——— موٹر اس کے گھر کا تھا۔

تہمینہ۔ انہیں ہمارا پتہ چل گیا۔ ہرمز! شاید والد صاحب آئے ہیں۔

ہرمز۔ بر سرِ تقدیر . . . . میں تیار ہوں۔ (اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں)۔

کمرہ کے اندر قدم رکھتے ہی ان کو معلوم ہؤا کہ آنے والا تہمینہ کا باپ نہیں ——— بلکہ ماں تھی۔

"مجھے دیر تو نہیں ہوگئی؟" تہمینہ کی ماں کا پہلا اور گھبرایا ہؤا بے ساختہ سوال تھا۔

تہمینہ۔ اماں جان! ہم لوگوں کو جدا کرنے کے لئے واقعی اب وقت ہاتھ سے جاتا رہا ——— میں ہرمز کی ہو چکی۔

تہمینہ کی ماں کی نظروں میں بجلی سی کوند گئی۔ بدن میں ایک سنسنی ایک رعشہ محسوس ہؤا۔ لیکن اس نے انتہائے ضبط کو کام میں لا کر ایک گہری ٹھنڈی سانس لی اور کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئی۔ اس کے چہرہ سے انتشار اور ہیجان بیّن طور پر نمایاں ہونے لگا۔ اس نے تہمینہ کی طرف ایک بار جھٹکے سے مڑ کر کہا۔ "میں تمہارا خط پاتے ہی تمہاری تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ میں نے تم کو ایک بار ٹیلیفون پر اس ہوٹل کا نام لیتے سنا تھا ——— دکھاؤ تمہاری شادی کا سرٹیفکیٹ کہاں ہے؟"

ہرمز نے اپنی جیب سے سرٹیفکیٹ نکال کر خاموشی کے ساتھ بڑھا دیا جس پر تہمینہ کی ماں نے سرسری سی نظر ڈال کر ہی واپس کر دیا اور بولی۔ "تم جانتے ہو! میری تہمینہ ابھی بیس کی بھی پوری نہیں ہوئی ہے"۔

ہرمز۔ "جی ہاں ——— سچ پوچھیئے تو میرا بھی ابھی اکیسواں ہی سال شروع ہے۔ مگر ہم دونوں محبت کا عہد و پیمان کر

چکے ہیں اور آپ سے بصد التجا درخواست کرتے ہیں کہ برائے خدا ہم کو جدا کرنے کی کوششوں سے درگزر یئے۔

تہمینہ کی ماں۔ "سمجھ لو! تمہارے خلاف چارہ جوئی ہو سکتی ہے۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ قانوناً تمہاری شادی ناجائز قرار پاسکتی ہے یا نہیں مگر۔۔۔۔۔۔۔ اس کے باپ نے تو طے کر لیا ہے کہ وہ اب اس کی شکل نہ دیکھیں گے۔ تم نے اس کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ تم محبت کا دعوےٰ کرتے ہو مگر میری لڑکی کو اس حال پر پہنچانے میں مجھے تمہاری محبت اور الفت کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔ اس نے اب تک آرام و آسایش کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ ناز و نعم میں پرورش پائی ہے۔ لیکن اب تو ظاہری اسباب اس کے لئے بجز فاقہ کشی اور کچھ نظر نہیں آتے۔

ہرمز۔ جی نہیں۔ خدا نے چاہا تو ایسی نوبت ہرگز نہ آنے پائے گی۔ میں اس کے لئے۔۔۔۔۔۔۔

تہمینہ کی ماں۔ بس بس! اپنی فضول گوئیوں سے میرا وقت خراب نہ کرو۔ میں جس غرض سے آئی ہوں اس کی تکمیل کے بعد جلد سے جلد واپس جانا چاہتی ہوں۔ تہمینہ کے باپ نے لڑکی سے ہاتھ دھو لیا۔ ان کا خیال ہے کہ تم دونوں نے ان کو بڑا صدمہ پہنچایا اور زبردست فریب دیا۔ آئندہ کے لئے تم خود مختار ہو۔ تم پچتاؤ گے ——— دیکھنا تم دونوں آخر کار پچتاؤ گے۔ مگر تہمینہ کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ آج سے اس کے لئے میرے گھر کے دروازے بالکل بند ہو گئے۔ اب وہ تاحیات اس مکان میں واپس نہیں جا سکتی۔ اس نے جو کچھ کیا۔ اب بھگتے۔ ہم نے جس محبت سے پرورش کیا جس محنت سے تعلیم دی۔ اور جس شفقت سے پالا پوسا اس کا صلہ خوب مل گیا۔ اس ناشدنی نے اپنی آبرو دو کوڑی کی کر لی۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ ہاں۔ ایک غریب مصور کے ساتھ شادی کر کے ہماری عزت خاک میں ملا دی +

ہرمز۔ محترمہ! میں شاید ہمیشہ مفلس نہ رہوں گا۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔۔

تہمینہ کی ماں۔ مجھے اپنی لڑکی کی خاطر شاید یہی دعا کرنی پڑے گی کہ تم مفلس قلاش نہ رہو۔ تم پر جو کچھ بھی افتاد پڑے۔ تمہاری جو کچھ بھی خانہ خرابی ہو۔ مگر تم اب میرے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ میں تم دونوں کو اس کا پورا یقین دلا دوں ——— رہی میں۔ گو میں دکھیا۔ بدنصیب اور بے غیرت ہوں مگر پھر بھی تم دونوں کے ساتھ آخری سلوک کئے جاتی ہوں (اپنے بٹوے سے نوٹ نکال کر) لو تہمینہ۔ یہ تین ہزار کے نوٹ ہیں۔ تمہارے باپ کو ان کا علم نہیں مگر میں۔۔۔۔۔۔۔۔

تہمینہ نے اپنا سر ہلا کر نوٹ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بولی۔ "اماں جان! مجھے ان کی ضرورت نہیں ——— آپ کی دعا چاہئے"۔

ماں۔ نادان لڑکی! دیکھ ہوش میں آجا۔ تجھ کو ان کی ضرورت پڑے گی۔ اور پھر پڑے گی ——— تو ابھی دنیاداری

سے ناواقف ہے۔

تہمینہ پھر بھی مغرورانہ انداز سے ہرمز کے پاس کھڑی رہی اور استغنا کے ساتھ بولی "مجھے اُن کی ضرورت ہرگز نہ ہوگی۔ میں نے ہرمز کے ساتھ شادی اس لئے کی ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ اس کا مستقبل خواہ روشن ہو یا تاریک مگر میرے دل کی تسکین اور جان کا آرام ثابت ہوگا۔ گو یہ امر میرے لئے ایک مستقل صدمہ بن جائیگا کہ میرے قدیمی گھر کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے لئے بند کردیئے گئے۔ اور میں آپ یا ابّا جان کو اب کبھی نہ دیکھ سکوں گی —— مگر خیر! —— میرا دل یوں مطمئن رہے گا کہ مجھے اپنے خاوند سے محبت ہے۔ آپ کا روپیہ لینا اس کی صریحی توہین ہی نہیں بلکہ اس کی محبت پر غیر اعتمادی کا اظہار ہوگا اس لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہوں —— اور فقط اسی لئے انکار کرتی ہوں"۔

تہمینہ کی ماں نے طیش میں ایک بار "اچھا" کہا اور دروازہ کی طرف بڑھ گئی —— مگر قبل اس کے کہ وہ قدم باہر رکھ سکے تہمینہ نے سامنے آکر بے تکلف اس کے گلے میں دونوں ہاتھ ڈال دیئے اور گلوگیر آواز میں بولی "اماں جان ...... بددعا کی بجائے مجھے ایک آخری پیار دیتی جایئے .... اور اماں .... وعدہ کیجئے ..... کہ آپ مجھے دعائے خیر سے اسی طرح یاد رکھیں گی جس طرح ہر شب کو سوتے وقت میرا آخری کام آپ کی یاد اور آپ کا تصوّر ہؤا کرے گا .... اور .... اور اماں .... کبھی کبھی مجھے یاد ضرور کرلیا کیجئے گا ..... کیونکہ .... پھر بھی میں آپ کی ...... اولاد ہی تو ہوں"۔

بہت ممکن تھا کہ کسی معمولی سے معمولی سبب کے تحت میں اگر عزیزوں رشتہ داروں میں اس کی رسوائی ہوتی یا دوست آشناؤں کے دائروں میں سُبکی ہوتی تو تہمینہ کی ماں اس کو تاحیات درگزر کرنے کا وہم بھی نہ کرتی مگر یہاں اب سوال 'ماں کی محبت' کا آگیا تھا۔ بھلا کیسے ہوسکتا تھا کہ اس کی اکلوتی جوان لڑکی یوں جوشِ محبت میں اس کے گلے سے لگی، آنکھوں میں آنسو بھرے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے اس کو بھینچ بھینچ کر ہمیشہ کے لئے رخصت کررہی ہو اور پھر اس کا دل نہ مانے؟۔ آخر وہی ہؤا جو اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ تہمینہ کی ماں جوشِ اُلفت سے بیتاب ہوگئی۔ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کو بے تابانہ چپٹالیا اور اسی وجدانِ بےخودی میں ایک نہیں بلکہ بے شمار پیاروں کی بوچھاڑ اس کے رخسار، اس کی پیشانی، اس کے ہونٹوں اور شانوں پر کردی۔ پھر ایک بار محبت آمیز نظریں ہرمز پر ڈال کر بولی "ہرمز! دیکھو اس نے محبت کی خاطر بڑا زبردست ایثار کیا ہے۔ اس نے اپنے سارے موجودہ عیش و راحت اور شاندار مستقبل کو قربان کیا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرو"۔

شاید یہ الفاظ ہرمز کے دل پر گہرا اثر کرگئے۔ کیونکہ تہمینہ کی ماں کے چلے جانے پر اس نے تہمینہ کو اپنی آغوش میں لے لیا اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ اور آواز بے قابو۔ "میں اس کا اہل ثابت ہوں گا —— تہمینہ ..... میں ضرور ہونگا۔"

تم نے میری محبت میں جو کچھ قربانیاں کی ہیں ان کے عوض اگر میں کبھی عدمِ التفات یا عدمِ توجہ کا مرتکب ہوں تو ـــــــ خدائے برتر مجھے سزا دے۔ میں جانتا ہوں کہ میں تمہارے قابل نہ تھا۔ اور تو کچھ نہیں مگر ہاں اس وقت یہ ضرور کہتا ہوں کہ مجھ سے جس قدر محنت۔ مشقت ہو سکی ......"

تہمینہ نے شوخی سے اپنا نازک ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ کر کچھ آگے کہنے سے روک دیا اور بولی۔ "ہرمز۔ بس بس۔ ہوش کی باتیں کرو۔ میں خدا کی قسم بالکل مطمئن ہوں ـــــــ اور بے حد خوش بھی۔"

---

(۲)

بیس سال کے بعد!

یہی محبت کے نام پر جینے والا جوڑا۔ ایک خوش نما۔ خوش وضع۔ اور خوش آراستہ فوٹوگرافی کی دوکان میں حسد آفرین انداز سے کھڑا تھا۔ عورت چالیس برس کی عمر پر پہنچنے کے بعد بھی خوبصورت ضرور کہی جا سکتی تھی۔ مگر اس کے ماتھے پر خفیف جھریوں کی نمود رخساروں کی سرخی میں زردی کی جھلک۔ اور آنکھوں کے گرد سیاہی مائل حلقے اس کے دل کی افسردگی اور قلبی اضطراب و انتشار کی شہادت دیتے تھے۔

ہرمز کو اپنے فن میں بالآخر کامیابی نصیب ہوئی۔ گو شادی کے بعد ابتدائً پورے بارہ سال بے حد صبر آزما ثابت ہوئے لیکن تہمینہ نے کبھی دامنِ صبر و استقلال ہاتھوں سے نہ چھوڑا۔ بیشتر موقعے ایسے آئے کہ دو دو فاقوں کی نوبت پہنچ گئی۔ مگر اس نے ہرمز کے سامنے کبھی حرفِ شکایت منہ پر نہ آنے دیا۔ محض اس خیال سے کہ اس کے لئے زندگی کی کشاکش پہیم زیادہ دشوار اور صبر کوش تھی۔ اسلئے جو کچھ روکھا سوکھا ممکن ہوتا وہ ہر طرح ضد اور خوشامد کر کے اس کے پیٹ میں ڈلوا دینا فرضِ اولین جانتی تھی۔ اس صورت میں شہرت و ثروت کی پرانی خوش خیالیاں قصۂ پارینہ یا محض خواب و خیال بن کر رہ گئی تھیں۔

اس دور میں ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ وہ بے تکلف اپنے گھر واپس جا سکتی تھی۔ مگر تہمینہ کی محبت۔ تہمینہ کے خلوص۔ اور تہمینہ کے استقلال کو کبھی لغزش نہ ہونے پائی۔ اس کو اپنی محبت کا دعوےٰ اور اس کا پاس ہر دم ملحوظ رہتا۔ اس کا وجود ایک ہستی کی راحت و مصیبت۔ خوشی اور رنج۔ اچھے برے کا شریک بن چکا تھا اب خواہ اس کو روکھی سوکھی ملے یا مرغن لذیذ کھانے۔ پھٹے چیتھڑے ملیں یا زربفت کی بیش قیمت ساڑیاں۔ خانہ بدوشی نصیب ہو یا سر بفلک محلات۔ مگر ہر حال میں اُس کے دوش بدوش رہنا۔ خوش رہنا اور رکھنا ـــــــ یہی اس کی مستقل دماغی کاوش تھی اور یہی اس کی زندگی کا غیر فانی آسرا۔

چار برس بعد ایک خوبصورت سا بچہ بھی پیدا ہؤا۔ مگر تہمینہ کی مغموم فضا اور پے در پے فاقہ کشیوں نے اس کو پروان چڑھنے نہ دیا۔ اپنی پرورش کے ذرائع مسدود دیکھ کر اس نے بھی چند مہینوں کے بعد ہی ساتھ چھوڑ دیا جس کا قلق تہمینہ کے لئے ایک ناقابلِ برداشت صدمہ بن گیا۔

چھٹے برس خدا خدا کر کے کایا پلٹی۔ قسمت نے کروٹ لی۔ سوتے نصیب جاگے۔ دن دونے رات چوگنے۔ ہر مہینہ دوسرے مہینے سے غنیمت اور ہر سال دوسرے سال سے بہتر گذرنے لگا۔ اور چودہ برس بعد تو وہ اچھے خاصے روپے والے ہو گئے۔ اعلیٰ درجہ کی دوکان۔ موٹر۔ نوکر چاکر۔ ساز سامان سب ہی کچھ ہو گیا ـــــ لیکن اب ایک اندرونی خلش ایسی بھی پیدا ہو گئی جس سے نامراد تہمینہ اپنے گذشتہ ایام سے مغموم تر نظر آنے لگی۔ ہرمز بہت سے غیر مآل اندیش خاوندوں کی طرح اس کی طرف سے غفلت اور عدمِ توجہ کا مرتکب ہونے لگا تھا۔

ہرمز کی عمر چالیس اکتالیس کی کسی طرح نہ جچتی تھی۔ اس کے چہرہ پر اب بھی لڑکپن کی سی شوخی۔ لبوں پر شباب آفرین تبسم اور بالوں میں جوانی کی سی چمکدار سیاہی برقرار تھی۔

تہمینہ نے تھوڑی بہت نگرانی شروع کی تو اس کا نتیجہ ہرمز کے دل میں اس کی طرف سے مزید نفرت کی تخلیق نکلا۔ تہمینہ کے شباب میں جوانی۔ اور جوانی میں عمر کا پختہ پن ٹپکنے لگا۔ اس کا سراپا حسن۔ اس کے ہونٹوں کا تبسم اور اس کی آنکھوں کا خمار رفتہ رفتہ کافور ہونے لگا۔ اب وہ حسین نہ رہی ـــــ لیکن ہرمز کو کبھی اس کا احساس بھی نہ ہؤا کہ درپردہ یہ سب اسی کی تغافل شعاریوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اسی کی کم نگاہیوں کی نذر ہو گئے۔ اور اب تو اس کی آنکھوں نے خود وہ منظر دیکھ لیا تھا جس سے رہی سہی امیدوں پر بالکل ہی پانی پھر گیا۔

تھیٹر کی ایک حسن فروش رقاصہ کو فنِ مصوری کا نمائشی شوق پیدا ہؤا۔ ہرمز استاد بنا اور وہ شاگرد! گو بعد میں ہرمز ہی کو اس کی جناب میں زانوئے حواس تہ کرنا پڑا۔ ۲۳ کا سن۔ بلا کی شوخ اور حسین۔ جس کو خود ہرمز "ساحرہ" کہا کرتا۔ رفتہ رفتہ اِن دونوں کے تعلقات کا چرچا ہر گلی کوچے میں عام ہؤا تو تہمینہ بھی ناواقف نہ رہی۔

مصوری کے تاریک کمرہ میں ایک دِن دونوں پاس پاس بیٹھے تصویر بنانے میں مشغول تھے۔ اتفاقاً ـــــ بلکہ کہنا تو یہی چاہئے کہ قصداً، ساحرہ نے اپنی ساری کو ایک بار اس انداز سے جھٹکا دیا کہ اس کے مرمریں شانے۔ گردن۔ اور سینہ کا معقول حصّہ بے پردہ ہو گیا۔ جس پر تاریک کمرہ میں موم بتی کی خفیف مگر لطیف روشنی نے ایک خاص نورانی جاذبیت کا اضافہ کر دیا۔ اس نظارہ سوز جلوے کا لازمی نتیجہ ہرمز میں مقتضیاتِ فطرت کے غیر معصوم ولولوں کا بھڑک اٹھنا تھا۔ چنانچہ اس نے پہلو بدل کر ایک غیر اختیاری جوش میں اس کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا "ساحرہ! مجھے تمہاری محبت دیوانہ بنا کر چھوڑے گی"۔

عین اسی لمحہ میں دروازہ کھلا اور تہمینہ ——— اس کی بیوی اندر داخل ہوئی۔

تہمینہ نے سب کچھ دیکھا اور سنا۔ مگر پھر بھی وہ خاموش رہی اور نہایت متانت کے ساتھ آگے بڑھ کر ساحرہ سے بولی "اجازت دیجئے۔ مجھے اپنے خاوند سے تنہائی میں کچھ گفتگو کرنا ہے"۔

ساحرہ جس وقت کمرے سے باہر جانے لگی۔ تہمینہ نے دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پر پُرغرور تبسّم کھیل رہا تھا۔

میاں بیوی میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ہرمز آخر کار اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دبا کر آرام کرسی پر آلیٹا اور بولا "تہمینہ! میں جانتا ہوں کہ میں نا عاقبت اندیشی سے کام لے رہا ہوں ——— مگر کیا کروں مجھے اس سے محبت ہے۔ میں ......"

تہمینہ۔ میں جانتی ہوں کہ تم کو اس سے محبت ہے۔ اور اب تو یہ ایک کھلا ہوا راز ہے۔ میں کیا۔ اس کو دنیا جانتی ہے۔ ہر شخص کی زبان پر یہی تذکرہ ہے اور مجھے بس اسی کا زیادہ ملال ہے .... ہرمز۔ مجھے تم سے ہمیشہ محبت رہی ہے

ہرمز۔" میں جانتا ہوں۔ اور مجھے یہی خیال پریشان رکھتا ہے۔ میں اتنا بُرا بھی نہیں جتنا تم خیال کرتی ہو۔ مگر اس کو کیا کروں کہ مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔ صبر نہیں ہوتا .... میرے دل پر گہری چوٹ آئی ہے"۔

تہمینہ۔ اچھا سچ بتاؤ۔ کیا واقعی تم کو اس سے محبت ہے؟ سچی محبت! کیا تم اپنے وقتی ولولوں کو ایسے مستقل جذبات سے موسوم کر سکتے ہو جو کسی خاص میعاد کے پابند نہ ہوں گے؟

ہرمز۔ ہاں ایسی ہی ہے۔ میں اس کو دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا ہوں۔ اس کا ایک نظارہ میری رگوں میں حشرِ تلاطم برپا کر دیتا ہے ...... محض ایک نظارہ!

تہمینہ۔ "لیکن یہی تو تم مجھ سے بھی کہا کرتے ...." تہمینہ وفورِ غم سے جملہ پورا نہ کرسکی اور خاموش ہوگئی۔ اس کے پہلو ئے تخیّل میں وہ زمانہ کروٹیں بدلنے لگا جبکہ یہی ہرمز اس کو اپنی زندگی کا آسرا۔ اپنی جانِ تمنا کہا کرتا تھا۔ اس کو اس کا بھی احساس ہونے لگا کہ اس کی وجہ سے کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کیں۔ بدنامیاں سہیں۔ گھر چھوڑا۔ والدین کو خیرباد کہی۔ اور پھر اچھے بُرے ہر حال میں صبر و شکر کے ساتھ گزاری ——— مگر اب اس کا نازک دل اس کی بے وفائی اور بے توجہی کا شکار ہو کر ٹوٹ گیا۔ مردہ ہوگیا۔

ہرمز۔" میں نے تم سے دل کا حال صاف صاف کہہ دیا۔ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ فریب نہیں دیتا۔ مجھے اس سے واقعی محبت ہے ——— اور بُری طرح ......"

"تو تم مجھے چھوڑ دو گے؟"۔

تہمینہ نے یہ سوال نہایت اطمینان۔ متانت اور بھولے پن سے کیا تھا جس کے بعد ہی ہرمز کھڑا ہو کر کمرہ میں آہستہ

آہستہ ٹہلنے لگا اور بولا "میں نے ابھی کوئی ایسا فیصلہ تو نہیں کیا ہے"۔

تہمینہ - لیکن ہرمز، تم کو شاید ایسا کرنا پڑے گا۔ کوئی نہ کوئی بندوبست تو کرنا ہی ہوگا۔ اس طرح کب تک گزارو گے۔ تمہارا دعوے ہے کہ تم کو اس سے محبت ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ میری محبت تمہارے دل سے فنا ہو چکی ——— کیوں سچ ہے نا؟

یہ کہہ کر وہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ مگر ہرمز کی نگاہیں اس کی طرف اٹھنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا مجرم ضمیر کم از کم اس موقعہ پر اس سے نگاہیں دوچار نہ کر سکے گا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا چہرہ فرطِ غم سے زرد پڑ گیا ہوگا۔ اور وہ یہ بھی یقینی سمجھتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان اُمنڈا ہوا ہوگا۔ حالانکہ وہ ہر ممکن ہمت کا ثبوت دے کر ابھی تک اپنی آواز کی شیرینی کو قائم رکھے ہوئے تھی۔

ہرمز پر حقیقتاً اس وقت گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ واقعی شرمندہ اور منفعل نظر آتا تھا۔ لیکن اس کی نفس پرستیاں۔ اسکے ولولوں کی کشمکش اس کو ہر طرح ناعاقبت اندیشی کے ارتکاب کی رغبت دے رہی تھیں۔ آخر کار ایک بار ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ "تہمینہ! مجھے افسوس ہے ——— اے خدا مجھے افسوس ہے"۔

تہمینہ - وہ تم سے کہے گی کہ مجھے کہیں دور لے چلو ——— وہ یہ بھی کہے گی کہ یا تو تم میرے ہو کر رہو یا اُس کے ——— اور شاید تم کو اس کا کہا ماننا پڑے۔ بہرحال جیسا کہ میں کہہ چکی موجودہ حالت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی ——— مگر ہرمز! میں تم کو چھوڑ نہیں سکتی۔ میں کیا کروں۔ میرا دل نہ مانے گا۔ مجھ سے یہ ہرگز نہ ہوگا۔

ہرمز نے ایک بار اس کو کنکھیوں سے دیکھا اور بولا۔ "تو تم . . . . "۔

تہمینہ - مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ میرے دل میں تمہاری محبت اب تک اسی طرح محفوظ ہے اور انشاءاللہ مرتے دم تک رہے گی۔ تمہارا خیال ہی دمِ واپسیں کا ہم نفس ہوگا ——— اب تم ہی بتاؤ میں تم کو کس طرح چھوڑ سکتی ہوں۔ تم میرے بچے کے باپ . . . . . . بس مجھے یہی کہنا تھا۔ قطع نظر ان تمام باتوں کے میں پھر ٹھنڈے دل سے تم کو کامل آزادی کا حق دیتی ہوں۔ تمہارا جو جی چاہے۔ کرو۔ میں جانتی ہوں کہ نہ میں اب حسین ہوں اور نہ نوجوان۔ مگر میری چشمِ محبت زمانۂ شباب کی طرح تم کو اب بھی اسی ندیدی اور پُرشوق نظروں سے تکتی ہے۔ میرا دل اب بھی اسی طرح تمہاری محبت کا خزینہ بنا ہوا ہے۔ مسٹر ہرمز! میں جاتی ہوں۔ آپ کو کچھ کہنا تو نہیں ہے"۔ پاس والے کمرہ سے ساحرہ کی شیریں آواز میں یہ الفاظ سنائی دیئے۔

تہمینہ نے اپنا رُخ پھیرا اور دروازہ کی طرف بڑھ گئی۔ ہرمز نے ایک بار "تہمینہ" کہا بھی مگر اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور باطمینان بولی۔ "بس! تم کو ہم دونوں میں سے انتخاب کرنا ضروری اور لابدی ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے۔

اس نے انتخاب کیا ——— تہمینہ خوب جانتی تھی کہ اس کا انتخاب کیا ہو گا۔

آخر کار ایک ایسا منحوس دِن آیا کہ تہمینہ کی نمناک آنکھوں اور مغموم دل کو میدانِ صبر و رضا میں اس لئے سینہ سپر ہونا پڑا کہ اس کا خاوند ایک دوسری عورت کو لے کر فرار ہو گیا۔ لیکن اللہ ری وفا آموز ہستی! اس حال میں بھی اس نے اپنے رات اور دِن محض اس کے لئے دعائے صحت۔ دعائے عافیت اور اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو ایک نہ ایک دِن اس کی واپسی کی ڈھارس دینے میں وقف کر دیئے۔ اسکا ایمان تھا کہ اس کی محبت چونکہ پہلی ہے اس لئے آخری بھی یقیناً ثابت ہو گی۔

---

(۳)

ہرمز چلا گیا ——— اور تہمینہ کو اس کا منہ پھر پندرہ سال تک دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ پہلے تو ہر مہینے پابندی کے ساتھ کچھ نہ کچھ خرچ بھیجتا رہا مگر بعد کو وہ بھی بند ہو گیا۔ تہمینہ نے اس کے خلاف نان نفقہ کے لئے کوئی چارہ جوئی نہ کی۔ روپیہ کی طرف سے وہ یوں مستغنی تھی کہ اس کی ماں نے مرتے وقت وصیت نامہ میں اس کے لئے کثیر رقم چھوڑی تھی۔

شدہ شدہ یہ خبر ملی کہ ہرمز کی بُری طرح گزر رہی ہے۔ شراب کی لت نے بیکار بنا کر آمدنی کے ذرائع مسدود کر دیئے۔ عورت زندگی کی رفیق ثابت نہ ہوئی۔ ابتداء میں ہر دم قیمتی لباس۔ لذیذ کھانے۔ سیر تماشے یا اور اسی طرح کی مختلف فرمائشوں اور فضول خرچیوں کا طومار باندھتی رہی۔ آرام میں ساتھ دیا مگر وقت پڑے پر نکل بھاگی۔

پھر ——— کامل پندرہ برس کے بعد۔ ہزاروں میل کے فاصلے سے۔ ایک بے ترتیب اور کانپتے ہاتھ کی یہ تحریر موصول ہوئی:-

> پیاری تہمینہ!
>
> خدا کے لئے جلد آؤ۔ میں مرتا ہوں لیکن مرنے سے پہلے اگر.....
>
> تمہاری دید کی حسرت پوری نہ ہوئی۔ تو شاید میری روح تاقیامت مضطرب و پریشان رہیگی۔
>
> ہرمز

تہمینہ گئی ——— اور اب ایک بوسیدہ۔ غلیظ سے کمرہ میں تھی جہاں کی عفونت اور گندگی دیکھ کر اس کو نفرت ہی نہیں بلکہ گونہ عبرت بھی ہوئی۔ اس کا شوہر ہرمز ایک ٹوٹی سی چارپائی پر پڑا تھا۔ بیمار۔ لاغر۔ دھان پان۔ چہرہ ستا ہوا۔ ہڈیاں نکلی ہوئیں۔ آنکھیں گڑی ہوئیں۔ کھانسی کی زیادتی دم نہ لینے دیتی تھی۔

تہمینہ کی پہلی ہی نظر میں بے ساختہ چیخ نکل گئی ہوتی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہ نکلا ہوتا۔ مگر اس نے

قصداً، مصلحتاً اپنے آپ کو بہت روکا سنبھالا۔

وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اور اس کا موہ بے رونق ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ہرمز باتیں کرتا رہا :۔

"اس ظالم۔ سفاک کو گئے ہوئے کئی مہینے گزر گئے۔ بڑی مطلب پرست۔ خود غرض۔ دنیا ساز عورت تھی۔ جب تک روپیہ رہا۔ آمدنی رہی۔ خوش رہی۔ جب ذرا اس طرف سے کمی دیکھی لگی جا و بیجا پریشان کرنے۔ شراب نے میرے ہاتھوں میں رعشہ پیدا کر دیا اس لئے رہا سہا سلسلہ بھی جاتا رہا۔ نہ مصوری رہی نہ فوٹوگرافی پھر تو میدان صاف دیکھ کر وہ بھی نکل بھاگی تہمینہ ـــــ میں سمجھتا تھا کہ تم کو ان سب واقعات کی اطلاع ہو گی"۔

تہمینہ۔ نہیں ہرمز۔ مجھے کیا معلوم؟ میں تو اُس دن سے دنیا و مافیہا سے بے تعلق ہو کر ایک ویران گوشہ میں جا پڑی تھی۔ سب سے ملنا جلنا۔ راہ و رسم یک لخت بند کر دیئے تھے۔

سچ پوچھئے تو اس میں شک بھی نہ تھا کہ ہرمز کے جانے کے بعد وہ مجبوراً ایک غیر معروف قصبہ میں چلی گئی تھی۔ رشتہ داروں کے طعن و تشنیع۔ دوست احباب کی چہ میگوئیاں اس کے دل کے زخموں پر نشتر کا کام کرتی تھیں۔ وہ پریشان ہو کر موت کی طالب ہوتی۔ اور گود پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگتی۔ کہ کسی طرح یہ زمین شق ہو اور وہ اس میں سما جائے تا کہ اس ندامت اور بدنامی سے ہمیشہ کے لئے پیچھا چھٹ جائے۔

ہرمز۔ خدایا! اس عورت کے دام میں پھنسنا!۔ آہ۔ میری کتنی بڑی نادانی تھی۔ اور پھر تم ایسی فرشتہ خصلت وفادار خاتون کو چھوڑ کر۔ نہیں بلکہ تمہارا دل توڑ کر۔ مجھے ...."

تہمینہ۔ "ہائیں۔ ہائیں۔ ہرمز۔ تم خدا کے لئے اس وقت ان خیالات سے اپنا دماغ پریشان نہ کرو۔ ہم ...."

ہرمز۔ تہمینہ! میں نے اس عرصہ میں کئی بار ارادہ کیا کہ تمہارے پاس لوٹ جاؤں۔ مگر میری نداموں نے کسی طرح گوارا نہ کیا۔ یہی سوچ کر کہ اتنے بڑے جرم کے ارتکاب کے بعد میں بھلا تم کو کیونکر دوبارہ منہ دکھا سکتا ہوں۔

تہمینہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس نے اس کا بھی اقرار نہ کیا کہ اتنے عرصہ تک وہ محض ایک ہی امید پر زندہ رہی ہے۔ بس ایک نہ ایک دن اس کی واپسی کی اُمید پر۔ جس کے بے چین انتظار میں گو لاکھ اس کی آنکھیں پتھرائیں۔ دل بیٹھا۔ ارمان و حسرت مبدل بہ یاس و حرمان ہوئے مگر لوٹ پھیر کر وہی آسرا دل کو ڈھارس دیئے رہتا اور اسی وقت کا خیالی منظر آنکھوں کو وا رکھتا۔

ہرمز۔ شادی کے دن میں نے تم سے کہا تھا۔ پیاری تہمینہ شاید تم کو یاد بھی ہو کہ اگر میں کبھی تم کو تکلیف پہنچاؤں یا تم سے تغافل برتوں تو خدائے برتر مجھے سزا دے۔ مجھ سے بچھے۔ آہ۔ میں نے تم کو رنج پہنچایا۔ دیدہ دانستہ ایذا دی۔ میرا کہا سامنے آیا اب یقیناً خدا کا قوی ہاتھ مجھ سے تمہارا بدلہ لے رہا ہے۔ میں اس حالت کو پہنچ گیا ہوں۔ اور خدا جانے میری شمع حیات اس ٹمٹماتی حالت میں

کب گل ہوجائے۔ تہمینہ تم مجھے معاف کرنا۔ تہمینہ میری خطاؤں کو معاف ....

تہمینہ۔ ہرمز۔ پیارے ہرمز........ میرے وفادار ہرمز۔" اب باوجود تمام کوششوں کے اس میں یارائے ضبط نہ رہا۔ وہ بے قرار ہوکر رونے لگی۔ پٹی کے پاس ننگی زمین پر دوزانو ہو کر اس نے اس کا سر دونوں ہاتھوں سے سرکایا اور اپنے سینہ سے لگا لیا۔ " ہرمز! میرا خدا بڑا رحم والا ہے۔ جس نے تم کو پندرہ برس بعد مجھ کو واپس دیا وہ اب یوں جدا نہ ہونے دیگا۔ ہرمز۔ میں یہاں رہ کر تمہاری خدمت کروں گی۔ علاج کراؤں گی۔ اور جب خدا نے کیا تمہاری طبیعت ذرا ٹھیری تو میں گھر لے چلوں گی پھر وہاں پہنچ کر تبدیل آب و ہوا۔ معقول علاج۔ میری خدمات اور دعائیں تم کو صحت یاب کرنے میں جلد کامیاب ہوں گی اور انشاء اللہ ضرور ہونگی"

ہرمز کے چہرہ پر ایک رونق سی پیدا ہوگئی۔ اس کا دل ان امید افزا اقراروں اور وعدوں سے بلیوں اُچھلنے لگا۔ وہ دل جس میں مدت ہوئی کہ کسی امید کے وجود۔ قیام یا تخلیق کی گنجایش باقی نہ رہی تھی۔ اس نے ایک بار نظر گھما کر متجسس انداز سے دیکھا اور پوچھا "تہمینہ! کیا تم واقعی میری خطائیں معاف کردوگی؟"

تہمینہ۔ بیشک! مجھے ہمیشہ تمہاری خوشی مدنظر رہی۔ میں نے عمر بھر یہی کیا۔ اور اب بھی مرتے دم تک اسی طرح تمہاری خوشی اور خدمت میرا فرض اولین رہیگا۔

ہرمز۔ مگر پندرہ برس........

تہمینہ۔ آہ میں برابر تمہاری واپسی کا آسرا تکتی رہی۔ اس کے بعد شاید اس وجہ سے کہ وہ بیمار اور کمزور تھا۔ یا شاید اس وجہ سے کہ وہ افسردہ دل اور مغموم تھا۔ بہرحال ہرمز بیقرار ہوکر زار و قطار رونے لگا ——— کچھ دیر بعد اس نے کہا "آہ تہمینہ! میں تمہاری عنایتوں کا مستحق نہیں اور سچ پوچھو تو میں اس قابل بھی نہیں کہ تمہاری خاک پا اٹھا سکوں ——— افسوس یہ ہے کہ اب اپنی مختصر سی بقیہ زندگی میں میں اس کا عوض کیونکر ادا کرسکوں گا۔ خدا سے میری التجا ہے کہ مجھے تھوڑی زندگی محض تمہاری خدمت اور آرام پہنچانے کے لئے اور عطا فرمائے"۔

تہمینہ۔ تمہاری صحت میری دوبارہ زندگی ہوگی۔ تم کو خدا اچھا کردے۔ پھر ہم تم دونوں اطمینان اور عیش کی زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

الماری کے تختے پر موم بتی جل کر پھیل گئی۔ آس پاس والے مکانوں سے بچوں کی چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ مگر تہمینہ اسی طرح بغیر پہلو بدلے ہرمز کا سر اپنے ہاتھوں میں لئے "تصویر وفا" بنی خاموش بیٹھی رہی۔ حتٰے کہ وہ سوگیا اور بیہوشی میں خراٹے لینے لگا۔

ہرمز کے آرام سے سونے کا ہر ممکن انتظام کردینے کے بعد تہمینہ اُٹھی اور جوش غم میں اس کی پٹی کے قریب ہی سربسجود ہو کر اپنے مالکِ حقیقی کی جناب میں رجوع ہوگئی گو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری تھا، ہچکیوں کے باعث سانس بے قابو تھی۔ مگر اس کی زبان شکستہ اور پُر درد الفاظ میں یوں وقفِ دعا تھی:۔

" بارِ الٰہا! اِن کو اچھا کردے۔ تاکہ میں پھر ایک مرتبہ ان کی کیف نواز نظروں میں اپنے دل کے ارمان اور ولولوں کو پھلتا پھولتا دیکھ لوں"۔

دیوانہ (بریلوی)

باغ کی رانی

بھیگی بھیگی سرد ہوائیں اُودی اور گھنگور گھٹائیں برکھا رُت کی نئی ادائیں مستی بن کر دل پر چھائیں
پتا پتا ڈالی ڈالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

برس پڑا جو کوئی بادل عالم ہوگیا دم میں جل تھل دُھل گئی شاخیں پھوٹی کونپل بول اُٹھا ہے منہ سے جنگل
بھیگی بھیگی سب ہریالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

سبزہ لہکا، جنگل مہکا کوئل کوکی، مور جھنکارا جنت بن گئی باغ کی دنیا مست ہُوا ہے پتا پتا
جھُوم رہی ہے ڈالی ڈالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

گاتی ہے ملہار جوانی جھول رہی ہے باغ کی رانی سر پر ایک دوپٹہ دھانی ساون شرم سے پانی پانی
موہنی مُورت بھولی بھالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

کچھی ہوئی کیا جھولے پر ہے بال کھُلے ہیں ننگے سر ہے آنچل سرکا، کس کو خبر ہے ہاتھ لپیٹے رسی پر ہے
رُخ پر زلفیں کالی کالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

جھولے پر کیوں مست ہوئی ہے؟ بے خود ہو کر جھول رہی ہے! خوشیوں میں تو کھوئی گئی ہے! اپنا آپا بھُول رہی ہے
تُو ہے اک تصویر خیالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

بالے پن کی پاک اُمنگیں نئی جوانی، نئی ترنگیں دیکھنا! تجھ کو مست نہ کردیں میری ہمت پست نہ کردیں
جیت اِس رُت پر تُو نے پالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

ہند کی دُلہن ہوش میں آجا آجا بالی جوش میں آجا عالمِ اُلفت کوش میں آجا خاضف کے آغوش میں آجا
ترے لئے آغوش ہے خالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

خاضف ملانوی

ابنِ آدم

اپنے لمحاتِ تنہائی میں

روس کے مشہور مصلح میکسم گورکی کی ڈائری کا ایک ورق

آج شام میں دریائے نوآ کے کنارے کھڑا ایک لطیف منظر کی سیر میں مصروف تھا کہ میں نے ایک حسین وجمیل خاتون کو پُل پر بے خودانہ انداز میں کھڑے دیکھا یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ قیودِ حیات سے تنگ آکر دریا میں چھلانگ مارنا چاہتی ہے پھر یکایک میں نے دیکھا کہ اس نے اپنا سر آسمان کی طرف اُٹھایا اور اپنی گلابی سی زبان نکال کر چاند کا منہ چڑانا شروع کردیا۔

مہتاب دبے پاؤں دود شال بادلوں میں سے آہستہ آہستہ گذر رہا تھا غالباً چودھویں رات تھی کیونکہ سیلِ نور غیر معمولی طور پر طلا نگار تھا۔ ہوائیں تعطر و خوشبو کی لہریں موج زن تھیں۔ اور اس عالمِ رنگ و بُو میں خاک کا ایک پیکرِ جمیل آسمانی حسن کا مضحکہ اُڑا رہا تھا۔ اس نظارے نے کئی اور واقعات کی یاد تازہ کردی عجیب اتفاق ہے کہ جب کبھی میں کسی کو تنہائی میں دیکھتا ہوں تو وہ اس قسم کی حرکات میں مشغول ہوتا ہے جن سے میرے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوجاتا ہے کہ شاید شخص موصوف مخبوط الحواس ہے۔

بچپن میں مَیں نے ایک ایکٹر کو دیکھا۔ آپ آئینے کے سامنے کھڑے تھے اور بار بار اپنی ٹوپی اُتار کر اپنے عکس کے آگے ایک نہایت سنجیدہ انداز میں جھک رہے تھے۔

اس کے بعد میں نے اپنے دوست چیکاف (مشہور افسانہ نویس) کو ایک شاعرانہ مشغلے میں مصروف دیکھا۔ آپ ایک باغ میں بیٹھے ہوئے تھے سورج کی زرنگار شعاعیں عین آپ کے سامنے گلاب کے ایک چھوٹے سے پودے پر پڑ رہی تھیں اور آپ کوشش کر رہے تھے کہ ان امواجِ نور کو کسی طرح اپنی ٹوپی میں مقید کرکے سر پر رکھ لیں میں دیکھ رہا تھا کہ یہ ناکام کوشش ان کے ذہن میں اضطراب اور غصے کا ایک تلاطم پیدا کر رہی تھی۔ ان کے چہرے کی سُرخی ان کی حرکات کی نامعقولیت اور ان کا اُٹھکر اضطراری طور پر ٹہلنا شروع کردینا سب اس حقیقت کی مظہر تھیں۔ یہی حضرت تھے جن کو تھوڑے عرصے کے بعد میں نے ایک تنگ بوتل میں ایک نہایت موٹی پنسل داخل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا نتیجہ ظاہر ہے۔ وہ سائنس کا ایک اصول توڑنے میں کامیاب نہ ہوسکے اور بوتل ٹوٹ گئی۔

ایک بار میں نے ٹالسٹائی کو دیکھا۔ قریب ہی ایک گرگٹ دُھوپ سینک رہا تھا اور آپ ایک اندازِ شفقت میں جھکے ہوئے

اسے مخاطب کر کے زیرِ لب کہہ رہے تھے "کیوں دوست خوش تو ہو؟" یہ کہہ کر آپ نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر رازدارانہ سے انداز میں فرمایا "میں تو خوش نہیں ہوں"۔

ایک بار میرے ہاں روسی ادب کے ایک پروفیسر مہمان تھے باتیں کرتے کرتے آپ کی نگاہ آئینے کی طرف جا پڑی۔ اُس وقت تو خاموش ہو گئے لیکن بعد میں جب وہ اپنے آپ کو تنہا خیال کرتے تھے میں نے انہیں چھپ کر دیکھا کہ اپنے عکس سے کہہ رہے ہیں "میرے یار کہو تو زمانے نے تم سے کیسا سلوک کیا؟"

کہا جاتا ہے کہ ایک بار کسی شخص نے مشکاف کو عالمِ تنہائی میں دیکھا۔ آپ کے سامنے ایک طشتری رکھی ہوئی تھی جس میں تھوڑی سی روئی پڑی تھی۔ آپ روئی کو اُٹھا کر زور سے طشتری پر مارتے تھے اور فوراً جھک جاتے تھے۔ گویا روئی کی آواز سننا چاہتے ہیں۔

مشہور پادری ویلڈمرسکی نے ایک بار ایک کشتی اپنے سامنے رکھ لی۔ اور کہنے لگے "ذرا چل کر تو دیکھ"۔

جب کشتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو آپ فرمانے لگے "دیکھا۔ جب تک میری مددشاملِ حال نہ ہو تو چل ہی نہیں سکتی"۔

میری نگاہ سے اکثر اس قسم کے واقعات گزرے ہیں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان بعض اوقات تنہائی میں بے اختیار رونے یا ہنسنے لگتا ہے۔ ایک مشہور مصنف تنہائی میں ہمیشہ رو دیا کرتا تھا +

قارئین کرام پر واضح رہے کہ مصنف موصوف شراب کا عادی نہ تھا لیکن میری نظر میں 'خندہ' یا 'گریہ' مخبوط الحواسی کی نشانی نہیں۔ یہ دو چیزیں توازنِ دماغی کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اور ہر بالغ نظر شخص پر اس قسم کی کیفیات طاری ہوتی رہتی ہیں۔

ایک رات کا واقعہ ہے کہ میں بستر پر لیٹا ہؤا گناہ کی اضافی حیثیت کے متعلق سوچ رہا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور میرا ایک ہمسایہ (ایک نہایت معزز زمیندار) داخل ہؤا۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہنا ہؤا تھا۔ غالباً وہ غلطی سے میرے کمرے کو اپنا کمرہ سمجھ کر اندر چلا آیا تھا۔ کمرے میں کوئی لمپ وغیرہ موجود نہ تھا۔ لیکن چاندنی موجود تھی۔ میں چُپ چاپ لیٹا اس کی حرکات کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس نے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اپنے آپ سے باتیں شروع کر دیں۔

خود ہی کہنے لگا "کون ہے؟"

خود ہی جواب دیا "میں ہوں"۔

"یہ تمہارا کمرہ نہیں ہے؟"

"میں معافی کا خواستگار ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اور میری الماری میں سے ایک کتاب نکال کر میز پر رکھ دی۔ پھر کھڑکی میں سے بازار کی طرف جھانکا۔ پھر بولا" اس وقت روشنی ہے۔ لیکن دن کو کس قدر تاریکی تھی۔ توبہ"۔

یہ کہتے ہوئے وہ پنجوں کے بل دبے پاؤں دروازے کی طرف چل دیا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اکثر بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی کتاب اِن کے ہاتھ میں دے دی جائے تو تصویریں پھاڑنی شروع کر دیتے ہیں۔ اور خاصکر کسی ایک صفحے پر کوئی تصویر ہوتی ہے تو یہ خیال کرتے ہیں کہ تصویر اور صفحہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ تصویر اُتر آئے اور صفحہ نہ پھٹے۔

یہی کام کرتے ہوئے میں نے ایک پروفیسر کو دیکھا۔ آپ کوشش کر رہے تھے کہ ایک صفحے پر سے تصویر کو اُتار کر اپنے جیب میں ڈال لیں۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ آپ نے خوب زور سے تصویر کو رگڑا۔ پھر کسی شے کو ہاتھ میں تھام کر اپنی جیب کی طرف لے گئے۔ پھر یکایک غور سے اس شے کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اور غالباً انہیں احساس ہوا کہ تصویر کا کوئی حِصّہ ہاتھ نہیں آیا۔ کیونکہ آپ کے ماتھے پر شکن پڑ گئے۔ اور آپ پھر تصویر کو رگڑنے میں مصروف ہو گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے کتاب مذکور دیکھی۔ تمام تصاویر کاغذ پر چھپی ہوئی تھیں۔ کوئی تصویر بھی ایسی نہ تھی جو کاغذ پر چپکی ہوئی ہو۔ اور آپ سائنس کے پروفیسر تھے۔

ایک بار میں نے ایک معزز میونسپل کمشنر کی بیوی کو دیکھا کہ اپنے سامنے مٹھائی کا ایک ڈبا رکھ کے بیٹھی ہوئی ہے۔ اور ایک ایک دانے کو اُٹھا کر نہایت اطمینان سے کہہ رہی ہے۔" میں تمہیں کھا جاؤں گی"۔

سیّد عابد علی

اپنی عظمت کے کرشمے دکھاتا ہوا ربِّ دوجہاں عجیب و غریب رستوں پر چلتا ہے وہ اپنے قدم سمندر میں رکھتا ہے اور طوفانوں میں سے گزرتا ہے۔

تمہارے ساتھ جو لوگ رہتے ہوں کبھی اُن سے زیادہ عقلمند اور عالم ہونے کا دعوٰے نہ کرو۔ اپنی قابلیت کو اک گھڑی کی طرح اپنی پوشیدہ جیب میں رکھو اور اُسے بار بار باہر نہ نکالو۔ یہ دکھانے کے لئے کہ تمہارے پاس گھڑی ہے۔ اگر تم سے پوچھا جائے کہ کیا وقت ہے تو بتا دو لیکن ہر گھنٹے بغیر پوچھے ایک چوکیدار کی طرح اعلان کرنے کی ضرورت نہیں!

بشیر احمد بیگم

خدمتِ محبوب

لوگ کہتے ہیں تجھے دنیا میں ہوس میں منہمک
کیا خبر ہے اُن کو دل میرا ہے تجھ سے منسلک؟

وہ سمجھتے ہیں میں ہوں شیدائے جاہ و مرتبت
کیا خبر ہے اُن کو اُلفت ہی کا ہے میری منزلت؟

منتہائے زیست ہے اُن کی نظر میں سیم و زر
میری آنکھوں میں ہے سیم و زر تری اِک اِک نظر

میرا جاہ و عیش میری زندگی پر بار ہے
میری خوشیوں کے وطن میں خواہشِ ایثار ہے

وقف ہے اے دل تُو اپنی ہی مسرت کیلئے
زندگی تجھ کو ملی اَوروں کی خدمت کیلئے

زندگی اِک خواب ہے اِس خواب سے بیدار ہو
راہِ حق میں جان دینے کے لئے تیار ہو

رہنمائے زندگی ہے عشق اب تیرے لئے
منتہائے زندگی ہے عشق اب تیرے لئے

دل کو اپنے عشق کے شعلے سے کر دے تُو گداز
تا تری جاں میں ہوں پیدا قوتِ عجز و نیاز

خودشناسی کا مرقع زندگانی ہو تری
روح ایثار و عمل سے آسمانی ہو تری

سب کی خدمت کر اسی میں خدمتِ محبوب ہے
سب سے اُلفت کر جو دل میں اُلفتِ محبوب ہے

کام وہ کر جس سے ہو دلبر کو تیرے تجھ پہ ناز
مُرتعش ہو تیری لَے سے خود بخود اُلفت کا ساز

ا ب

ماہِ صیام میں

اماں! جب تو مجھے سحری کے وقت جگاتی ہے تو میں نفرت سے بھر جاتی ہوں مگر تجھے کیا معلوم کہ میرے اس تنفر کا راز کیا ہے؟

اماں! جب تو مجھے نرمی سے آواز دیتی ہے تو میں کروٹ بدل کر سو رہتی ہوں۔ تو اس لئے مجھ پر جھنجھلاتی ہے۔ مگر میں پھر بھی نہیں اٹھتی کیونکہ اُس وقت میری روح تھوڑے سے سکون کی جویا ہوتی ہے!

اماں! آدھی رات کو، عین اس وقت جب ہماری جھونپڑی کے عقب میں "پپیہا" بولنے لگتا ہے اور جب تو ہوشیار کرنے کے لئے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہے تو تجھے نہیں معلوم کہ میں بڑی لجاجت کے ساتھ تجھ سے "ایک لمحہ" اور سونے کی مُہلت کیوں مانگتی ہوں!

کاش! تو آپ ہی سمجھ لیتی کہ اس وقت صحرا کا یہ ننھا مطرب میٹھے سُروں میں شور مچا کر حق کی تلاش کرتا ہے اور میں اسے چپ چاپ ہو کر سُنتی ہوں!!

پیاری اماں! ماہِ مبارک میں! نیم شب کے درمیان جب تو مجھ کو نیند سے اُٹھانا چاہتی ہے تو تُو کیا جانے کہ اس وقت میرے آئینۂ دل پر کس کی تصویر مرتسم ہوتی ہے!

اچھی اماں! مجھے گھُور گھُور کر نہ دیکھ۔ ہائے شاید تو یہ یقین نہیں مانتی کہ جب میں معصومیت کے گہر میں سوئی ہوئی ہوتی ہوں تو میرے دل کی منہ بند کلی پر خدائے قدوس کا خیال شبنم بن کر ٹپکا کرتا ہے!!

اماں! میں تیرے پاؤں لگوں گی مجھے راتوں کو نیند میں بے کل نہ کیا کر۔ آہ تو نہیں جانتی کہ میں اس وقت کیسا اچھا خواب دیکھا کرتی ہوں!!

میری اماں! مجھ سے یہ پیاری گھڑیاں نہ چھین، کیونکہ جن میں تو مجھ کو اُٹھا دینا چاہتی ہے۔ وہی میری زندگی کے بہترین لمحات ہیں!!

اماں! تو محوِ حیرت ہے پر ہائے تجھ کو کیا معلوم کہ ایک دوشیزہ کا پاکیزہ دل، آدھی رات کے درمیان کیسے نور افشاں خیالات میں ڈوبا رہتا ہے!

خاک نشین
تہذیب فاطمہ عباسی

استقلال پیدا کرو

بہت سے لوگ ہیں جو یک دم کامیابی کے بامِ رفعت پر پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگیاں نہایت جوش وخروش کے ساتھ شروع کرتے ہیں لیکن عام طور پر قبل اس کے کہ منزلِ مقصود پر پہنچیں وہ ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ جادۂ حیات کے اس سرے سے اُس سرے تک ہمیں ایسے اشخاص نظر آتے ہیں جو زندگی کی دوڑ میں تھک تھک کر مختلف منازل پر رہ رہ گئے۔ وہ محنتی، دیانت دار، پُرجوش، تعلیم یافتہ سبھی کچھ تھے، انہیں اچھے مواقع بھی ملے مگر عزم واستقلال اُن میں نہ تھا، وہ اُس اَن دیکھی منزل سے جو کامیابی کی منزل کہلاتی ہے چند ہی قدم پر رہ گئے تھے کہ دوڑ میں سے الگ ہو گئے۔

وہ کتنے حیران ہوں اگر یہ پردہ اُٹھ جائے! اور ان کو معلوم ہو کہ جس کامیابی کے وہ مشتاق تھے اُس کے اور ناکامی کے درمیان صرف اُن چند قدموں کا فاصلہ تھا جو انہوں نے نہ اُٹھائے۔

ایک عظیم الشان فوج جس کو کوئی انسان نہ گن سکے کامیابی کے شہر کے گرد اُس کی دیواروں کے پاس، اُس کے دروازوں کے قریب محاصرہ کئے پڑی ہے لیکن وہ کبھی شہر میں داخل نہیں ہوئی اور وہ کبھی اس میں داخل نہ ہو گی۔ اس فوجِ عظیم کے ہزاروں آدمی، اگر اُن سے سوال کیا جائے تو کہیں گے کہ انہیں کبھی کوئی عمدہ موقعہ نہیں ملا، اُن کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور انہیں کبھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو اُن سے احسان کرتا۔ حالانکہ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو مکتبوں اور مدرسوں کے سائے میں پیدا ہوئے اور پلے، بڑی بڑی لائبریریاں اُن کی پہنچ میں رہیں۔ بہ مقابلہ ان کے ایب لنکن اور ہزاروں دوسرے غریب لڑکوں نے لکڑی کے ذخیروں میں آگ کے الاؤ کی روشنی میں بیٹھ بیٹھ کر علم حاصل کیا اور پھر ان کے سامنے سے فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے گزر گئے۔

تقریباً ہر ایک کامیاب شخص نے اپنی جد وجہد کے زمانے کے دوران میں محسوس کیا ہو گا کہ اُس کی کامیابی کی رفتار بہت دھیمی ہے اور زندگی اب بھی ناکام ہو سکتی ہے مگر جنہوں نے اچھے نتائج حاصل کئے وہ اس احساس کے باوجود بھی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے رات کی تاریکیوں کی پروا نہ کی، انہوں نے دِن کی صعوبتوں کو کچھ اہمیت نہ دی۔

انسان کے اندر استقلال سے بڑھ کر کوئی جوہر نہیں۔ متواتر اور مسلسل کوشش ہی سب سے بڑا جوہر ہے۔

دنیا میں اگر ہزار آدمی قابلیت کے مالک ہیں تو اُن میں سے ایک جفاکش ہے۔ ذہانت اور قابلیت مشکلات

کے سامنے جی چھوڑ جاتی ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کسی اور وجہ کی بہ نسبت غیر مستقل مزاجی کے باعث زیادہ آدمی ناکام رہتے ہیں۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی خواہش کو حاصل کرنے کے لئے ہر قیمت ادا کرنے کے لئے تیار رہیں لیکن محنت اور مشقت کے لئے تیار نہیں۔ وہ تجویزیں سوچنے خدع اور فریب کرنے، ترقی کی طرف مختصر اور نزدیک راستے معلوم کرنے میں اپنی طاقت و قوت زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں مگر چند سال تک محنت و مشقت آمیز کوشش کرنے اور اپنے ذرا ذرا سے آرام و آسایش کو چھوڑنے کا خیال تک دل میں لانے کے لئے تیار نہیں۔

یوں ہی ہزاروں لوگ اپنی قیمتی زندگی کے سالہاسال کامیابی کے سودے ڈھونڈنے اور محنت اور کام سے کوئی آسان اور سریع التاثیر طریقہ تلاش کرنے کی کوشش میں صرف کر دیتے ہیں۔

بعض لوگوں میں کام جاری کرنے اور انجام دینے کا ایک خاص مادہ ہوتا ہے اور یہ یقیناً ایک غیر معمولی طاقت اور ایک تخلیقی قابلیت کی نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ اُس کے مالک میں دوسروں کا سردار بننے کی قابلیت موجود ہے۔ کسی کام کے شروع کرنے کی اہلیت تقریباً ہر شخص میں ہوتی ہے لیکن ایسا شخص مشکل سے ملتا ہے جو ہر اُس کام کو جو وہ شروع کرے انجام تک بھی پہنچائے۔ اور یہ انجام ہی ہے جسے کچھ اہمیت حاصل ہے۔

(ماڈرن)

منصور احمد

غزل

ساقی تری نگاہ نے مستانہ کر دیا ❊ دل ایک جام تھا جسے میخانہ کر دیا

کیفِ شرابِ حسن کی ہیں طرفہ کاریاں ❊ دیوانہ کر دیا کبھی فرزانہ کر دیا

برقِ جمالِ یار کا انداز دیکھنا ❊ دل غیرتِ بہار تھا ویرانہ کر دیا

مدِ نظر وقارِ حرم تھا تو اے خدا ❊ کیوں گلفشاں سوادِ صنم خانہ کر دیا

ساقی کی چشمِ مست میں دیکھا جو کیفِ حسن ❊ دل ہم نے وقفِ بادہ و پیمانہ کر دیا

یوسف مآلِ عشقِ زلیخائے مصر نے
عالم میں خوابِ حسن کو افسانہ کر دیا

یوسف گجرات

محفلِ ادب

صہبائے سخن

(۱)
ظاہر کی نظر نے تجھے پنہاں پایا — باطن کی نظر نے تجھے عریاں پایا
تھی عقل بھی جویا ترے جلوے کی مگر — کم بخت کو سرگشتہ و حیراں پایا

(۲)
کیا گلشنِ عالم میں صبا ہو جاؤں — یا تہ میں سمندر کی فنا ہو جاؤں
ہستی سے بھی وحشت ہے عدم سے بھی گریز — حیران ہوں یارب کہ میں کیا ہو جاؤں

(۳)
رشکِ جم و کے ہے مے پرستی میری — وہ مست ہوں جاوداں ہے مستی میری
موجِ مئے ارغواں ہے ہر سانس مری — مے خانۂ رنگ و بو ہے ہستی میری

(۴)
میں کعبہ نشیں نہیں ہوں مستانہ ہوں — پابندِ خرد نہیں ہوں دیوانہ ہوں
ہوجاؤنگا تیری شمعِ اُلفت پہ نثار — میں کوئی مگس نہیں ہوں پروانہ ہوں

(۵)
گلہائے سحر کے جام رنگیں رنگیں — تاروں کی ضیا سے شام رنگیں رنگیں
کاشانۂ روحِ حسن سے ہے روشن — ہے بزمِ جہاں تمام رنگیں رنگیں

"جامِ صہبائی"

انسانی دماغ کا ارتقا

ڈارون کی کتاب "سلالت انسان" کے فیصلہ کن ابواب وہ ہیں جن میں اُس نے انسانی دماغ کے ارتقا کے متعلق ایک تاریخی بیان دیا ہے۔ اور اس عضو کے مختلف افعال کا ذکر کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت اِن ابواب کی کیا حیثیت ہے ڈارون علم تشریح کا عالم نہیں تھا لہذا اُس نے ہکسلے کے اس بیان کو تسلیم کر لیا تھا کہ انسان کے دماغ میں کوئی ایسی ساخت نہیں جو انسان نما بندروں کے دماغ میں نہ ملتی ہو۔ ہکسلے کی رائے میں اگر ہم انسان نما بندروں کے دماغ کو ایک کتاب

فرض کرلیں تو انسانی دماغ کو اس سادہ اور قدیم کتاب کی ایک مشرح ایڈیشن تصور کیا جاسکتا ہے۔ اور اسی طرح اول الذکر کتاب کو اس سے بھی زیادہ قدیم اور ابتدائی کتاب کی مطول ایڈیشن سمجھنا چاہئے۔ ہکسلے کے اس بیان کے بعد ہزاروں علمائے تشریح وفعلیات نے انسان اور بندر کے دماغوں کا مطالعہ کیا ہے۔ چند مہینے ہوئے پروفیسر جی۔ ایلیٹ سمتھ نے اس تحقیق کے نتائج کا خلاصہ یوں پیش کیا ہے "بندر کے دماغ میں کوئی ایسی ساخت دیکھنے میں نہیں آئی جو انسانی دماغ میں نہ پائی جاتی ہو برخلاف اس کے انسانی دماغ کوئی ایسی ساخت ظاہر نہیں کرتا جو گوریلا یا چمپانزی کے دماغ میں موجود نہ ہو...... انسانی دماغ کو بندر کے دماغ سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ محض اس کی کمیت ہے"۔ گویا انسان اور بندر کے دماغوں میں صرف کمیت کا فرق ہے، نوعیت کا فرق نہیں۔ مگر پھر بھی اس فرق کی اہمیت سے انکار نہیں ہوسکتا۔ انسان نما بندر کے دماغ کے بعض حصے انسانی دماغ میں بہت زیادہ وسیع ہوگئے ہیں اور انہیں حصوں کی توسیع سے انسان کو احساس، ادراک، عمل، نطق اور علم کی قوتیں نصیب ہوئی ہیں۔

"سائنس"

عشق

عشق جلوہ گر ہوا، زندگی مہک اٹھی   گلستاں چمک اٹھا، ہر کلی دمک اٹھی
ذرہ ہائے خاک سے دلبری جھلک اٹھی   روحِ کائنات میں آگ سی بھڑک اٹھی

آگ سی بھڑک اٹھی روحِ کائنات میں

فتنہ ہائے ناز کو عشق گدگدا گیا   آگ سی لگا گیا، حُسن کو جگا گیا
محفلِ خیال پر اک نشہ سا چھا گیا   عشرتِ حیات میں سوزِ غم سما گیا

سوزِ غم سما گیا عشرتِ حیات میں

"قوسِ قزح"

انتظار

آفتاب طلوع ہوا اور غروب ہوگیا۔ چاند کی نورانی کرنیں اپنی نازک، اپنی آن دیکھی رفتار کے ساتھ عرش سے اُتریں اور ظلمت کے بے محابا بیتے ہوئے غبار کے ساتھ شوخیاں کرنے لگیں۔ ستاروں نے اپنی درخشانی سے آسمان کی نیلگوں چادر

کو ہیروں اور موتیوں سے سجا دیا۔

دن گزر گئے۔ راتیں گزر گئیں۔

دریاؤں میں طغیانیاں آئیں اور سکون ہوا۔ میدان میں ریت کے ذروں نے چمک چمک کر زمین پر آسمان کا نقش دکھا دیا۔ کلیاں پھول ہوئیں، پھول مُرجھا گئے، کونپلیں پھوٹیں، بہار آئی اور چلی گئی، خزاں نے درختوں کو زرد لباس پہنایا۔

لیکن میرا دل، آہ میرا دل ایک حال پر ہے۔ اس میں کبھی تغیر نہیں ہوا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں یہ کب سے تیری یاد میں محو ہے۔ اس کے انتظار کا طلسم اُس وقت تک نہ ٹوٹے گا جب تک تو اُسے اپنے پاس آنے کا پیام نہ دے۔

"نورجہاں"

زردشت کی تعلیمات

قابلِ عبادت صرف وہ خدا ہے جو زمین، آسمان، چاند، سورج، پانی اور آگ کا خالق ہے، جس نے دنیا کو پیدا کیا اور جس کے اختیار میں موت اور زندگی، رنج اور خوشی ہے۔

انسان کو اُسی سے التجا کرنی چاہئے۔ کیونکہ اُس کے سوا انسان کا کوئی مددگار نہیں ہے۔

خدا کا کوئی جسم اور کوئی رُوپ نہیں ہے۔ لیکن وہ ہر جگہ موجود ہے۔

خدا ہے، اور واحد ہے، اس کی وحدت عددی نہیں ہے۔ وہ گنتی اور شمار سے برتر ہے۔

خدا نے آگ پانی، چاند اور سورج میں اپنا جلوہ دکھایا۔ ان چیزوں سے اُس کی شان و شوکت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی طرف رُخ کر کے ہمیں اُس پاک اور برتر خدا کی عبادت کرنی چاہئے۔

نیکی بدی، انصاف اور ظلم میں تمیز کرنی چاہئے۔

ثواب گناہ رحمت اور غضب کو سمجھنا چاہئے۔

پانچ وقت خدا کی عبادت کیا کرو۔ اُس وقت تمہارا رُخ کسی روشن چیز کی طرف ہونا چاہئے۔

برائیوں سے بچو اور نیک بننے کی کوشش کرو۔

ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے۔ زردشت کسی کی شفاعت نہیں کر سکتا۔

عاجزی، تواضع، حیا، عصمت، سچائی، مروّت، حُسنِ سلوک، بھیک نہ مانگنا۔ دوسروں کی مدد کرنا یہ سب کام نیک ہیں اور خدا کی عبادت میں داخل ہیں۔

"پیمانہ"

تبصرہ

جامِ صہبائی حضرتِ اثر صہبائی کی ۱۰۷ رباعیات کا دلکش مجموعہ ہے۔ اصنافِ سخن میں غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جس کی طرف شعرائے اردو نے اب تک توجہ کی ہے اور اُسے معراجِ کمال تک پہنچایا ہے۔ طرزِ جدید کے شعرا نے نظم کی طرف بھی رُخ کیا ہے مگر رُباعی کو جو فی الحقیقت ایک چھوٹی سی بلیغ نظم ہے۔ ایک مستقل موضوع اور خاص فلسفہ کے ماتحت صرف صہبائی نے پیش کیا ہے۔ صہبائی کا فلسفہ خیام کا فلسفہ ہے اور اگر انہیں زبانِ اُردو کا عمر خیام نہ کہا جائے تو اس میں شک نہیں کہ وہ فٹز جیرلڈ ضرور ہیں، کیونکہ انہوں نے اس مغربی خیام پرست کی طرح فلسفۂ خیام کی روح کو اُردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔

جامِ صہبائی کا طرزِ عنوان خیام کی یہ رباعی ہے۔

آمد سحرے ندا زمے خانۂ ما ۔۔۔ کاے رندِ خراباتی دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ زمے ۔۔۔ زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

صہبائی فرماتے ہیں:۔

دامانِ سحر کی گلفشانی فانی ۔۔۔ شبہائے بلائے آسمانی فانی
یہ لمحۂ عشرت ہے غنیمت ساقی ۔۔۔ بھر جام کہ زندگی ہے فانی فانی

یا

ہے تاک میں مرگِ ناگہانی ساقی ۔۔۔ گردش میں ہو جامِ ارغوانی ساقی
جھونکے کی طرح سن سے گزر جائے گی ۔۔۔ مانندِ صبا ہے زندگانی ساقی

کون کہہ سکتا ہے آخری دو رباعیات بھی عمر خیام کی نہیں؟ اسی طرح باقی رباعیات بھی حقائق و معارف اور پاکیزگی و نطافت سے پُر ہیں۔ کتاب لکھائی چھپائی اور کاغذ کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہے۔ حجم سرورق کے علاوہ ۵۴ صفحے ہے اور قیمت آٹھ آنے۔ دار التالیف، ایبٹن روڈ، لاہور سے طلب فرمائیے۔

شاما مصنفہ جناب کشن پرشاد کول صاحب۔ یہ ایک دلچسپ اور پاکیزہ ناول ہے جس میں فطرتِ انسانی کی تصاویر نہایت خوبی سے کھینچی گئی ہیں۔ زبان سلیس اور شگفتہ ہے اور طرزِ ادا پُرسوز و دل گداز۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو خود تعلیم یافتہ اور مہذب و شائستہ ہے لیکن اُس کے ماں باپ اپنے اغراض کی خاطر اُسے ایک ایسے شخص سے بیاہ دیتے ہیں جو نہایت جاہل ہونے کے علاوہ

چال چلن بھی اچھا نہیں رکھتا اور لڑکی کی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔ کتاب ۸۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق مصور اور رنگین ہے ملنے کا پتہ :- انڈین پریس لمیٹڈ۔ الہ آباد +

پیارے دیور۔ جناب حافظ عبداللہ صاحب شرار کا ایک درد انگیز اور نتیجہ خیز معاشرتی ڈراما ہے جس کے لکھنے کی تحریک انہیں مہا کبھی بابو گریش چندر کی تصنیف سے ہوئی لیکن چونکہ مصنف موصوف بنگالی زبان سے واقفیت نہ رکھتے تھے اس لئے اس کا ترجمہ نہ کر سکے اور چند مرتبہ اس کے تماشے کو دیکھ کر اُسی پلاٹ پر انہوں نے یہ ڈراما تصنیف کیا جو نہایت دلچسپ اور مفید ہے۔ معاشرتی اصلاح کے لئے ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحے ہے اور کتابت، طباعت کے اعتبار سے بھی عمدہ ہے قیمت ایک روپیہ چار آنے مقرر کی گئی ہے۔ ملنے کا پتہ :- حافظ عبداللہ صاحب شرار۔ نمبر ۳/۴ دل کشا سٹریٹ۔ بالی گنج۔ کلکتہ۔

"نورجہاں" کا سالانہ نمبر۔ جنوری ۱۹۲۸ء سے رسالہ نورجہاں کی صوری و معنوی خوبیوں میں ایک انقلاب رونما ہو گیا ہے۔ یہ نمبر غیر معمولی طور پر پونے دو سو صفحات پر شائع ہوا ہے، تصویریں بھی معمول سے زیادہ ہیں اور تقطیع بھی پہلے سے بڑی اور ہمایوں کے برابر کر دی گئی ہے۔ ملک کے مشہور اور مسلمہ ادیبوں کے مضامین اس کے لئے حاصل کئے گئے ہیں اور اُن کی ترتیب و تدوین نہایت قابلیت سے کی گئی ہے۔ علمی مضامین میں باتصویر مضمون "عورت کی حیثیت مشرق اور مغرب میں"، "فارسی گو شاعر عورتیں" "صنعت و دستکاری" اور "مادام لیٹیا" بہت اچھے ہیں۔ افسانوں میں "حرماں نصیب" اور "سیتا دیوی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں حصہ نظم میں عابد علی عابد، راز چاندپوری اور آثر صہبائی کا کلام پڑھنے کے قابل ہے۔ ایڈیٹر صاحبہ کے مضامین کی عموماً اور نظموں کی خصوصاً داد دینی پڑتی ہے کہ اُن کا کلام جدید شاعری میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ "پیغامِ گل" اور "تاج محل" نہایت عمدہ تصاویر ہیں۔ "نورجہاں" کے صرف اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ منیجر "نورجہاں" امرتسر سے طلب فرمایئے۔

"ہنرمند" یہ ماہوار رسالہ شیخ محبوب الٰہی صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل لاہور اور حکیم محمد عبدالغفور صاحب کی مشترک ادارت میں لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کا مطمح نظر مسلمانوں کو زراعت و تجارت اور صنعت و حرفت کی تعلیم دینا ہے۔ دونوں مدیر اس رسالہ کو بڑی محنت اور قابلیت سے مرتب کر رہے ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ جن مقاصد کو مدنظر رکھ کر انہوں نے اسے جاری کیا اُس میں وہ بوجہ احسن کامیاب ہوں گے۔ ہماری رائے میں ملک و قوم کو ایسی چیزوں کی سخت ضرورت ہے۔ سالانہ چندہ تین روپے ہے۔ منیجر رسالہ ہنرمند۔ حویلی کابلی مل لاہور سے منگایئے۔

اطلاع :- سید محمد ہادی صاحب ہادی مچھلی شہری وکیل علی گڑھ سے منتقل ہو کر الہ آباد چلے آئے ہیں۔ آئندہ اُن کا پتہ ۱۵۲ شاہ گنج الہ آباد ہوگا +

اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا (ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلت مآب سر جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی، اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء

جائنٹ ایڈیٹر {
حامد علی خاں۔ بی، اے
منصور احمد
}

فہرستِ مضامین

جلد ۱۳ | بابت ماہِ اپریل ۱۹۲۸ء | نمبر ۴

تصویر:- محرومِ محبت

جہاں نما

حضور نظام کی معارف پروری

اردو زبان کے لئے جو دور اعلیٰ حضرت خسروِ دکن میر عثمان علی خاں کے عہدِ سلطنت سے شروع ہوا ہے وہ اپنی عظمت اور شوکت کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ زبانِ اردو کا آفتاب دکن ہی سے طلوع ہوا تھا اور آج پھر وہ دہلی اور پنجاب کا چکر لگاتا ہوا دکن ہی پر اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے دہلی اور پنجاب نے اردو کو ادب کے لطیف سے لطیف نکات سمجھائے تھے مگر پھر بھی اُس میں ترقی یافتہ زبانوں کی صفِ اول میں بیٹھنے کی قابلیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اُس میں علوم و فنون کو اپنے اندر جذب کرنے کی اہلیت نہ تھی لیکن آج اگر اردو زبان کو ایک مکمل زبان کہنے میں ہمیں کوئی باک نہیں تو یہ یقیناً عثمان علی خاں کی علم پروری اور عالی خیالی کا نتیجہ ہے۔ جامعۂ عثمانیہ اور دارالترجمہ حضورِ نظام کے دو ایسے عظیم الشان کارنامے ہیں جن سے ہمارے دلوں میں خلافتِ عباسیہ کی یاد از سرِ نو تازہ ہو رہی ہے۔ اس وقت دکن ہندوستان کا بغداد بن رہا ہے جہاں ملک قابل ترین دل و دماغ جمع ہیں۔

مہذب ممالک میں یہ امر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ متعلمین کی معاشرتی زندگی پر اقامتی جامعات کا بڑا اثر پڑتا ہے اُن کی تہذیب اور تربیت میں اقامت کا بڑا حصّہ ہوتا ہے اور اسی سے اُن میں وسعتِ نظر اور عالی ہمتی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے اعلیٰ حضرت نظام نے جامعۂ عثمانیہ کی عمارت تعمیر کرانے کا فیصلہ کیا ہے اور ایک کروڑ روپے کی منظوری بھی دے دی ہے۔ جس کے صرف سے ایک جامعی قصبہ تعمیر کیا جائے گا۔ اُس میں اقامت خانوں کے علاوہ طلبہ کی تمام دوسری ضروریات بھی مہیا کی جائیں گی۔ جامعہ کی عمارت کے متصل ہی ایک ہزار ایکڑ زمین کا ایک رقبہ ہوگا جس میں زراعت وغیرہ کے متعلق علمی تجربات کئے جائیں گے اور طلبہ کو اُن سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دیا جائے گا۔

ہم یقین کرتے ہیں کہ اس اقامتی نظام کا نتیجہ جامعۂ عثمانیہ کے متعلمین کے لئے نہایت مفید ہوگا اور جب وہ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلیں گے تو اُن کے پاس صرف علم و فضل کی سندیں نہ ہونگی بلکہ اُن میں بامِ رفعت پر چڑھنے کی صلاحیتیں بھی ہونگی۔

روس میں اشاعت کتب

جمہوریہ روس میں سب سے بڑا ادارہ اشاعت سویٹ سٹیٹ اڈیٹوریل آفس ہے۔ اس دارالاشاعت نے صرف ۱۹۲۷ء میں ۴۰۰۰۰۰۰ کتابیں ۴۰۰۰ مختلف عنوانات پر شائع کی ہیں۔ ان کتابوں کی مجموعی لاگت کا اندازہ ۳۴۰۰۰۰۰۰ روبل کیا گیا ہے۔

میکسم گورکی کی کتابیں سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہیں۔ چنانچہ اُن کی بیس لاکھ جلدیں طبع ہوئیں۔

لینن کی تصنیفات اور اُن کے متعلق دوسری کتابوں کی تعداد جو یکم جنوری ۱۹۲۸ء تک اشاعت پذیر ہوئیں ۱۲۰۰۰۰۰ تک پہنچ گئی جن کے ۱۳۶ مختلف عنوانات تھے۔

دارالعوام کی دعا

یہ وہ دعا ہے جس سے پارلیمنٹ کے ہر اجلاس کا افتتاح ہوتا ہے:۔

اے خدائے بزرگ و برتر بس تیرے ہی حکم سے جہان کے بادشاہ حکومت کرتے ہیں۔ اور دنیا کے شہریار انصاف کرتے ہیں اور تجھ ہی سے تمام مشورے اور عقل اور دانش ہمیں ملتی ہے۔

ہم تیرے ناکارہ غلام، جو تیرے نام پر یہاں جمع ہوئے ہیں نہایت عاجزی کے ساتھ تجھ سے استدعا کرتے ہیں کہ تو اوپر سے ہمارے لئے آسمانی عقل و دانش نازل فرما اور ہمارے تمام مشوروں میں تو ہماری رہنمائی کر اور قبول کر کہ تیرے خوف کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اپنے تمام ذاتی مفادوں، تعصبوں اور طرفداریوں کو برطرف کرتے ہوئے ہمارے تمام مشوروں کا نتیجہ صرف تیرے مبارک نام کو بلند کرنا ہو، سچے مذہب اور عدل کا حصول ہو، اور بادشاہ کی حفاظت، عزت اور مسرت ہو، رعایا کی آسائش، امن اور ملک کی آسودگی اور خوشحالی ہو اور افراد و اقوام کے دلوں کو اُس محبت اور اخوت کے رشتے میں منسلک کر کے ایک دوسرے سے ملا دینا ہو جس کی تعلیم ہمیں مسیحیت نے ہمارے شفیع اور خداوند یسوع مسیح کے ذریعہ سے دی ہے۔ آمین +

سونے کی سڑک

کالوریڈو میں ایک پختہ سڑک کی تعمیر کے لئے روڑی ایک سونے کی کان میں سے لی گئی ہے۔ گو اس روڑی میں فی ٹن ۶ شلنگ کی قیمت کا سونا تھا لیکن یہ بہترین مسالہ تھا جو مہیا ہو سکتا تھا۔ اس حساب

سے اس سڑک میں فی میل چھ سو پونڈ کا سونا موجود ہے۔

سورج کی عمر

ایک فرانسیسی ہیئت دان نے بتایا ہے کہ سورج ہمیں ایک پدم اور پچاس ہزار سال تک روشنی اور گرمی پہنچاتا رہے گا۔ اب تک یہی خیال کیا جاتا تھا کہ سورج زیادہ سے زیادہ ایک کروڑ برس کے بعد بجھ کر رہ جائیگا۔ یہ نیا اندازہ اُن انکشافات کی بنا پر لگایا گیا ہے جو ذروں کی ساخت کے متعلق حال ہی میں ہوئے ہیں۔

کاغذ کے قحط کا اندیشہ

کبھی آپ نے سوچا کہ سال بھر میں ہم کتنا کاغذ خرچ کرتے ہیں؟ اخبار، رسالے، خطوط، لفافے، وہ کاغذ جن میں پارسل باندھے جاتے ہیں یا جن میں ہم دوکانوں سے سودا خرید کر لاتے ہیں اگر جمع کیئے جائیں تو میزان اتنی بڑھ جائے گی کہ اُسے دیکھ کر حیرانی ہوگی۔ برطانیہ میں فی کس ۵۶ سیر کاغذ صرف ہوتا ہے اور امریکا میں اِس سے بہت زیادہ۔

زیادہ تر کاغذ کینیڈا کی نرم لکڑی سے تیار کیا جاتا ہے لیکن اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر کاغذ اسی شرح سے استعمال ہوتا رہا تو تقریباً پچیس سال کے اندر اندر لکڑی کا تمام ذخیرہ ختم ہو کر رہ جائے گا۔ ریاستہائے متحدہ کا یہ حال ہے کہ ہر سال کی بالیدگی سے اُن کا خرچ آٹھ گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔

ان حالات کو دیکھ کر ماہرین اگر پریشان ہوں تو وہ حق بجانب ہیں کیونکہ لکڑی کے اس قحط کا اثر کاغذ ہی تک محدود نہ ہوگا بلکہ ریشمی جرابوں سے لے کر چھتریوں اور ریل کی پٹڑیوں تک کی حالت مخدوش ہو جائیگی۔

خوش قسمتی سے کاغذ سازی کا انحصار آج کل کلیتہً پرانے مصالح پر نہیں رہا اور اب نئے نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں مگر صرف نئے طریقوں کا دریافت کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ جنگلوں کی نگہداشت بھی ضروری ہے کیونکہ موجودہ صورت میں چار درختوں میں سے صرف ایک درخت کام میں آتا ہے اور تین آگ یا کسی دوسری تباہی کی نذر ہو جاتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں کاغذ اور بعض دوسری صنعتوں پر جو لکڑی صرف ہو رہی ہے اُس کا اندازہ چار کروڑ

ٹن فی سال کیا گیا ہے اور قیافہ لگایا گیا ہے کہ دس سال کے عرصہ میں اُس کا خرچ پانچ کروڑ ٹن فی سال تک پہنچ جائے گا اور موجودہ جنگل اس کو مہیّا کرنے سے عاری ہو جائیں گے۔

کیا رفتار کی کوئی انتہا بھی ہے؟

ہوائی جہازوں کی رفتار روز بروز اس قدر بڑھ رہی ہے کہ ممکن ہے کبھی اُس کی تیزی کو انسان برداشت ہی نہ کر سکے۔ اور اُس کے ادراک ہی سے اُس کا دماغ قاصر رہے۔ آئندہ ایسے تیز رفتار ہوائی جہازوں کے تیار ہونے کی امید ہے کہ کسی ایسے جہاز کو موڑنے کا نتیجہ چلانے والے کی موت ہؤا کریگا۔ کیونکہ اس عمل سے اُس کے دماغ کے ایک پہلو پر اتنا بار پڑے گا جو اُس کی برداشت سے باہر ہو گا۔ خیال کیا گیا ہے کہ آدمی تین سو میل فی گھنٹہ سے زیادہ رفتار پر مڑنے کو برداشت نہیں کر سکتا خواہ وہ سیدھے راستے پر اس سے زیادہ رفتار کو بھی برداشت کرے۔

خوراک کا بدل

آئندہ جب کوئی شخص منہ یا گلے کے زخم یا کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو گا جس کی وجہ سے وہ کچھ کھا پی نہ سکے تو یہ ممکن ہو گا کہ اُسے جلد کے ذریعہ سے غذا بہم پہنچائی جائے۔ خوراک رسانی کا یہ عجیب و غریب طریقہ آسٹریا کے ایک ڈاکٹر نے سال بھر کے مسلسل تجربات کے بعد معلوم کیا ہے

آج کل مصنوعی پرورش کے دو طریقے رائج ہیں اول پچکاری کے ذریعہ سے خون میں غذا داخل کرنے کا دوسرے اُسے مقامِ انہضام میں پہنچانے کا، مگر یہ دونوں طریقے ناقص ہیں کیونکہ اُن سے غذا پوری طرح جزوِ بدن نہیں ہوتی۔ لہذا یہ جدید انکشاف نہایت اہم ہے۔ اس کے ذریعہ سے اعضائے ہاضمہ دیر تک آرام لے سکیں گے اور خوراک جلد میں سے اندر پہنچتی رہیگی۔ ایک مرکب پروٹید شکر اور دوسری ضروری حیاتین ملا کر تیار کیا جائے گا جس کی شکل مرہم کی سی ہو گی اور اُس سے مریض کے جسم پر مالش کی جلئے گی جو غذا کی قائم مقام ہو گی۔

چند نصیحتیں

۱۔ تفکرات کو پاس نہ آنے دو۔

۲۔ امن کو تلاش کرو اور اُس کے تعاقب میں جاؤ۔

۳۔ خوش رہو۔ مسرور دل زیادہ دیر تک زندہ رہتا ہے۔

۴۔ کبھی مایوس نہ ہو، مایوسی ایک جانکاہ بیماری ہے۔

۵۔ مردانہ وار کام کرو مگر اتنا کام نہ کرو جس سے زندگی خطرے میں پڑ جائے۔

۶۔ جتنی قوت تم میں روزانہ پیدا ہوتی ہے اُس سے کم خرچ کرو۔

۷۔ جلدی نہ کرو۔ منزل پر زیادہ تیز رو بھی اُسی وقت پہنچتا ہے جس وقت سست رو پہنچتا ہے

۸۔ خوب سیر ہو کر سوؤ اور آرام کرو۔ نیند قدرت کی بڑی نعمت ہے۔

۹۔ جوش و ہیجان سے باز آؤ۔ ایک لمحہ کا جوش بھی مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۰۔ صحت ور لوگوں سے میل جول رکھو۔ بیماری کی طرح صحت بھی متعدی ہے۔

۱۱۔ زیادہ مت کھاؤ اور نہ بھوکے رہو۔ اپنے اعتدال کو ضرب المثل بنا دو۔

دھات کا نیا استعمال

لندن میں ایک شخص نے ایک حیرت انگیز ایجاد کی ہے۔ وہ ہر ایک چیز پہ دھات کی ایک تہ جما کر اُسے غیر معمولی طور پر مضبوط بنا دیتا ہے۔ مثلاً ایک کپڑے پر اُس نے دھات کی تہ چڑھا دی کپڑا بظاہر باریک اور نازک تھا مگر ایک شخص اپنا پورا زور لگانے کے باوجود اُس کو پھاڑ نہ سکا۔ اس شخص کا دعوے ہے کہ وہ اس طریقے سے ایسے ہوائی جہاز تعمیر کرے گا جن کا وزن موجودہ ہوائی جہازوں سے نصف بھی نہ ہوگا وہ موجودہ ہوائی جہازوں سے کم وقت میں تیار ہوا کریں گے اور اُن سے زیادہ پائدار ثابت ہونگے۔

یتیم بچّی

مُجھ سے محبت کرنے والا
الفت کا دم بھرنے والا
کوئی نہیں ہے اِس دنیا میں اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

پیار سے کون بلائے مجھ کو
گود میں کون بٹھائے مجھ کو
میرے ناز اُٹھانے والا اِس دنیا میں کوئی نہیں ہے

اچھّی کہانی مجھ کو سنا کر
پیار سے اپنے پاس سُلا کر
چہرہ پہ نظریں گاڑنے والا اِس دنیا میں کوئی نہیں ہے

جاگ اٹھوں نہ سُلائے کوئی
سوتی رہوں نہ جگائے کوئی
جس کو ہو میری بھی پروا اِس دنیا میں کوئی نہیں ہے

ٹھوکر کھا کے جو گر جاؤں میں
آپ ہی بِن روئے اُٹھوں میں
اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

سوتے سوتے اگر ڈر جاؤں
پھر بھی تم کو پاس نہ پاؤں؟
امّاں! امّاں! پیاری امّاں اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

حامد علی خاں

مبادیٔ سیاسیات

باب ۳
تخیلِ مملکت کا آغاز اور اُس کا ارتقا

تنظیمِ مملکت ۔ علامہ ابنِ خلدون نے اپنی مشہورِ آفاق تاریخ کے مقدمہ میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مملکت تمام دنیوی خیرات اور نیکیوں کا مجموعہ اور نفسانی وجسمانی امیدوں اور آرزوؤں کی غایت الغایات[1] ہے مملکت کے حقیقی مقاصد پر آیندہ بحث کی جائے گی ۔ اِس وقت یہ بتا دینا کافی ہے کہ ابنِ خلدون نے جو اسے اتنا گراں بہا ادارہ بتایا ہے تو اس کا اصلی سبب مملکت کی منظم کیفیت معلوم ہوتی ہے جو اس کا جزو لاینفک اور اس کی عظمت کی گویا جان ہے ۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کی تنظیم کبھی نہ کبھی ضرور عمل میں آئی ہوگی، اور معاشرۂ انسانی پر ایک زمانہ ضرور ایسا گذرا ہوگا جب اس میں سیاسی کیفیات پیدا نہیں ہوئی تھیں، یعنی جب حاکم ومحکوم کے تعلقات کا وجود نہ تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ زائد از دو ہزار سال سے مشرق اور مغرب کے سیاسی مختلف واقعات کو پیشِ نظر رکھ کر اُن کیفیات کو از سرِ نو مرتب کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں جو مملکت کی تنظیم سے پیشتر معاشرۂ انسانی کی ہونگی ۔ ظاہر ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ سب محض نظریات پر مشتمل ہے، اور شاید تاریخ میں کسی ایسے معاشرۂ انسانی کا ذکر نہیں ہے جس میں سیاسی تخیل کا کلیتہً فقدان ہو ۔

ہندی نظریے ۔ تخیلِ مملکت کے آغاز کے متعلق شاید سب سے پہلے نظریہ کا ذکر جو دنیا کے سامنے پیش کیا گیا، بودھ مت کی کتابوں میں ملتا ہے ۔ دیگھ نکائے میں لکھا ہے کہ مہاتما گوتم بدھ نے کسی کے سوال کے جواب میں یہ کہا کہ ابتدا میں انسان کی حالت بالکل مکمل تھی ۔ اور رنج وفکر کا پتا نہ تھا، رفتہ رفتہ خاندان قائم ہو گئے ذاتی ملک کا رواج ہو گیا ۔ قوم چار ورنوں میں تقسیم ہو گئی ۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا اور اِس کی ضرورت پیش آئی

[1] مقدمہ ابن خلدون حصہ دوم، فصلِ اول ۔

پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی کے گراں پایہ مضمون "مبادیٔ سیاسیات" کو ہمارے بعض ناظرین اب تک کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ سمجھتے رہے ہیں حالانکہ یہ اُن کا طبع زاد مضمون ہے ۔

کہ کسی نہ کسی طرح سے زیادتیوں اور ظلم وستم کا انسداد کیا جائے۔ الغرض تمام لوگ یکجا جمع ہوئے اور انہوں نے یہ طے کیا کہ اِن زیادتیوں کا انسداد اُسی وقت ممکن ہے جب ایک ایسا حکمران منتخب کیا جائے جو ملزموں کو سزا دے، دو شخصوں میں لڑائی جھگڑا ہو تو اُن کا فیصلہ کرے اور ملک میں امن و امان قائم رکھے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی جماعت میں سے سب سے زیادہ خوب رو، سب سے زیادہ متین اور سب سے زیادہ طاقتور شخص کو اپنا حکمران منتخب کیا۔ اور اُس سے یہ معاہدہ کیا کہ اگر وہ یہ فرائض منصبی ادا کرے تو اُسے ایک مقررہ مشاہرہ دیا جائیگا[1]

اِس کے بعد جو نظریہ ہندوستان کے سیاسی میدان میں سب سے ممتاز ہے وہ کوٹلیا کا نظریہ ہے جس کے مطابق مملکت سے پیشتر بالکل مزاج کی سی کیفیت تھی، امن و امان مفقود تھا، ہر شخص دوسرے کی ایذا رسانی اور اپنی خواہشات کو پُورا کرنے پر تُلا ہوُا تھا اور معاشرۂ انسانی کی بعینہٖ وہی کیفیت تھی جو سمندر کی مچھلیوں کی ہوتی ہے۔ یعنی ہر زبردست شخص اپنی خواہشات کی تکمیل کے درپے تھا، اور جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہے اسی طرح وہ بھی اپنے مطمعِ نظر کے سامنے کسی کی حقیقت نہیں سمجھتا تھا۔ کوٹلیا اس صورتِ حال کو متسیا نیایا یعنی "قانونِ ماہی" کا لقب دیتا ہے۔ اور اس طرح سیاسی لغت میں ایک نئی اصطلاح کا اضافہ کرتا ہے۔ بہرحال اُس کے نزدیک جب صورتِ حال اس قدر ناقابلِ برداشت ہوئی تو لوگوں نے ایک حکمران کی ماتحتی قبول کرلی۔ کوٹلیا یہ نہیں کہتا کہ اس حکمران کا انتخاب باضابطہ ہوُا ہوگا۔ بلکہ وہ محض حکمران کے احکام کو تسلیم کرلینا ہی اِس انتخاب کے واقعے کے لئے کافی تصوّر کرتا ہے[2]۔

چینی نظریے۔ تقریباً اسی زمانے میں چینی فلسفی موہ تی نے بھی مملکت سے قبل کی حالت کا تجزیہ کیا۔ وہ کہتا ہے کہ مملکت سے پہلے ہر شخص کے نزدیک حق اور ناحق کا تخیل جداگانہ تھا، چنانچہ ایک شخص کسی بات کو حق سمجھتا تھا تو دوسرا شخص نہ صرف اُسی کو ناحق تصور کرتا بلکہ شخصِ اوّل کو اپنے زعم میں گمراہ سمجھتا تھا[3]۔

یورپی نظریے۔ بہرحال یورپ میں مملکت کے قیام سے پہلے کی حالت کا تجزیہ سولھویں صدی عیسوی سے پیشتر کسی نے نہیں کیا، پہلا شخص جس کی تحریروں میں ہمیں اُس کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ہکر ہے۔ ہکر کے بعد جرمن پوفنڈورف اور ولندیزی اسپی نوزا نے بھی اُس کے تجزیے کی کوشش کی، لیکن اس موضوع پر سب سے پہلی مرتبہ کامل بحث و مباحثہ کا سہرا انگلستان کے فلسفی طامس ہوبز کے سر ہے جس نے ۱۶۵۱ء میں اپنی کتاب لیوایاتھن کو شائع کرکے مغربی سیاسوں کے لئے ایک نیا مبحث پیدا کردیا۔

---

[1] و [2] گھوشل۔ ہندو کے سیاسی نظریوں کی تاریخ۔ U. Ghoshal A History of Hindu Political Theories باب ۳

[3] بنوے کمار سرکار۔ ہندوں کے سیاسی اِدارت و نظریات۔ Benoy Kumar Sarkar The Political Institutions and Theories of the Hindus. باب ۹ الف

ہوبز۔ کوٹلیا کی طرح ہوبز کے نزدیک بھی مملکت سے پیشتر متسیانیایا کی کیفیت ہوگی۔ چونکہ اس فطری حالت میں قانون کا بالکلیہ فقدان تھا۔ اس لئے حق و باطل، انصاف و بے انصافی کا وجود ہی نہ تھا۔ ہر شخص کو اپنی جملہ خواہشات نفسانی کے پورا کرنے کی کامل آزادی حاصل تھی۔ اور چونکہ انسان فطرتاً خود بین اور خود غرض ہے۔ اس لئے ہمیشہ مختلف لوگوں کی خواہشات میں باہم تصادم ہوتا رہتا تھا۔ یہ صورتِ حال اس قدر ناقابل برداشت ہوگئی کہ لوگ اپنی زندگی تک سے عاری ہوگئے۔ اور انہوں نے آپس میں یہ معاہدہ کیا کہ ہر شخص اپنی آزادی اور قوتِ عمل سے بالکلیہ دست بردار ہوجائے۔ بشرطیکہ باقی اشخاص بھی اسی طرح دست برداری دے دیں۔ ساتھ ہی جملہ افراد نے باتفاق رائے اپنے اوپر حکومت کرنے کا اختیار جزوی وکلی ایک ایسی شخصیت کے سپرد کردیا جسے ہوبز "مقتدر اعلیٰ" کا لقب دیتا ہے۔ چونکہ یہ کارروائی محض اس لئے ہوئی تھی کہ بغیر اس کے ملک میں امن وامان رہنا ناممکن تھا۔ اس لئے مقتدرِ اعلیٰ کا فرض اولین یہ ہوا کہ ملک میں امن وامان قائم رکھے۔ اور لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرے۔ چنانچہ جب تک وہ اس اساسی شرط کو پورا کرتا رہیگا یعنی جب تک وہ امن قائم رکھے گا۔ اُس وقت تک اُس کا حکم ماننا ہر شخص پر فرض ہوگا۔ خواہ وہ حکم بادی النظر میں کیسا ہی بے انصافانہ کیوں نہ ہو۔

لاک ۔ ہوبز کے بعد جس فلسفی نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا وہ بھی اُس کی طرح ایک انگریز مسمی جان لاک تھا۔ جس نے اپنی کتاب ۱۶۹۰ء میں شائع کی۔ ہوبز کے نزدیک تو مقتدرِ اعلیٰ کا مطلق العنان ہونا قیامِ مملکت کے لئے لازمی تھا۔ لیکن ہابز کے وقت سے لے کر لاک کے زمانہ تک یہی امر شاہِ انگلستان و رعایائے انگلستان کے درمیان مابہ النزاع رہا تھا کہ آیا بادشاہ کو حقوقِ مطلق العنانی حاصل ہیں یا نہیں۔ انگریز چارلس اول کا سر قلم کرچکے تھے انہوں نے جیمز دوم کو ملک سے نکال دیا تھا۔ اور اکثر شاہی اختیارات سلب کر کے ایک غیر ملکی ولیم سوم کو تختِ انگلستان پر بٹھادیا تھا۔ لیکن باوجود اِن تمام انقلابات اور باوجود ہوبز کے نظریہ کے انگلستان کی مملکت برابر قائم تھی۔ لاک نے یہ محسوس کیا کہ اُس کے پیشتر کے نظریہ میں کچھ نہ کچھ خامی ہے اور اِس کی ضرورت سمجھی کہ ایک نیا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔

لاک کے نزدیک یہ غلط ہے کہ مملکت کے آغاز سے پیشتر کسی قانون کا نفاذ نہ تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت بھی قانونِ قدرت رائج تھا۔ ہر انسان میں عقل وشعور کے جذبات موجود تھے۔ وہ حق اور باطل انصاف اور بے انصافی میں تمیز کرسکتا تھا۔ ہر شخص کو ہر چیز پر قبضہ کرنے کا قدرتی اختیار تھا۔ بشرطیکہ وہ دوسروں

کا سدّراہ نہ بنے۔ لیکن اس قانون کی تاویل کرنے کا استحقاق بجائے کسی ثالث کے ہر ایک فرد کو حاصل تھا۔ اس صورت حال میں ایک سقم یہ تھا کہ چونکہ ہر شخص اپنے افعال کا خود ہی جج تھا۔ اس لئے اکثر و بیشتر کسی خاص امر کے متعلق مختلف افراد کے فیصلوں میں تصادم ہوتا رہتا تھا۔ اِس کے باوجود بھی یہ نہایت آرام دہ کیفیت ناقابلِ برداشت نہ ہو جاتی اگر بعض طماع اور نفس پرست افراد دوسروں کی مقبوضہ اشیا پر جبراً قبضہ کرنا نہ چاہتے، جس کی وجہ سے نہ صرف لوگوں کے مقبوضات بلکہ اُن کی آبرو اور زندگی بھی معرضِ خطر میں پڑ گئی۔

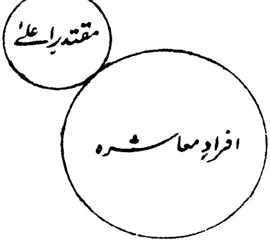
لاک کے نزدیک معاشرۂ سیاسی کا اولین مقصد انسان کی زندگی، تندرستی، آزادی اور مملوکات کی حفاظت ہے۔ اسی مقصد کی تکمیل کے واسطے ابتدائی انسانوں نے آپس میں سمجھوتا کر کے یہ معاہدہ کر لیا کہ وہ قانونِ فطرت کی خود ہی تاویل اور نفاذ کرنے کے بجائے اس اہم فرض کو کل قوم کے سپرد کر دیں گے، اور جب اس طرح معاشرۂ سیاسی قائم ہو گیا تو سب نے ایک شخصِ واحد کو اپنا حکمران قرار دے کر اپنی جانب سے اُس کو نفاذِ قوانین اور تاویلِ قوانین کا اختیار دیا۔ بشرطیکہ وہ ابتدائی معاہدے کے مقصدِ اولین کو پورا کرتا ہے۔ یعنی افراد کی آزادی، زندگی، آبرو اور ملک کی حفاظت کرتا رہے۔ ساتھ ہی آپس میں یہ بھی طے ہؤا کہ کثرتِ رائے ہمیشہ قلت پر حاوی رہا کرے گی۔ لاک کی رائے ہے کہ اس معاشری حالت کی ابتدا کا ثبوت محض منطقی دلیلوں ہی سے نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اُس کی بنیاد تاریخی واقعات پر ہو۔ اور یہ محض اِس لئے کہ ہمارے پاس اس کا ثبوت کم ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ واقعہ مطلق پیش نہ آیا ہو گا۔

رُوسو۔ تیسرا ممتاز سیاس جس نے معاہدۂ معاشری پر قلم اٹھایا، جنیوا کا باشندہ ژان ژاک رُوسو تھا، جس نے اپنی مشہور کتاب "معاہدۂ معاشری" کو ۱۷۶۲ء میں شائع کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ اپنی فطری حالت میں انسان کی زندگی نہایت آرام و آسائش سے بسر ہوتی تھی۔ انصاف یا اخلاق کا تخیل تو بالکل مفقود تھا، لیکن ہر شخص بالکلیہ آزاد ہونے کی وجہ سے فطرتاً دوسروں کے احساسات و جذبات کا پاس کرتا تھا۔ اس حالت میں کوئی چیز کسی کی مملوکہ نہ تھی۔ بلکہ غیر مقبوضہ چیز پر ہر شخص کو قبضہ کرنے کا حق تھا۔ یہ عہدِ زریں ایک ایسا عہد تھا جس کا خاتمہ مستقل مملوکات کے رواج اور قوی و زوردار افراد کی حرص کی وجہ سے ہمیشہ کے واسطے ہو گیا۔ جب مختلف اشیا مختلف افراد میں تقسیم ہو گئیں اور زبردست زیردست پر مظالم ڈھانے لگا۔ تو امن قایم کرنے کی صرف ایک صورت نظر آئی، وہ یہ کہ تمام افراد متحد اور مجتمع ہو کر ظالموں اور غاصبوں کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ ہر ایک شخص نے اپنی ذات اور اپنے جملہ اختیارات سے دست بردار ہو کر اپنے آپ کو تمام قوم کے اقتدار کے ماتحت کر دیا۔ رُوسو کا خیال ہے

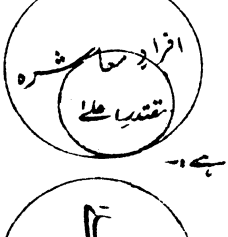
کہ اس ترکیب سے غاصب اور ظالم مغلوب ہو گئے۔ اور ساتھ ہی چونکہ ہر شخص اس نئی جماعت کا ایک رکن تھا۔ اس لئے آزادی میں بھی کمی پیدا نہیں ہوئی؎

؎ ہوبز، لاک اور روسو کے نظریوں کے اختلافات کے باعث اُن کے قائم کئے ہوئے حکمرانوں کے اختیارات میں بھی بڑا فرق ہے۔ ہوبز کہتا ہے کہ لوگوں نے اپنی فطری عادات سے تنگ آکر اپنے جملہ اختیارات ایک مقتدرِ اعلیٰ کے سپرد کر دیئے۔ اس کے نزدیک خواہ یہ "مقتدرِ اعلیٰ" شخصِ واحد ہو یا ایک مرکب جماعت، اُسے سیاہ و سپید کا کلی اختیار حاصل ہے اور ہر شخص کو اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ضروری ہے۔ لاک کے نزدیک مقتدرِ اعلیٰ کا تقرر چند خاص اسباب کی بنا پر ہوا ہے اور اُس کا اقتدار مشروط ہے۔ تاوقتیکہ وہ جان مال اور آبرو کی حفاظت کرتا رہے گا اُس کا اقتدار قائم رہے گا۔ ورنہ لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اکلیلِ اقتدارِ اعلیٰ اُس سے چھین کر کسی اور کو دیدیں۔ روسو کے خیال کے مطابق مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ باشندگانِ مملکت ہی کو حاصل ہے۔ اور وقتی حکمران کی حیثیت خادم سے زیادہ نہیں ہے۔

ان تینوں سیاسوں کے نزدیک باشندگانِ مملکت اور مقتدرِ اعلیٰ میں جو تعلق ہے وہ مفصلہ ذیل شکلوں سے واضح ہو سکتا ہے۔



(۲) لاک کے نزدیک پہلے معاشرہ سیاسی منظم ہوا، اس کے بعد معاشرہ نے اپنے میں سے ایک شخص کو مقتدرِ اعلیٰ اس شرط پر مقرر کیا کہ وہ جان، مال اور آبرو کی حفاظت کرے گا



(۳) روسو کے نزدیک افرادِ معاشرہ ہی کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے۔



اِن نظریوں کا مشترک عنصر۔ ان تمام نظریوں میں، خواہ اُن کے پیش کرنے والے ہندوستانی ہوں یا چینی، انگریز ہوں یا فرانسیسی، ایک چیز مشترک ہے، اور وہ یہ کہ بنی نوعِ انسان کی تاریخ دو بڑے بڑے حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے، یعنی تنظیمِ مملکت سے پیشتر کا زمانہ اور اس کے بعد کی حالت۔ مملکت کے قیام سے پہلے کی کیفیت کی بابت سیاسوں کے درمیان باہمی اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف کی اصل بنا انسان کی فطری حالت کی حقیقت ہے۔ بعض کے نزدیک انسان فطرتاً ہمیشہ سے حریص، خود غرض، لڑاکو واقع ہوا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ خواہ اِس کی حالت منظم ہو یا نہ ہو، وہ چند قوانینِ قدرت کا اتباع کرتا ہے۔ اور اس میں اور باقی جانداروں میں جو امتیاز ہے وہ عقل، فہم اور ادراک کے وجود پر مبنی ہے۔ انسانیت کے معنے ہی یہ ہیں کہ مختلف انسانوں میں فہم و ادراک کی صفات موجود ہوں، اور یہ کہنا کہ ازل سے ہی انسان محض خود غرض یا محض حریص ہے۔ صریح غلط بیانی ہے۔ لیکن ثانی الذکر سیاس بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ رفتہ رفتہ بعض زبردست افراد میں خود غرضی اور حرص کے جذبات پیدا ہو گئے۔ چنانچہ ہر ایک کے نزدیک معاہدۂ معاشری سے پیشتر بنی نوع انسان میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور اسی کے انسداد کی غرض سے آخر کار معاشرۂ سیاسی قائم کرنا پڑا۔

اصولِ معاہدۂ معاشری کی تنقید۔ یورپ اور امریکا پر ان نظریوں کا اثر نہایت عظیم الشان پڑا۔ ممالک متحدہ امریکا اور فرانس کے انقلابی دستوروں کے فقرے کے فقرے رُوسو کی تحریروں سے لئے گئے ہیں۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے اواخر ہی میں سیاسوں میں اس کے خلاف ردِّ عمل پیدا ہو گیا۔ اور ایڈمنڈ برک، جیریمی بنتھم اور داؤد ہیوم نے اپنے دلائل سے گویا کہ اُس کا خاتمہ کر دیا۔ لاک کا یہ قول کہ عدمِ شہادت سے عدمِ واقعہ ثابت نہیں ہوتا بالکل لایعنی ہے۔ ہوبز کے نظریے کی بنیاد بھی ایک حد تک واقعات اور منطقی استدلال پر تھی۔ لیکن لاک کا ایک طرف تو ثبوت کے فقدان کو تسلیم کر لینا اور دوسری جانب معاہدے کو بطور ایک واقعہ کے پیش کرنا۔ ایک امرِ لاطائل ہے۔ اگر یہ تھوڑی دیر کے لئے فرض بھی کر لیا جائے کہ کسی ایک وقت میں بنی نوع انسان یکجا بیٹھے، اور اُنھوں نے آپس میں یا کسی شخصِ ثالث سے کسی قسم کا معاہدہ کیا۔ تاہم یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اُن ابتدائی معاہدہ کرنے والوں کی اولاد پر بھی اُس کے شرائط کی پابندی فرض ہے۔ دوسرے ہم جانتے ہیں کہ موجودہ پیچ در پیچ قانونی تخیلات صدیوں کے ذہنی ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ جب انسان منظم ہی نہ تھا اور جب آپس کے تعلقات تقریباً مفقود تھے تو پھر معاہدہ جیسے پیچیدہ قانونی تخیل کا اُنہیں احساس پیدا ہونا، اس احساس پر اُن کا عمل کرنا، اور ہر ایک

فرد کا، خواہ وہ زبردست ہو یا کمزور، چھوٹا ہو یا بڑا، بختی سے کاربند ہونا کم وبیش ناممکنات سے معلوم ہوتا ہے۔
نیز یہ مسئلہ بھی قابلِ غور ہے کہ آخر اس معاہدے کو استحکام کیوں حاصل ہؤا۔ اس کے دو ہی اسباب ہو سکتے ہیں،
ایک تو یہ کہ مقتدرِ اعلیٰ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے معاہدے کا قیام چاہتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ افرادِ
معاشرہ امن وامان کے خواہاں ہیں۔ لیکن اگر محض مقتدرِ اعلیٰ کی خواہش ہی پر قیامِ معاہدہ کا دارومدار ہے
تو پھر معاشرۂ سیاسی جبر واکراہ ہی پر منحصر ہؤا۔ اور اگر اس کی بنیاد افرادِ معاشرہ کی خواہش پر ہے تو پھر ایک دُور
رس نقاد یہ بھی سوال کر سکتا ہے کہ آخر افراد کو فی الجملہ امن وامان کی خواہش کیوں ہوتی ہے۔ تقریباً اسی قسم کی
تنقید ہوبز، لاک، روسو اور تمام اُن سیاسوں کے نظریوں کی کی جا سکتی ہے جنہوں نے معاہدۂ معاشری کے
تخیل کو پیش کیا ہے۔ آخر میں صرف یہ کہنا باقی ہے کہ روسو کے نزدیک ہیئتِ اجتماعیہ پیدا ہونے کے بعد ہر
ایک شخص پہلے کی طرح بالکلیہ آزاد رہا۔ اِس نظریے میں جو مغالطہ ہے وہ صاف ظاہر ہے۔ ہر شخص کی دو حیثیتیں
ہوتی ہیں۔ ایک انفرادی دوسری اجتماعی۔ اجتماعی حیثیت جملہ افراد کی انفرادی حیثیتوں کا نام نہیں بلکہ وہ
ایک علیحدہ تخیل ہے جو گویا ان تمام انفرادی حیثیتوں کی کیمیاوی ترکیب سے بنا ہے، چنانچہ خود روسو ان دونوں
تخیلات کے مابین امتیاز کر کے اجتماعی اداروں کو "مشیتِ عامہ" اور انفرادی اداروں کے مجموعے کو "مشیتِ
عوام" کا لقب دیتا ہے۔

ہم نے نظریۂ معاہدۂ معاشری کو دو اسباب کی بنا پر اس قدر اہمیت دی ہے، ایک تو یہ کہ کم وبیش پانچویں
صدی ق م سے انیسویں صدی عیسوی تک مشرق ومغرب دونوں کے بعض بڑے بڑے نظریہ ساز یکے بعد
دیگرے اسی نظریہ کے مغالطے میں پڑے رہے۔ دوسرے مختلف سیاسوں نے اُس کی مختلف شکلیں قائم کی ہیں
لہذا اِس کی ضرورت پیش آئی کہ اس پر ذرا تفصیل سے بحث کی جائے۔

نظریۂ تخلیقِ ربانی - نظریۂ معاہدۂ معاشری کے بعد دوسرا کم وبیش عالمگیر نظریۂ تخلیقِ ربانی کا ہے، جس کے مطابق
مملکت کی آفرینش اور قیام انسان کا کام نہیں۔ بلکہ خدا کا کام ہے۔ اِس کے معتقد یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ
خدا نے اپنے چند برگزیدہ بندوں کو تخت وتاج عطا کر کے اُن کے سپرد معاشرۂ انسانی کی تنظیم کر دی ہے۔ لہذا
حکمرانوں کو جو حقوق حاصل ہیں اُن سے انہیں محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظریہ نے مغربی ممالک پر نہایت گہرا
اثر ڈالا، تا آنکہ جرمانیہ کے شہنشاہ کو شہنشاہیت کے ایک خاص معنے کر کے دوسرے عیسائی بادشاہوں سے
مقدس وممتاز سمجھا گیا اور انگلستان میں شاہانِ اسٹیوئرٹ نے اپنی شخصی حکومت کا دارومدار اسی پر رکھا۔ مشرق

میں بھی اس کا ایک خاص اثر پڑا۔ بلکہ شاید یہی اصول ہے جس کے تحت بادشاہوں کو ظِلُّ اللّٰہ کہا جانے لگا۔
لیکن اگر غور کیا جائے تو گو امر بدیہی ہے کہ مملکت کو خدا نے پیدا کیا ہے اور اُسی نے انسانوں کو منظم کر کے
معاشرۂ سیاسی کی بنیاد ڈالی ہے لیکن اِس سے کسی قسم کا استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ خدا نے تو ہر چیز بنائی ہے
ہر مادّی شے اور غیر مادّی تخیل کا مبدا وہی ہے؛ اُس نے نہ صرف انسان میں معاشرہ قایم کرنے کی صلاحیت پیدا
کی بلکہ جانوروں میں بھی ایک قسم کی تنظیم قائم کر دی جس سے خود انسان بھی سبق لے سکتا ہے۔ یہ ہرگز نہیں
کہا جاسکتا کہ انسان کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں مملکت یا حکمرانوں کو کوئی خاص امتیاز حاصل ہے جو دوسری
مخلوقات کو حاصل نہیں۔ خدا تو ہر چیز کا سبب اول ہے؛ اِسی لئے جب ہم کسی خاص تخیل کے مبدا کی تحقیقات
کرتے ہیں تو تخلیقِ ربانی کے اصول کو پہلے ہی سے تسلیم کر لیتے ہیں اور سببِ اول کی تلاش کرنے کی بجائے محض
سببِ ثانی کی جستجو کو کافی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہ خیال کہ چونکہ مملکت کی تخلیق خدا نے کی ہے لہذا مزید تحقیقات
نہیں کرنی چاہیئے، نہ صرف بیکار ہے۔ بلکہ نقصان رساں بھی ہے۔

نظریۂ اقتدارِ ابوی و اموی۔ نظریۂ معاہدۂ معاشری اور نظریۂ تخلیقِ ربانی کے بعد جس نظریہ نے زمانۂ
حال کے سیاسی تخیل پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے وہ ابوی یا اموی نظریہ ہے۔ ارسطاطالیس کے زمانے سے لے کر
انیسویں صدی عیسوی تک مشکل سے کوئی عہد ایسا گزرا ہوگا جس میں سیاسی مفکروں کی ایک جماعت نے ابوی
نظریہ کی تائید میں قلم نہ اُٹھایا ہو۔ اِس کے مطابق مملکت دراصل خاندانوں کے ایک مجموعے کا نام ہے اور
جس طرح ابتدائی زمانوں میں ہر خاندان میں باپ کو اختیاراتِ مطلق حاصل تھے۔ اسی طرح مملکت میں بھی ایک
شخصیت کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہوتا ہے۔ اس نظریہ کے پیش کرنے والے اس کے ثبوت میں ہندو مشترک
خاندانوں کے سربراہ کاروں، بنی اسرائیل کے بطریقوں اور رومن "اقتدارِ ابوی" کے اصُول کو پیش کرتے ہیں۔
زمانہ حال میں اس نظریہ کی یہ شکل قائم کی گئی ہے کہ ابتداً خاندان کا سرگروہ ایک فردِ واحد ہوتا تھا۔ جس کا حکم
جملہ اہلِ خاندان مانتے تھے، اور بعض مقامات میں اس سرگروہ کو اپنے دست نگر افراد پر موت و زلیست کا بھی
اختیار ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ خاندان کے افراد میں توسیع ہوئی اور انہوں نے کنبہ یا قبیلہ کی صورت اختیار کر لی، اور یہ
خیال لوگوں کے دلوں میں اس قدر جاگزین ہوا کہ قبیلے کے افراد اپنے آپ کو ایک ہی مورثِ اعلیٰ کی اولاد ظاہر
کرنے لگے۔ جب ہر قبیلے کی تنظیم میں امتدادِ زمانہ سے استقلال و قوت پیدا ہو گئی تو اُسے اپنے ہمسایہ قبائل کو
مغلوب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ جس کے بعد خواہ مجبوراً ورنہ ارادتاً مختلف قبائل ایک ہی سلسلے میں منسلک ہو

گئے اور مناکحت وازدواج کے قوانین مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مرورِ ایام سے ہم نسل ہونے کا خیال بھی زائل ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آخر کار مملکت عدم سے وجود میں آگئی۔

اس نظریہ کو انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا تک کم وبیش عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا، اور اسے پہلی زک اُس وقت ملی جب لوگوں نے دنیا کا سفر کرکے دور اُفتادہ اقوام کے حالات کی تفتیش کرنی شروع کی۔ اس کے معتقدوں کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُنہیں معلوم ہوا کہ دنیا میں بعض ممالک ایسے بھی ہیں جن میں ایک ایک عورت کو متعدد مردوں سے نہ صرف نکاح کرنے کی اجازت ہے بلکہ عادتاً اور رواجاً ایسا کیا بھی جاتا ہے، مثلاً ملیبار کی بعض ہندو ذاتوں میں ایک عورت کئی مردوں سے شادی کرسکتی ہے۔ جس کے باعث خاندان کی سرگروہ وہی ہوتی ہے اور اُسی کے واسطہ سے خاندانی جائداد کی وراثت پسماندگان کو پہنچتی ہے۔ یہی کیفیت نیپال اور تبت کی بعض اقوام کی ہے۔ جہاں اگر کوئی عورت ایک شخص کے نکاح میں ہو تو وہ اُس کے تمام بھائیوں کی منکوحہ سمجھی جاتی ہے۔ غرض اِن انکشافات کے بعد ابوی نظریہ کے حامی یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہر جگہ باپ ہی خاندان کا سرگروہ ہوا کرتا تھا۔ آج کل اِس نظریہ پر ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی ہے حال ہی میں پروفیسر جنکس نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قدیم ترین سیاسی ادارہ خاندان نہیں بلکہ قبیلہ ہے جو رفتہ رفتہ گھرانوں میں منقسم ہو جاتا ہے، اور اُنہوں نے اپنے اِس خیال کا ثبوت آسٹریلیا کی اصلی اقوام اور کلٹ قوم کی تنظیم سے دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آسٹریلیا میں خاندان کو مطلق کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، بلکہ "قوم" چند مجموعوں پر مشتمل تھی جن میں سے ہر ایک کے لئے ایک نشان مخصوص تھا، (مثلاً ایک مجموعے کے لئے سانپ کی تصویر، دوسرے کے لئے کسی پرند کی تصویر) اور مناکحت وازدواج کے قوانین اسی تفریق پر مبنی تھے، مثلاً کسی نشان والا اپنے ہی نشان کی لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا تھا۔[۵] یہ کم وبیش وہی صورت حال ہے جو ہندوؤں کی بعض ذاتوں میں پائی جاتی ہے، یعنی بعض ذاتوں میں ایک ہی گوتر کے دو افراد باہم شادی کرسکتے ہیں بعض میں نہیں۔ اسکاٹستان اور ایرستان میں بھی قبیلوں کو جتنی اہمیت حاصل ہے اُس کا عشرِ عشیر بھی خاندانوں کو حاصل نہیں ہے۔

نظریۂ جبر۔ بعض سیاسوں کے نزدیک مملکت کی بناء محض جبر وقوت پر ہے۔ ابتدا میں غالباً ایسا ہی ہوا ہو کہ کسی دوررس عقلمند اور قوی شخص نے پہلے تو بہت سے لوگوں کو اپنے زیر اثر کیا، اور پھر اُن کو ساتھ لے کر

---

۵ جنکس: "مملکت اور قوم" Jenks: The State and the nation باب ۳

قرب وجوار کے باشندوں کو اپنی اطاعت پر مجبور کیا۔ جب اُس کی قوت بڑھ گئی اور اُس کا اثر لوگوں کے دلوں پر مستقل طور پر قائم ہو گیا تو اُس نے اُنہیں اپنا حکم ماننے پر مجبور کیا، یہاں تک کہ وہ اُن کا مستقل فرمانروا بن گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کو مان کر کسی ملک میں آزادی اور حقوقِ انسانی کا نام بھی باقی نہیں رہنا چاہئے اور جس طرح محض معاہدۂ باہمی مملکت کی بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا اسی طرح محض جبر پر بھی اس کا مدار نہیں ہو سکتا آج کل کے زمانے میں جب ہر جگہ عمومیت کی لہر دوڑ رہی ہے، یہ کہنا کم و بیش لا حاصل معلوم ہوتا ہے کہ معاشرۂ سیاسی کا دارومدار کلیۃً جبر ہی پر ہے۔

حقیقی ارتقاءِ مملکت۔ اِس موضوع پر جتنی دلیلیں اِس وقت تک پیش کی گئی ہیں وہ سب کی سب انہدامی ہیں، یعنی مختلف نظریے پیش کر کے اُن میں سے تقریباً ہر ایک کا بطلان کیا گیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ واقعتاً مملکت کیسے قائم ہوئی۔ سب سے پہلی بات جو ذہن نشین ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ جملہ سیاسی ادارات ایک تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ایسا تاریخی واقعہ ہم کو نہیں ملتا جس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکیں کہ مملکت کا تخیل انسانوں کے کسی مجموعے کے دماغ میں بلا بیرونی اثرات کے یک بیک پیدا ہو گیا۔ اس خیال کو مدِنظر رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ گو مفصلۂ بالا نظریات میں سے کوئی بھی بالکلیہ صحیح نہیں، بہر کیف ہر ایک میں کچھ نہ کچھ حقیقت کا پہلو ضرور ہے۔ ارسطا طالیس اپنی مشہور آفاق کتاب "سیاسیات" میں کہتا ہے کہ مملکت ایک قدرتی ادارہ ہے اور انسان فطرتاً ایک سیاسی حیوان ہے[۵]۔ دوسرے الفاظ میں اِس کے یہ معنی ہوئے کہ خالقِ اکبر نے بنی نوعِ انسان کے ہر ایک فرد کے لئے یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر اپنی زندگی گزارے، اور ساتھ ہی اُس کو یہ قابلیت ودیعت کی ہے کہ باہمی تعلقات کو مرتب و منظم کرے۔ ساتھ ہی شاید سب سے پہلے اثرات جنہوں نے انسان کو قانون و آئین کی پابندی پر آمادہ کیا وہ مذہبی قواعد ہونگے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ مملکت کا انتظام و انصرام صرف اسی طرح ممکن ہے کہ مختلف افراد کو قانون کی پابندی پر سختی سے مجبور کیا جاسکے اور خلاف ورزی کرنے والوں پر مناسب تشدد روا رکھا جائے۔ اِن سب امور کے بعد بھی مملکت کا قیام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہر ایک فردِ مملکت نہ صرف اپنے دل میں بلکہ اپنے عمل کے ذریعے سے یہ ثابت نہ کر دے کہ باوجود اِن تمام سختیوں کے وہ مملکت کے قیام کا ہمہ تن خواہاں ہے۔

الغرض مملکت کے ارتقا میں یہ تمام عناصر ممد و معاون ہوئے ہونگے۔ غالباً ابتدا میں تو چند ہی

---

[۵] ارسطا طالیس: "سیاسیات" ۱۱۔

افراد کے دماغ میں ایک سیاسی حِس پیدا ہوئی جو رفتہ رفتہ عالمگیر ہوگئی، لیکن یہ حس محض ایک خیال کی حد تک محدود تھی اور سیاسی ادارے اور قوانین کی تنظیم میں شاید سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال صرف ہوگئے۔ رفتہ رفتہ ان قوانین کے نفاذ اور اداراتِ سیاسیہ کے استحکام کے لئے عمال کی ضرورت لاحق ہوئی اور اُن کے تقرر کے بعد گویا مملکت عدم سے وجود میں آ گئی[1]

بہرحال یہ سب بھی محض ایک نظریے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اِس لئے کہ جب اوپر بیان کیا جا چکا ہے، معاشرۂ سیاسی کے ارتقا کے بعد مملکت کی موجودہ صورت کا پیدا ہونا ہزارہا برس کا کام ہے۔ نیز یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ تخیلِ مملکت کا ارتقا ہر جگہ ایک ہی طرح ہؤا ہوگا، بلکہ مختلف حصص دنیا کے جغرافی اثرات باشندوں کے فطری میلانات اور ہمسایوں کے تعلقات بھی اس ارتقا میں ممد و معاون ہوئے ہونگے۔

ہارون خاں شروانی

فہرستِ اصطلاحات جو اس باب میں بیان کی گئی ہیں

اصطلاح	English	اصطلاح	English
اقتدارِ ابوی	Partia Potestas	سیاست دان	Politician
انہدامی دلیل	Destructive argument	عمومیت	Democracy
اسکاٹستان	Scotland	قانونِ فطری	Law of Nature
آیرستان	Ireland	قبیلہ	Tribe
بطریق	Patriarch	کٹم	Clan
تخلیقِ ربّانی	Divine creation	مشیتِ عامہ	Volonté générale
حالتِ فطری	State of Nature	مشیتِ عوام	Volonte de tous
حکمران	Ruler	معاہدۂ معاشری	Social Contract
ریاست	State	نراج	Anarchy
سیاس	Political Scientist	ولندستان	Netherland (Holland)

[1] گارنر: "تمہید سیاسیات" Garner: Introduction to Political Science باب ۱۴ ch. 14

نغمہ

ساغرِ صہبائے رنگیں شعلہ زارِ نغمہ ہے
موجِ مے کی رنگ افروزی شرارِ نغمہ ہے

ناقۂ لیلیٰ کی جنبش میں بہارِ نغمہ ہے
ذرّہ ذرّہ دشت کا منّت گذارِ نغمہ ہے

کہکشاں کا نور کیا ہے رہگذارِ نغمہ ہے
چاندنی کی موج کیا ہے آبشارِ نغمہ ہے

عشقِ غمگیں کاہشِ بے تابئ فریاد ہے
حسنِ رنگیں لرزشِ بے اختیارِ نغمہ ہے

ساز کی آواز پر دھوکا ہے موجِ رنگ کا
پھول کی رنگینیوں پر اعتبارِ نغمہ ہے

وہ خراماں ہوں تو آئے وجد میں کُل کائنات
اُن کی رفتارِ گُل افشاں پر مدارِ نغمہ ہے

محفلِ انجم ہے معمورِ ترنّم عرش پر
عرش کیا ہے دامنِ گوہر نگارِ نغمہ ہے

حُسن کی بے دادبھی رنگ آفرینِ لُطف ہے
عشق کی فریادبھی آئینہ دارِ نغمہ ہے

آج کس فردوس منظر نے اُٹھایا ہے رباب
آج موجِ رنگ سیلِ جویبارِ نغمہ ہے

مدتوں سے ضبط نے روکا ہوا ہے سیلِ درد
مدتوں سے بربطِ دل بے قرارِ نغمہ ہے

شعلہ ہائے عشق میں پوشیدہ ہیں سب راگ رنگ
شعلہ ہائے عشق سے روشن دیارِ نغمہ ہے

تاجدارِ عشق ہوں عآبد دیارِ حُسن میں
میرا اندازِ غزل پروردگارِ نغمہ ہے

عآبد

تاریخِ دُنیا پر ایک نظر

ایران، یونان اور مقدونیہ

۱۱

نئی نسل کی آمد آمد

ہندی یورپی لوگوں کی ابتدا - ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ۲۰۰۰ ق م کے قریب مشرق میں ہندوکش سے لے کر مغرب میں بلقان تک سامیوں حامیوں اور متوسط النسل قوموں کی قدیم و روشن دنیا کو شمال سے ایک نیا ہیبت ناک خطرہ آتا دکھائی دیا + اس سن سے بہت پہلے سندھ کی وادی پر ہندوؤں نے حملہ کرکے اُس پر اپنا قبضہ جمالیا تھا - ۱۹۲۵ ق م کے قریب بابل کو جو ہتی لوٹ مار سے کمزور ہوگیا تھا کاسیوں نے آدبایا - اور کچھ اسی وقت میں متانیوں نے شمالی شام میں آباد ہوکر اپنی ایک حکومت قائم کرلی جس سے مشرق میں آشوری اور شمال میں ہتی ڈرنے کانپنے لگے اور اُسی زمانے میں اکائیوں نے تھیسلی میں آباد ہوکر ایجیئین میں لوٹ مار شروع کردی + یہ تمام قومیں ہندو کاسی متانی اکائی ایک نئی نسل سے تھے جس کا ابھی تک جنوبی دنیا میں کبھی نام بھی نہ سنا تھا + بعد کے ہزار سال میں اُن کے پیچھے انہیں کے ہم نسل میدی ایرانی فریجی لیدی سیمیری دورانی آئیونی سابینی لاطینی کلتی بھی آدھمکے + اس مجموعۂ اقوام کے لئے پہلے "آریا" کا لفظ مستعمل تھا لیکن اس نام کا درست اطلاق صرف اُن کی مشرقی شاخ پر ہوتا ہے - اُن سب کے لئے جو مشترک نام اب مغربی محققین کے ہاں استعمال ہوتا ہے وہ "ہندی یورپی" ہے +

لفظ "ہندی یورپی" دراصل ایک لسانی اصطلاح ہے اس کا اطلاق اُن لوگوں کے وسیع گروہ پر ہوتا ہے جن کی مشترک اصلی زبان کی قدیم ترین نمائندہ سنسکرت ہے اور جس سے بعد میں لاطینی یونانی فرانسیسی انگریزی وغیرہ نکلیں + لیکن اس مشکوک نظریے کو مستند مان کر کہ ابتدائی ہندی یورپی زبان کے بولنے والے ایک ہی نسل کے تھے

اور کرۂ زمین کے ایک خاص حصے میں اکٹھے رہتے تھے یہ اصطلاح نسلی معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ ماہرین علم اللسان نے اُن مشابہ الفاظ کے مطالعہ سے جو تمام ہندی یورپی زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ آریاؤں کے اصلی وطن اور علیحدگی اور نقلِ مکانی سے پہلے اُن کے درجۂ تمدن کے متعلق بعض دلچسپ واقعات پیش کئے ہیں پہلے تو وہ سب اس نسل کے لوگوں کا وطن وسطِ ایشیا اور خاص کر تبت کی سطحِ مرتفع سمجھتے تھے۔ لیکن حال کی باقاعدہ یورپی تحقیقات اور نسلیات کے مطالعہ سے یہ رائے زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ شمال مشرقی یورپ اور بالخصوص گنجان جنگلوں کا وہ خطہ جو دریائے وسچولا اور کوہستانِ یورال کے درمیان لتھوئینیا کے قریب واقع ہے اُن کا ابتدائی وطن تھا۔

ابتدائی ہندی یورپی تمدّن - ایشیائی خانہ بدوش مشرق کے کھلے میدانوں میں رہتے تھے۔ گلہ بان آلپینی وسط کی کوہستانی بلند سرزمینوں کے باشندے تھے۔ زراعت پیشہ قومیں دریاؤں کی وادیوں میں بستی تھیں اور بعض بحری ساحلوں پر آباد تھیں۔ اُن کے مقابل میں ہندی یورپی قومیں شمال کے گنجان جنگلوں اور دلدلوں میں رہنے والی تھیں۔ یہ لوگ بمقابلہ گلہ بانوں یا وادیوں کے خانہ آبادوں کے تعداد میں تھوڑے تھے۔ اُن کی زندگی کٹھن اور سرگرم تھی۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں دلدل اور جنگل حائل تھے۔ اول اول وہ گلہ بانی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بلکہ بجائے بھیڑ یا بکری کے اُن کی گذر اوقات زیادہ تر سیل پر تھی۔ وہ کتے پالتے تھے اور انہوں نے اپنے مشرقی خانہ بدوش ہمسایوں سے گھوڑے کا استعمال بھی سیکھ لیا تھا۔ انہیں کی یورشوں سے اشوری اور بابلی ۲۰۰۰ ق م کے قریب گھوڑے سے واقف ہوئے۔ جب اشوری سلطنت عروج کمال پر تھی تو ہندی یورپی میدی (جو اس وقت بحرِ خزر کے جنوب مشرق میں آباد تھے) اُن کی رعایا تھے اور اُن کا کام اپنے حاکموں کی جنگی رتھوں کے لیے گھوڑے پالنا اور فراہم کرنا تھا۔

لیکن ابتدائی ہندی لوگوں کی طرزِ زندگی نری گلہ بانی کی نہ تھی۔ وہ خانہ بدوش نہ تھے۔ وہ ایک قسم کی معمولی وسیع زراعت سیکھ چکے تھے۔ اُن کی مشترک زبان میں حل چلانے بونے اور کاٹنے کے لفظ موجود تھے۔ باجرا وہ سب سے زیادہ پسند کرتے تھے اور وہ اس سے نہ صرف روٹی پکانا جانتے تھے بلکہ ایک قسم کی شراب بھی نکالتے تھے۔ جس کے نشے میں وہ جنگلوں کی سرد تاریکی اور اپنی دلدلوں کی نمی کو بھول جاتے تھے۔ زراعت کے ساتھ ساتھ حرفت بھی ترقی پا گئی اور اُن کے پاس نہ صرف زمین جوتنے کے آلات تھے بلکہ بیل گاڑیاں عمارتیں اور گھر کا سامان بھی تھا۔

اس کا ہمیں پورا علم نہیں کہ وہ دھاتوں سے کب اور کیونکر آشنا ہوئے + لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰۰۰ ق م سے قبل وہ ان سے واقف ہو چکے تھے اور واقفیت کا سبب یقینی طور پر جنوب کے تمدن سے راہ و رسم کا پیدا ہونا تھا + جب انہوں نے ہندوستان بابل شام ایشیائے کوچک اور بلقان پر یورشیں کیں تو اُن کے سپاہی کانسے کے ہتھیاروں سے مسلح تھے + جب انہوں نے (۱۱۹۴ ق م کے قریب) ٹرائے کا محاصرہ کیا تو اُن کے پاس لوہے کے ہتھیار بھی تھے اور یہی اُن کی کامیابی کا بڑا سبب ہُوا + اُن کی طرزِ حکومت پدرسری تھی۔ مذہب کے معاملے میں وہ جنوبی قوموں سے بہت کم وہم پرست تھے اور جہاں کہیں اُن کے ہاں مذہبی رہنما تھے اُن کی طاقت بہت کم تھی + وہ قوائے فطرت کے پرستار تھے لیکن وحدانیت کی طرف اُن کا بہت میلان تھا۔ یعنی وہ ایک ایسے خدا پر یقین رکھتے تھے جو سب خداؤں کا سردار تھا۔

نقلِ مکانی اور نو آبادیاں۔ ہندی یورپی لوگ اپنے اصلی وطن سے نکل کر استقلال کے ساتھ جنوبی اطراف میں پھیلنے لگے۔ کب انہوں نے نقلِ مکانی شروع کی اور کیونکر مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا کے وسطی میدانوں میں پھیلے اس کا ہمیں علم نہیں + لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں تقریباً تین ہزار میل کے محاذ پر وہ ہندی سامی اناطولی اور ایجین ملکوں کی متمدن جماعتوں پر حملہ آور ہونے لگے + ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آریائی شاخ بحیثیت ایک جماعت کے کچھ عرصہ ترکستان میں (بحیرۂ خوارزم) اور ہندوکش کے پہاڑوں کے درمیان سکونت پذیر رہی اور بعد میں دو فریقوں میں تقسیم ہو گئی جس میں سے ایک ہندوستان کے شمالی میدانوں میں آبسی اور دوسری جس میں سے بعد کے کاسی ایلمی (خوزیی) میدی اور ایرانی نکلے ایران کی بلند سرزمین میں جا آباد ہوئی۔

اس سے مغرب کی طرف بحیرۂ (اخضر) کوہِ قفقاز اور بحیرۂ افشین کی رکاوٹیں ہندی یورپی پیش قدمی کے رستے میں حائل ہوئیں لیکن بتدریج ۲۰۰۰ سے ۱۰۰۰ ق م تک کی ہزار سالہ مدت میں وہ اِن حدود کو عبور کر گئے یا اُن کے اطراف سے گھس آئے۔ میتانی ہلالِ شاداب میں اور شام کے شمالی حصے میں بالائی فرات کے ساتھ ساتھ فاتحین بن کر بس گئے۔ ارمنی اُس بلند سرزمین پر جا ڈٹے جو اُن کے نام سے مشہور ہوئی اور فریجی اور لیدی اناطولیا کے ہتیوں پر چڑھ آئے یہاں تک کہ ۱۲۰۰ ق م میں اُن کو قطعی مغلوب کر لیا +

اس سے پرے ڈنیوب کے علاقے سے یونانیوں کے آباؤ اجداد استقلال کے ساتھ بحیرۂ یونان کے ساحلوں کی طرف بڑھ رہے تھے + پہلے اکانیوں نے ایلیریا سے اُتر کر تھیسلی میں ڈیرے ڈال دیئے جہاں کوہِ اولمپس اُن کے خداؤں کا مسکن بنا + پھر دورانیوں نے ۱۵۰۰ ق م کے قریب ایک فوری اور زبردست یورش

کے بعد جزیرہ نمائے پیلو پونیسس پر قبضہ جمالیا اور سمندر پار ہوکر مجمع الجزائر کے جزیروں پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ انکے بعد ۱۴۰۰ ق م کے قریب یہ آئیونی اور ۱۰۰۰ ق م کے قریب ایولی آپہنچے یہ لوگ مل کر نہ صرف بحیرۂ یونان کے یورپی بلکہ ایشیائی ساحل پر بس گئے یہاں تک کہ منوئی تمدن کا سارا علاقہ اُن کے قبضے میں آگیا۔

ان سے بھی پرے ڈوبتے ہوئے سورج کی سمت جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے لاطینی اور دیگر متعلق قومیں اطالیہ میں گھس رہی تھیں اور اُن ملکوں میں جنہیں اب ہسپانیہ اور فرانس کہتے ہیں کلتی آباد ہو رہے تھے۔

چھٹی صدی ق م کا خاص زمانہ۔ اس طرح ۲۰۰۰ ق م سے کچھ پہلے بغیر اعلانِ جنگ کئے اور ایک وسیع محاذ پر جو بالآخر پنجاب سے لیکر بحرِ اوقیانوس تک پھیل گیا جنوب کے آباد لوگوں اور شمال کے اُن حملہ آوروں کے درمیان ایک ہیبت ناک لڑائی ٹھن گئی۔ یہ جنگ فی الحقیقت عظیم الشان تھی اور اگرچہ لڑنے والوں کو اس کے نتائج سے آگاہی نہ تھی اور یہ پندرہ سو سال تک (بغیر کوئی اہم واقعہ ہوئے) جاری رہی لیکن انسانی نسل کی ساری آیندہ تاریخ اِس کے ساتھ وابستہ تھی۔ ہندی یورپی حملہ آور اس جنگ میں مل کر کسی خاص تدبیرِ حرب پر متفق نہ ہوئے تھے اُن میں کے مشرقی حملہ آور غالباً وسطی حملہ آوروں کی ہستی سے بھی بے بہرہ تھے اور جو وسط میں تھے وہ مغربیوں کی پیش قدمی سے قطعی آگاہ نہ تھے۔

البتہ آخر کار اس وسیع محاذ کے وسط میں ایک اہم اور زبردست جنگ شروع ہوگئی جو واقعی دلچسپ تھی۔ دوآبہ اس کی کا منذار قرار پایا اور متخاصمین ایک طرف آریہ اور دوسری طرف سامی تھے۔ اول اول میدی (جو ۷۰۰ ق م کے قریب آشوری حکمرانی سے نکل چکے تھے) پہاڑوں سے اُتر کر بابلیوں اور مصریوں کے ساتھ ملے اور جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں اُن لوگوں نے نینوا کی ظالمانہ سلطنت کا ۶۰۶ ق م میں قلع قمع کر دیا۔ پھر ایرانی ایران کی سطحِ مرتفع سے نیچے اُترے انھوں نے بابل کے شہر پر قبضہ کر لیا اور ۵۳۸ ق م کے بعد سلطنت کے مالک بن بیٹھے۔ اس بغایت اہم واقعہ کی تفصیل پر ہمیں ابھی نظر ڈالنی ہے۔

لیکن اس سے پہلے اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ یہ وہ وقت ہے جب ہم تاریخ کے ایک نہایت واقعہ خیز زمانے میں پہنچ چکے ہیں۔ چھٹی صدی ق م سے تمام تحریکات کا رُخ حال کی جانب ہوگیا۔ اب نہ صرف ہندی یورپی لوگ سامیوں کی بجائے انسان کے رہنما بن گئے بلکہ بہت سے زبردست اثرات چار دانگِ عالم میں رونما ہوئے۔ چین میں چھٹی صدی کنفیوشس کا زمانہ ہے ہندوستان میں بدھ کا۔ یہودی تاریخ میں یہ قید کا زمانہ ہے اور اشعیا کا اور ایک عالمگیر مذہب کے خیال کے ارتقا کا دور بھی ہے۔ یہی وہ صدی ہے جس میں یونان اپنی قوت اور

اپنے مقدر کو سمجھ گیا - وہ زمانہ جس میں یونانیت نے سر بلند کیا + روما کی تاریخ میں یہ وہ صدی ہے جس میں اٹرسکی استبداد کا خاتمہ ہؤا بادشاہ ملک بدر ہوئے اور وہ شہرۂ آفاق جمہوریہ قایم ہوئی جس کا مستقبل غایت درجہ شاندار ہونے والا تھا + سچ یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں اس صدی کی نظیر نہ پہلے کبھی دیکھی گئی نہ بعد میں ملی!

۱۲

ایران

میدی اور لیدی - اشوریا کے زوال اور ۶۰۶ ق م میں نینوا کی تباہی سے میدی اپنے بادشاہ سائوش کے تحت میں مشرق کی سب سے زبردست طاقت بن گئے + یہ اغلب ہے کہ مشہور کلدانی بادشاہ بخت نصر ثانی بھی جو نئی بابلی سلطنت کا فرمانروا تھا وہ اس میدی بادشاہ کا جس کا صدر مقام ایران کی بلند سرزمین کے شمال مغرب میں ہمدان تھا باج گذار تھا + میدیوں نے اشوریا کی قلمرو کو ارمنی پہاڑوں کی حد تک فتح کر لیا تھا اور قفقاز تک آرمینیا بھی اُن کے زیر اثر تھا - اُس کے پرے اُنہوں نے ہتیوں کے ملک ایشیائے کوچک میں دریائے ہیلس تک اپنی حکومت کو وسعت دی جہاں ایک نئی طاقت نے اُن کی روک تھام کر دی +

یہ نئی طاقت وہ لیدی سلطنت تھی جس کا دارالسلطنت بحیرۂ یونان کے ساحل پر مقام سارڈس تھا اور جس کی مشرقی حدود دریائے ہیلس اور کوہ طارس تھے + ہم دیکھ آئے ہیں کہ ایشیائے کوچک نبرصویں صدی میں ابھی ہتیوں کا ملک تھا جو مشرق میں اشوریوں اور مغرب میں فریجیوں اور لیدیوں سے ڈر کر مصر سے اتحاد پیدا کرنے کی فکر کر رہے تھے + یہ اتحاد بے سود نکلا + ہم نہیں جانتے کہ اُس کا انجام کیونکر ہؤا لیکن اُن کے دارالسلطنت (موجودہ بوغازکی) کے مقام پر آتش و غارت کے نشانات اور معاصرانہ تاریخوں میں اُن کے مفقود الخبر ہونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۰۰ ق م کے بعد جلد وہ تباہ کر دئیے گئے + فریجی اناطولی سرزمین میں آباد ہو گئے اور لیدی ساحل ایجیئن پر جہاں انہوں نے منوئی تمدن اختیار کر لیا +

فریجیوں کو تو سیمیریوں یا سیتھیوں نے جو قفقاز اور بحیرۂ اسود کے پرے سے کسی غیر مہذب خطے کے ہندی یورپیوں میں سے تھے ۶۵۰ ق م کے قریب تباہ کر دیا + جب یہ حملہ آور لوٹے تو لیدی آدھمکے اور انہوں نے

غارت شدہ ملک پر قبضہ جما لیا + یہ ایک ہوشیار اور شائستہ قوم تھے جنہوں نے ایجئین اور دوآبہ کے درمیان تجارت کا سلسلہ قائم کر کے اُس سے فائدہ اُٹھایا۔ ممکن ہے کہ انہیں لوگوں نے پہلے پہل سکّہ رائج کیا + ان کی سڑکیں اور ان کے اردگرد کارواں سرائیں دنیا بھر میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھیں +

ایرانیوں کی آمد۔ چھٹی صدی ق م کے نصف اول میں اُس زرخیز اور مالا مال خطّے پر جو بحیرۂ یونان اور خلیج فارس کے درمیان واقع ہے لیدیا میدیا اور کلدانی بابل اور سلیسیا کی ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست کا قبضہ تھا لیکن اُن کی طاقت بلکہ اُن کی خود مختاری بھی دیرپا ثابت نہ ہوئیں۔

میدیوں کے جنوب کی طرف ایرانی سطح مرتفع پر (جس کے صدر مقام اصطخر اور پسر گاوی تھے) اُن کے ایک ہم نسل اور برائے نام اُن کے باجگذار کچھ لوگ رہتے تھے جنہیں پارسہ یا پارسی کہتے تھے + یہ لوگ مضبوط وجری تھے اور ابھی اُن میں وہ ابتدائی سادگی اور راستبازی پائی جاتی تھیں جو میدیوں میں بوجہ بابل کے عیش وعشرت سے روشناس ہونے کے مفقود ہو چکی تھیں + وہ زراعت کے کٹھن کام میں مصروف رہتے تھے اور انہوں نے صحرا کے قرب وجوار کو جہاں وہ آباد تھے اپنے صبر و توانائی سے گلزار بنا دیا تھا + وہ اپنے اس اہم کاروبار کو ایک مذہبی فرض گردانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ایسا کرنے میں وہ تاریکی و موت کے خلاف ضیا وحیات کی لڑائی لڑ رہے ہیں + خیال کیا جاتا ہے کہ انہیں لوگوں کے ہاں ۱۰۰۰ اور ۸۰۰ ق م کے درمیان ایک مشہور و معروف رہنما پیدا ہوا جس نے اس روحانی جنگ کے خیال کو ایک نئے اور اعلیٰ مذہب کا سب سے بڑا اصول قرار دیا۔ اُس نے صرف ایک خدائے مطلق اہرمزد یا ارمزد کا اعلان کیا جو صداقت وضیا وحیات کا مالک ہے۔ لیکن خدا کے برخلاف اہرمن (جسے یہودیوں نے بعد میں شیطان پکارا) تاریکی بدی اور موت کا مالک تھا جو ازلیت اور بقا میں اُس کا ہمسر تھا انسان کی ساری زندگی اور بالخصوص روحانی زندگی کو زرتشت نے اسی عظیم الشان جنگ کے سلسلے کی ایک کڑی ظاہر کیا +

چھٹی صدی کے شروع میں زرتشت کے ایرانی پیروؤں نے ملک ایلم پر اپنا اقتدار جما یا اور وہاں کے دارالسلطنت سوس کو اپنی قوت کا مرکز بنا دیا + ۵۵۳ ق م میں جب اُن پر ایک غیر معمولی قابلیت کا فرمانروا جسے تاریخ میں کیخسرو کہتے ہیں حکمران تھا تو اُن کی اپنی حکمران قوم میدیوں کے بادشاہ افراسیاب سے لڑائی چھڑ گئی + انہوں نے باجگذاری کا طوق اپنی گردنوں سے اتار پھینکا بغاوت کر کے میدیوں کو شکست دی اُن کے شاہی خاندان کو تخت سے اُتار دیا اور میدی سلطنت کو ایک ایرانی سلطنت بنا کر کیخسرو کو اُس کا شہنشاہ

قرار دیا۔ اصطخر اور سوس کے ساتھ ہمدان بھی ایرانی حکومت کا صدر مقام ہو گیا۔

کیخسرو اور لہراسپ ۔ کیخسرو اور اُس کے ایرانیوں کے آن کی آن میں قوی و طاقتور ہو جانے سے مشرق کی دوسری طاقتوں میں ایک سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔ لیدیا کے حاکم نے اس نو دولت بادشاہت کے خلاف ایک جتھا بنانے میں پہلا قدم اُٹھایا۔ بابل کے مدار المہام بلشزار نے اس کی داد دی اور پھر اماسس شاہ مصر اور یونان کی بعض شہری ریاستیں بھی شامل ہو گئیں۔ سائرس نے اُن کے حملے کا انتظار نہ کیا۔ بلکہ اُس نے اپنی فوجیں مجتمع کر کے سیدھا ایشیائے کوچک کا رخ کیا اور دریائے ہیلس کو عبور کر کے لیدیا میں جا دھمکا جہاں اُس نے سارڈس کی فصیل شہر کے عین نیچے کریسس کو فاش شکست دے کر وہاں کے فرمانروا کو قید کر لیا (۵۴۶ ق م)

لیدی سلطنت ایرانی قلمرو میں شامل کر دی گئی جس کا یہ اہم نتیجہ ہوا کہ ایشائی ساحل کے یونانی شہر لیدی قبضے سے نکل کر ایرانی گرفت میں آ گئے۔ کیخسرو دوسرے اتحادیوں کی سرکوبی نہ کر سکا کیونکہ اُس کے مشرقی علاقے پر عین اسی وقت میں سیدیوں (تورانیوں) نے چھاپہ مارا۔ ۵۴۵ سے ۵۳۹ ق م تک کے چھ برس ان لوگوں کی روک تھام اور شمال مشرق میں دریائے جیحوں (سردریا) سے لے کر جنوب مشرق میں دریائے سندھ تک کے وسیع اور مختلف النوع علاقے میں ایرانی رعب و داب قائم کرنے میں صرف ہو گئے۔

ادھر سے فراغت پا کر ۵۳۸ ق م میں اُس نے بابل کا رخ کیا ایک ہی یلغار میں نہایت آسانی کے ساتھ اُس نے وہ عظیم الشان شہر سر کر لیا اور اُس کے کلدانی شاہی خاندان کو تخت سے اتار کر بابل کی قلمرو کو جو مصر کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی اپنی وسیع سلطنت میں شامل کر لیا۔ اُن لوگوں میں جو اُس کی رعایا تھے یہودی بھی تھے جو ۵۸۶ ق م سے جب بخت نصر نے یروشلم کو تباہ کر دیا تھا "بابل کے ندی کنارے" اپنی جلاوطنی کے دن کاٹ رہے تھے۔ اُس نے فوراً کلدانی حکمت عملی کو تبدیل کر دیا اور اُن جلاوطنوں کو واپس اپنے وطن بھیج دیا کہ جا کر اپنے شہر اور معابد بنائیں اور اپنے مذہب کو از سر نو ترتیب دیں۔ (۵۳۷ ق م)

قدیم دنیا کی بڑی سلطنتوں میں سے صرف ایک مصر باقی رہ گیا۔ اس میں بھی اب اتنی ہمت نہ تھی کہ لیدیا اور بابل کے فاتح کا مقابلہ کرتا لیکن سیدی سرحد پر پھر شور و غوغا برپا ہو جانے سے وہ بارہ تیرہ سال تک بچا رہا۔ کیخسرو کو پھر شمال مشرقی سرحد پر جانا پڑا تھا جہاں ۵۲۹ ق م میں وہ دریائے جیحوں کے قریب راہیٔ عدم ہوا۔ مصر کی فتح اُس کے مشہور بیٹے لہراسپ (۵۲۹ تا ۵۲۱ ق م) کا کام تھا جن کے عہد میں ایران کی قلمرو نے ایسی وسعت و عظمت پائی جیسی اس سے پہلے کسی مشرقی شاہنشاہ کو نصیب نہ ہوئی تھی (۵۲۵ ق م)

دارا اور اُس کی سلطنت ۔ لہراسپ کی بے وقت موت کے بعد کچھ عرصہ ہلچل اور خانہ جنگی میں گذرا۔ لیکن ۵۲۱ ق م کے ختم ہونے سے پہلے گستاشپ کے بیٹے دارا نے جو گذشتہ بادشاہوں کا ایک دور کا قرابت دار تھا تخت پر قبضہ کرلیا۔ اُس نے اس وسیع قلمرو پر چھتیس سال (۵۲۱ سے ۴۸۵ ق م تک) حکومت کی اور حکومت بھی نہایت غیرمعمولی قابلیت اور کامیابی کے ساتھ کی۔ بہت سی حیثیتوں سے ایران کا نظم و نسق جو اُس کے عہد میں منضبط ہوا اُس وقت تک دنیا کی تاریخ میں قطعی بے نظیر تھا۔ بالخصوص دو باتوں میں وہ آشوری طرز حکومت سے جس پر اُس کی بنیاد قائم کی گئی سبقت لے گیا۔ اول یہ کہ اُس کی تنظیم کا مقصد جنگ نہ تھا بلکہ صلح۔ اُس کا دارومدار لوٹ مار پر نہ تھا بلکہ تجارتی کاروبار پر۔ آشوریوں کی سی سالانہ یورشیں جن سے مشرق کے لوگ کانپا کرتے تھے اُس کا معمول نہ تھا۔ دوسرے یہ مذہب کے معاملے میں رواداری تھا۔ اس کا اپنا بلند ایمان سب مغلوب قوموں کے مذاہب میں کوئی نہ کوئی اچھی بات دیکھ لیتا تھا۔ جیسا یہودیوں کی طرف اس کا رویہ تھا ویسا ہی ساری رعایا کی طرف تھا۔

ایرانی سلطنت متفقہ اصول پر منتظم تھی۔ وہ بیس صوبوں میں منقسم تھی اور ہر صوبے میں شہنشاہ کا مقرر کردہ ایک صوبہ دار مقامی دستور کے مطابق تقریباً خودمختاری کے ساتھ حکومت کرتا تھا۔ مرکزی حکومت کی طرف اُس کے فرائض یہ ہوتے تھے کہ وہ تجارت کی راہیں کھلی رکھے۔ امن کا ذمہ دار ہو اور باقاعدہ طور پر خراج ادا کرتا رہے۔ سلطنت کے دور دراز حصوں تک اعلیٰ درجے کی سڑکوں سے رسائی ممکن تھی۔ بالخصوص وہ شاہراہ جو سارڈس سے اناطولیا اور آرمینیا کو طے کرتی ہوئی سوسہ گئی تھی دنیا کا ایک اعجوبہ تھی۔ جس طرح یہ بات ایرانیوں نے لیدیوں سے سیکھی اُسی طرح اُن سے فلزاتی سکّے کا رواج بھی سیکھا اور اُس کو ایسی ترقی دی کہ تجارت خوب پھولنے پھلنے لگی۔ تجارت ہی کی وجہ تھی کہ فن تحریر زیادہ سادہ ہوگیا۔ بحری تجارت نے بہت نشوونما پائی۔ دارا افریقہ میں سائیرین سے لے کر ایجیئن میں سمرنا تک کے سارے لیوانتینی ساحل کا فرماں روا تھا۔ مصریوں فینیقیوں لیدیوں اور یونانیوں سب کے جہاز اُس کے ایک اشارے پر ادھر سے اُدھر چلتے تھے۔

لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا ایشیائے کوچک کے یونانی ایرانیوں کی حکومت کے نیچے بے چین ہوتے گئے۔ پانچویں صدی ق م کے شروع ہی میں اُنہوں نے کھلی بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ یہ وہ بغاوت تھی جس کے نتیجے دنیا کی تاریخ کے لئے غائت درجہ اہم اور معنی خیز تھے۔ اب ہم اُن کی کارروائیوں اور ترقیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔"

(ترجمہ) **بشیر احمد**

حکمیات

پہلے ظرفِ نگاہ پیدا کر
پھر بقدرِ نظر تقاضا کر

گفتگو چھوڑ دے نظر پہچان
ہوش کو روشناس ایسا کر

شکوۂ شش جہت بجا لیکن
کبھی اپنی طرف بھی دیکھا کر

با ہمہ ہو کے بے ہمہ کی تلاش
ہو کے تنہا تلاشِ تنہا کر

ذرّے کی کائنات دیکھتا ہے
ذرّے سے کائنات پیدا کر

ہے بہار، اتحادِ خار و گل
دوست دشمن سے ربط پیدا کر

اذنِ سجدہ ہے خود نشانِ قبول
اے جبینِ نیاز! سجدہ کر

کامیابی بقدرِ ہمت ہے
اپنی کوتاہیوں کا شکوہ کر

غنچۂ ناشناس! آنکھ تو کھول
دیکھ رنگِ چمن، تماشا کر

ذوقِ توحید اور پریشانی
خاطرِ منتشر کو یکجا کر

ظرف اپنا دکھا دیا تو نے
بات بھی کھوئی ہاتھ پھیلا کر

ہاتھ مخلوق سے اُٹھا گویاؔ
خالقِ پاک پر بھروسا کر

شفق

ہیں احمریں شعاعیں زیرِ سحابِ سیمیں
یا پردۂ سما میں اک التہابِ رنگیں
یا دن نے سرخ جوڑا بدلا ہے بہرِ تزئیں

یا دامنِ افق میں کچھ پھول ہیں گلابی
یا گلشنِ شفق میں کچھ پھول آفتابی
یا ماہتابیوں میں اک جلوۂ شہابی

یا پردۂ شفق میں فردوسِ آسماں ہے
یا ابرِ ارغوانی میں بادۂ جناں ہے
یا مژدۂ مسرّت یا شام کا سماں ہے

گویاؔ جہان آبادی

مرزا ننّو

مرزا ننّو (ماں باپ نے تو نواب علی نام رکھا تھا مگر شہر بھر کی بے تکلفی ماں، باپ کے تکلّف کو آسانی سے برطرف کر دیتی ہے) تباہی کی کشادہ شاہراہ پر اچھی خاصی مسافت طے کر چکے ہیں۔ ڈگریاں، قرقیاں، نیلامیاں، گرفتاریاں یکے بعد دیگرے اُن کے ساتھ اپنے اپنے تپاک کے اظہار سے محظوظ ہو چکی ہیں اور وہ بلائے بدجو دنیا کے سو کام میں ہارج ہوتی ہے اور جس کا نام عزت ہے مدتوں پہلے مرزا ننّو کے برہنہ پاؤں سے ٹھکرائی جا چکی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مرزا ننّو تو اب بھی اپنے آپ کو ہمیشہ "عزت دار آدمی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں مگر دنیا کو اُن سے چنداں اتفاق نہیں اور بعض مجسٹریٹوں کی ہٹ دھرمی سے مرزا کا آخری معزز کمائی کا ذریعہ (ایک روپیہ فی گواہی) بھی اب مخدوش حالت میں ہے اور مرزا اس فکر میں ہیں کہ ہو تو کسی چلتے پُرزے تھانیدار کی چلیں بھرنے کی رضاکاری اختیار کریں۔ سوجھتی انہیں خوب ہے اور اس میں شک نہیں کہ کسی کپتان پسند تھانے دار کی بلا تنخواہ نوکری میں علی بابا والے غار کے رازِ پنہاں ہو سکتے ہیں مگر پیشتر اس کے کہ مرزا کچہری کی دنیا سے رحلت کریں اُن کے چند کارناموں کا ذکر ضروری ہے۔

ایک دن مرزا ننّو کسی مقدمے میں شہادت کے لئے عدالت میں پیش ہوئے تو وکیلِ فریقِ ثانی نے اُن کی صورت دیکھتے ہی افسر جلیسی کی خدمت میں عرض کیا کہ مرزا کا کوئی پیشہ نہیں یونہی موقع بے موقع کرایہ پر گواہی دیتے پھرتے ہیں۔ مرزا کا یہ وصف ہمیشہ سے رہا ہے کہ کوئی بات کرتا ہو تو درمیان میں نہیں بولتے۔ جب وکیل صاحب مرزا کے برخلاف اپنی فصاحت کا دریا بہا چکے تو مرزا عدالت سے ملتجی ہوئے کہ مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت دی جائے۔

عدالت۔ کہو۔

ننّو۔ حضور اس عدالت کی تو شان ہی الگ ہے اور میری کیا مجال کہ وکیل صاحب کی طرح کوئی ناشائستہ بات کہوں مگر یہ بالکل غلط ہے کہ میرا کوئی پیشہ نہیں۔

عدالت۔ وَل تمہارا کیا پیشہ ہے؟

ننّو۔ حضور خفا نہ ہوں تو بالکل سچ بتا دوں۔

عدالت ۔ ول جلدی بولو

نبّو ۔ غریب پرور جس طرح بعض عدالتیں وکیل پرور ہیں اسی طرح میں بھی وکیل پرور ہوں ۔ دو ہزار سے زیادہ روپیہ وکلا کو فیسوں کا دے چکا ہوں ۔ کیا وکیل پرور ہونا کوئی بُری بات ہے آخر وکیلوں کے ماں باپ بھی تو اُن کو پالتے ہیں ۔ اور حضور سب کے ماں باپ ہیں ۔

عدالت ۔ تم گستاخ آدمی شریر ہے ۔

نبّو (وکیل کو مخاطب کرکے دبی زبان سے) اب جواب دیجیئے نا اِس بات کا ۔

اِس پر جو فرمائشی قہقہہ عدالت میں ہوُا اُس کا برسوں ذکر رہے گا ۔ اُس روز دور دور سے لوگ مرزا کو دیکھنے آئے ۔ وہ وکیل صاحب سارا دن منہ چھپاتے پھرے ۔ ایک اور موقع پر ایک پٹواری زادہ وکیل مرزا نبو سے تن تن کر الٹے سیدھے سوال کر رہا تھا ۔ خرانٹ مرزا تاک میں تھا کہ موقع ملے تو بدلہ لوں آخر وکیل صاحب گرج کر بولے ۔

وکیل ۔ کتنا فاصلہ تھا ؟

نبّو ۔ تخمیناً پچاس گز

وکیل ۔ ٹھیک یاد ہے کہ تخمیناً ساٹھ گز نہیں تھا ۔

نبّو ۔ آپ کا اختیار ہے پچاس کو ساٹھ کہئے مگر میں تو پٹواری سے پُوچھ کر آیا ہوں ، اس نے پچاس گز بتایا تھا ۔

وکیل ۔ پٹواری تمہارا دوست ہے ؟

نبّو ۔ حضور پٹواری کا کام ایسا ہے کہ بیٹے کو اپنا نہیں بناتا ، مجھے کیا دوست بنائے گا ؟

وکیل صاحب عدالت میں تو بات ٹال گئے مگر وکیلوں کے کمرے میں دوستوں نے اُن کے خوب لتے لئے ۔

ایک اور موقع پر مرزا کی گواہی کے دوران میں اُن سے سوال کیا گیا کہ کیا ملزم کی مقتول سے دشمنی تھی ؟

نبّو ۔ تھی ۔

عدالت ۔ کیوں ؟

نبّو ۔ عورت کے سبب سے ۔

عدالت ۔ کون عورت ؟

نبّو ۔ مسماۃ طوائف

عدالت - کیا دونوں کی دوستی تھی؟
نبّو - حضور دوستی کے سبب سے دشمنی نہ تھی، وہ تو دونوں کو جوتے لگاتی تھی۔
عدالت - پھر کیا دشمنی تھی؟
نبّو - حضور وکیل صاحب کو مسماۃ طوائف کے گھر کے سب حال کا پورا علم ہے - ان سے دریافت کرلیں
عدالت - (جھڑک کر) تم سیدھا جواب دو جو تم کو علم ہے۔
نبّو - حضور دونوں نے مسماۃ طوائف کے حق میں جھوٹی شہادت دی مگر مسماۃ طوائف مقدمہ ہار گئی - ان دونوں کی آپس میں تکرار ہوگئی وہ کہتا تھا کہ تیری شہادت نے مقدمہ خراب کیا وہ کہتا تھا کہ تیری شہادت نے کام بگاڑا۔
عدالت - اِن لوگوں نے جھوٹی شہادت کیوں دی؟
نبّو - کسی وکیل کے کہنے پر۔

بات بالکل سچ تھی اور مرزا کے منہ سے بے تکلف نکلی اور مرزا اپنی لیاقت سے "کسی" کا لفظ ایسی موزوں طرح چسپاں کر گیا کہ عدالت اُس کے سر نہ ہوسکی اور ملزم کا وکیل گویا کٹ کر مر گیا - عدالتوں میں بہت دن "کسی وکیل" کے معنی ایک خاص وکیل رہے۔

وکلا کے ساتھ تو میرزا کے یہی تین مشہور معرکے ہیں مگر چھوٹے اہلکاروں پر تو مرزا کے سترہ حملے زبان زد ہیں - صرف ایک کا ذکر کافی ہے۔

ایک جدید کرنیل ڈپٹی کمشنر جس کو رعایا "موتیوں والا" کے لقب سے اب تک یاد کرتی ہے کچہری سے اُٹھنے کو تھا کہ اردلی نے حسب معمول آواز دی "چلو عرضی سوال والا" مرزا نبو یہ سُن کر بڑھے۔

کرنیل صاحب - ویل کیا ہے؟
نبّو - حضور کیا آپ کے سامنے کسی اہلکار کی جھوٹی شکایت کرنے سے مجھے قید کی سزا ہوسکتی ہے۔
کرنیل - ضرور ہوگی، اگر شکایت جھوٹی ہوگی۔
نبّو - اور اگر جھوٹی نہ ہوئی تو کیا اہلکار کو سزا ہوگی؟
کرنیل - تم بکو - جلدی بکو - تمہارا کیا مطلب ہے؟
نبو - حضور میں شکایت کرتا ہوں - آپ چل کر دیکھ لیجئے۔

کرنیل۔ کدھر ؟

نتّو۔ صرف پچاس گز۔

خدا جانے نبو اور کرنیل کے درمیان کوئی سمجھوتا تھا یا کیا بات تھی مگر کرنیل صاحب نبو سے کہنے لگے کہ "اچھا تم آگے آگے چلو"۔ نبو کرنیل کو سیدھا خزانچی کے کمرے کی طرف لے گیا اور کمرے کے عین باہر جا کر کہنے لگا کہ حضور اس کی گدی کے نیچے جھوٹے سکے درجنوں رکھے ہیں۔ جو رشوت نہ دے چالاکی سے اُن کے روپے بدل دیتا ہے اور پھر روپے کٹوا دیتا ہے۔

کرنیل صاحب نے فوراً بلا تامل گدی کو الٹ دیا۔ نیچے سے بیس روپے سے زائد جھوٹے روپے نکلے خزانچی کا وہ گماشتہ تو موقوف ہؤا اور مرزا کو کرنیل صاحب نے خوشنودیٔ مزاج کا پروانہ دیا۔ مگر آجکل کے ڈپٹی کمشنر مرزا کی نظروں میں کم جچتے ہیں۔ ہمیشہ کہا کرتے ہیں "اگلے حاکم بڑے نرحاکم تھے"۔

فلک پیما

غزل

نور کو ظلمت کے پردے میں نہاں پاتا ہوں میں
ذرّے ذرّے میں نشانِ بے نشاں پاتا ہوں میں

عشق سے پہلے بھی یہ گھر بس کے اُجڑا ہے کبھی
دامنِ عقل و خرد کی دھجیاں پاتا ہوں میں

آشیاں میں مرے آرام کر شوریدہ سر
تیری ہر حرکت میں پنہاں بجلیاں پاتا ہوں میں

کیا تعجب ہے بہار آجائے گلشن میں مرے
پتے پتے کو خزاں کا رازداں پاتا ہوں میں

کیا مرے نالوں میں بھی تاثیر پیدا ہوگئی
اُن کی شرمندہ "نہیں" میں ضبطِ "ہاں" پاتا ہوں میں

اُٹھ کہ اب شاید گناہوں کی سیاہی دھو سکیں
سامنے رحمت کا بحرِ بیکراں پاتا ہوں میں

بار بار اعجاز آتا ہے جنوں پر طیش سا
راستہ بھولے ہوئے جب کارواں پاتا ہوں میں

اعجاز ساندوی

انتظار

(گیت ۴۷ گیتانجلی)

ہجر کی رات بدستور کٹی جاتی ہے
جاگتے جاگتے پھر صبح ہوئی جاتی ہے
آہ اُمید! کہ اب بھی نہیں سونے دیتی
مجھ کو مایوس بھی ظالم نہیں ہونے دیتی
دل یہ کہتا ہے کہ کیا ہو جو کوئی آجائے
اور سوتا ہُؤا دیکھے تو تجھے شرمائے
در کھلا چھوڑ دو سوتا ہوں تو سو جانے دو
کوئی آجائے تو روکو نہ اُسے آنے دو

پائے نازک کی صدا گر نہ جگانا چاہے
اور پازیب کی جھنکار سُلانا چاہے
ہمدمو تم بھی خدارا نہ جگاؤ مجھ کو
اور اس خواب گراں سے نہ اُٹھاؤ مجھ کو
ہیں پرندوں کے خوش آئند ترنم بے کار
اور نسیم طرب افزا کے تراکم بے کار
میں نہ جاگوں گا مری نیند پریشاں نہ کرو
آہ! اتنا تو مجھے اُس سے پشیماں نہ کرو

اے خوشا وہ مری نیندیں وہ مری بیہوشی
اُس کے چھونے پہ جو قرباں ہوں بصد خاموشی
اے خوشا وہ مری جاگی ہوئی آنکھیں پُرخواب
جو کسی نورِ تبسم کے لئے ہوں بے تاب
صرف وہ نورِ تبسم جو کسی چہرے سے
آفتابِ شفقی رنگ کی صورت نکلے
اور تاریکیٔ غمخانہ کو یوں دُور کرے
جس طرح خوابِ صنم نیند کو پُر نور کرے

میری آنکھوں میں وہی نور سما جانے دو
اور دل میں وہی تصویر اُتر آنے دو
صبح دم آنکھ کھلے تو وہی صورت دیکھوں
چڑھتے سورج میں وہی موہنی مورت دیکھوں
اسی نظارۂ دل کش سے محبت بن کر
ایک طوفان اُٹھے موجِ مسرت بن کر
بے قراری ہو مری روح کی بیداری ہیں
اور ہیجانِ عمل ہو رگِ بے کاری ہیں

وندریں راز چنیں باخبرے گردم باز
باز گردم بمنازل کہ بخود جویم باز

(ٹیگور)

طالب باغپتی

فریب

(عثمان کا خط اپنے دوست ریاض کے نام)

ریاض بھائی! چار سال کے بعد لندن سے تمہارا پہلا اور غالباً آخری خط ملا۔

اِس خط کو لکھتے ہوئے تمہارے دل میں ایک شادان و فرحاں شریف النفس انسان کا تصوّر ہوگا لیکن زمانے کی گردش دیکھو کہ بالکل اِس کے برعکس یہ خط ایک ذلیل اور تباہ و برباد انسان کو ملا۔ شاید تم کبھی اندازہ نہ کرسکو کہ اس خط نے ایک منفعل روح، ایک پشیمان دل، اور ایک گناہ کے بار سے تھکے ہوئے دماغ پر کیا اثر کیا۔

تم مجھے میری کامیاب شادی اور اُس کے بعد میرے بچے کی پیدائش پر مبارک باد لکھتے ہو۔ آہ کس وقت تمہیں اس بات کا علم ہؤا جب میں ہمیشہ کے لئے برباد ہوچکا تھا۔ اپنی زندگی کی تمام شادمانیاں میں نے خود اپنے ہاتھوں برباد کردیں۔ اپنا سب کچھ میں کھوچکا ہوں اور خواب کی طرح ایک دھندلی سی یاد کے سوائے اب میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

کالج کے زمانہ میں مَیں نے کئی دفعہ تم لوگوں کو مذاقیہ فریب دیئے۔ اور بعض اوقات تمہاری سخت اذیت کا باعث ہؤا اُس وقت کسے معلوم تھا کہ آخر میں چل کر یہی فریب میری دین و دنیا کی رسوائی کا موجب ہونگے۔ اُف! میں نے اب بھی ایک فریب کیا اور آخرکار خود بھی فریب میں مبتلا ہؤا۔ لیکن اس فریب نے مجھے میری مدتوں کی گہری نیند سے بالکل بیدار کردیا۔

یہاں تک میری تحریر سے تمہیں صرف حیرت ہوگی لیکن آگے آگے جو کچھ میں لکھنے والا ہوں اُسے پڑھ کر عنقریب تم بھی مجھے ایک ازلی شیطان تصوّر کرنے لگو گے۔ لیکن مجھے اس کا ذرہ بھر رنج بھی نہ ہوگا میں بہت رسوا ہوچکا ہوں اور اس سے کہیں زیادہ رسوائی کا مستحق ہوں میں نے محبت کے گلے پر کند چھُری پھیر دی قسامِ ازل کے بہترین عطیہ کو میں نے پاؤں تلے روند ڈالا۔

تمہیں یاد ہوگا کہ تمہاری روانگی کے دنوں میں مرزا محمد عمر صاحب سب جج مرحوم کی صاحبزادی کی خواستگاری کے لئے اَن تھک کوششوں میں مصروف تھا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک میری اور تمہاری خط و کتابت بند

رہی - میں تمہیں رخصت کرنے تک نہ آیا - حالانکہ میرے اور تمہارے درمیان صرف چند گھنٹوں کا راستہ حائل تھا - لیکن میں اپنا کون کون سا عیب بیان کروں شاید میں دنیا میں سراپا عیوب بن کر آیا تھا اور اب ایک ابدی لعنت کا طوق گلے میں ڈال کر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا -

میری درخواست قبول ہو گئی اور چند ہفتے بعد نزہت آرا میرے گھر میں موجود تھی میں اپنی بیوی کے متعلق عجیب عجیب تصورات قائم کئے ہوئے تھا - میرا خیال تھا کہ وہ ایک پیکرِ نور ہو گی جس کی برق پاش ضیا سے میری آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی - اُس کے عادات و اطوار اُس کا ہر انداز اُس کی ہر حرکت اُن خیالی شہزادیوں کی سی ہو گی جو میں افسانوں کی زندگی میں دیکھ چکا تھا اور میرے دل کی اندرونی تہوں میں شاید یہ خیال بھی پوشیدہ تھا کہ اُس کی آمد سے میرے رتبہ میں کوئی عظیم الشان ترقی ہو گی -

ایک لحاظ سے میری یہ خواہشیں امید سے بڑھ کر پوری ہو گئیں - لیکن جانتے ہو جو چیز انسان کو مل جائے وہ اُسے نظر انداز کر کے اُس سے بڑی چیز کی ہوس میں مرتا ہے - پھر مجھ جیسا متلون المزاج انسان - خدایا تیری پناہ - میں بالکل اس کی قدر نہ پہچان سکا - اُس کی ہر نظر سے میں محسوس کرتا کہ وہ مجھے ایک کامل انسان سمجھتی ہے - لیکن میں اُس کی زندگی میں اُسے ایک بار بھی وہ نہ سمجھ سکا جو کچھ وہ تھی - اُس کے ہر قابلِ تحسین فعل کو میں اپنے حسنِ سلوک کا نتیجہ سمجھتا رہا - جتنا عرصہ وہ میری شریکِ زندگی رہی کبھی مجھے شکایت کا موقع نہ ملا لیکن میری خود پسند طبیعت نے ایک دن بھی مجھے اجازت نہ دی کہ اُس کے کسی جوہر کی سچی داد دے سکوں - اُس کا اندازِ طبیعت عجیب پُر وقار اور سنجیدہ تھا وہ ہمیشہ خوش رہنا چاہتی تھی - میں نے کبھی نہ دیکھا کہ وہ کسی تکلیف دہ بات کو اپنے دل میں زیادہ جگہ دے کر ملول ہوئی ہو -

میرا خط طویل ہو رہا ہے اور ابھی تک میں اصل حکایت سے بہت دور ہوں - ہاں میری تباہی کا آغاز یوں شروع ہوا -

شام کے چار بجے میں اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا - اتفاقاً میری نگاہ ایک اشتہار پر پڑ گئی - یہ اشتہار ایک روشن خیال عالی خاندان، خوبصورت اور قابل لڑکی کے رشتہ کے لئے تھا - میں نے اُس بھوکے اور لالچی شخص کی طرح جو مٹھائی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہو اور کھانے کا مقدور نہ رکھتا ہو - کئی بار اس اشتہار کو پڑھا - اور آخر اپنے دل کی اُلجھن مٹانے کے لئے یا خدا جانے کس خیال سے اخبار اُٹھا کر نزہت کے پاس جانے لگا - کاش کہ میں چلا جاتا - یکایک کسی نے باہر سے میرا نام لے کر پکارا

میں نے کہا "اکرم"، جواب ملا۔ "ہاں" میں نے کہا "چلے آؤ"۔ اکرم آتے ہی ایک صوفے پر دراز ہوگیا۔ میں نے کہا "اکرم! لو بھئی بڑا اچھا موقع ہے درخواست کردو۔ اکرم نے اخبار میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اور اس پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر بولا "اوہ میں سمجھا" "مجھے بخوبی معلوم ہے" میں نے ذرا آگے بڑھ کر کہا "کیا کہا" اس نے کہا بھئی بہت بے قرار ہوئے جاتے ہو، لوسنو۔ یہ صاحب جن کی لڑکی کے لئے اشتہار دیا گیا ہے ایک بہت بڑے جاگیردار نوابی خاندان سے ہیں بے انتہا امیر، بے حد روشن خیال اور "حسین" "شخص ہیں" آخری لفظ پر اُس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور کہا واللہ۔ میں نے کہا واہ پھر دیر ہی کیا ہے لو اکرم تیار ہو جاؤ ہم اپنی ایک بھابی نوابی خاندان سے بھی لائیں گے۔ اکرم۔ جی نہیں یہ باتیں کچھ آپ جیسے امیروں کو ہی زیبا ہیں ہم غریب تو اگلوں کو ہی پورا نہیں کرسکتے۔ بس یہ سمجھ لو آدھی درجن بچوں میں تین ہی کی کمی باقی ہے۔ اب اُنہیں سنبھالیں یا اور کی فکر کریں۔ دوسرے میں غریب آدمی ہوں اور میری بیوی ہوئیں امرا سے مجھے ایسا کرنا کب لازم ہے۔

البتہ تم ہر طرح اس کے لائق ہو بیرسٹر ہو لاکھوں کی جائیداد کے مالک ہو۔ اور سب سے بڑھ کر بیوی کے مقابلے میں خاصی حیثیت رکھتے ہو۔ بچہ بھی خدا کے فضل وکرم سے اب تین سال کی عمر کے قریب ہے، ماں کے بغیر بھی رہ سکتا ہے۔ کہو لکھوں خط؟

میں ۔ چپ رہو۔ ابھی کہیں خالد سُن پائے تو فوراً سب کچھ اپنی اماں سے جا کر بیان کردے۔

اکرم ۔ اور وہ تمہیں مار ڈالیں، بھئی واہ بیوی کا بڑا خوف ہے۔ لیکن آج تو ہم ٹلنے والے نہیں۔ یہ جگہ بالکل تمہارے لئے موزوں ہے۔ دیکھو نا۔ امارت بھی موجود ہے حسن بھی آزاد خیالی بھی علم بھی۔ کہو ان باتوں میں سے کونسی چیز کی کمی تم میں ہے؟

میں دل میں تو خوش ہؤا لیکن ظاہرا سب سے انکار کرتا چلا گیا۔ اتنے میں خالد آکر مجھے ایک واقعہ سنانے لگا۔ اُس میں اور آپا کی لڑکی میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نظر جو اٹھاتا ہوں تو اکرم کو کچھ لکھتے ہوئے پایا۔ میں نے پوچھا "یہ کیا"؟ اکرم نے کہا ابھی دکھاتا ہوں۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد اُس نے مجھے ایک پرچۂ خط سنانا شروع کیا جس میں میری طرف سے نواب کے سامنے رشتے کی درخواست کی گئی تھی۔ خط منگانے کا پتہ اُس نے اپنے مکان کا لکھا تھا۔ اور اُس میں یہ بھی ظاہر کردیا گیا تھا کہ چونکہ بزرگ کوئی موجود نہیں اس لئے خود درخواست کی جاتی ہے۔ میں نے سن کر ایک بلند قہقہہ لگایا اور کہا "بھئی

خوب تم تو بڑے مکار نکلے تمہیں تو کہیں مشاطہ ہونا چاہیئے تھا۔" اُس نے کہا "دیکھئے آج ہی سے شروع کرتا ہوں۔" اس کے بعد اُس نے میز پر رکھی ہوئی میری تصویر فریم سے نکال کر خط کے ساتھ لفافے میں بند کر دی۔ میں نے بڑھ کر لفافہ اُس سے چھیننا چاہا لیکن وہ تیزی سے اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ اب اگر میں چاہتا تو اُس کا تعاقب کر کے خط اُس سے چھین لیتا۔ لیکن شیطان کی روح نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔ اور میں کرسی پر لیٹے لیٹے نوابوں کے خواب دیکھنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں نے اسی قسم کے منصوبے باندھنے میں صرف کر دیا۔ اور پھر انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑا ہؤا۔ نزہت مجھے بلا رہی تھی۔ جو کچھ گذر چکا تھا میں نے اُسے وہیں چھوڑا اور اُٹھ کھڑا ہؤا۔

ایک ہفتہ کے بعد اکرم نے مجھے اپنے مکان پر بلایا اور ایک خط مجھے دیا۔ یہ خط نواب کے ہاں سے آیا تھا اور اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے قابلِ اطمینان تصور کرتے ہیں۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے کہا اکرم بھئی اب کوئی نتیجہ نکلے یا نہ نکلے لیکن تم نے تو یہ ثابت کر دیا کہ نوابوں کی بھی ہم پر رال ٹپک سکتی ہے۔ اُس نے گہری نظر سے میری طرف دیکھ کر کہا نتیجہ نہ نکلنے سے کیا مطلب؟ اب اِن بھلے آدمیوں کو دھوکا دو گے کیا؟ میں نے کہا اور کیا کروں؟ بیوی کو کہاں رکھوں۔ اکرم۔ "اُف تم بھی کیسے خفقانی ہو اب بیوی کا سوال لے آئے۔ اُن بیچاری کا کیا ہے دو بھائی ہیں وہ بھی بنجھو اور بے حس، ہزاروں کی جائداد چھن گئی لیکن خدا کے بندے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اب کیا تم پر دعوےٰ کریں گے؟ اول تو وہ کچھ کریں گے ہی نہیں اور اگر کیا بھی تو اُن کی اپنی توہین ہے۔" میں نے ایک مصنوعی آہ بھری اور کہا "اور وہ بیچاری" اکرم "دور ہو جاؤ یہاں سے تمہیں مرد کس نے بنایا تھا۔ عورت سے ڈرتے ہو۔ تمہارے سامنے عورتوں کی کچھ حقیقت ہو گی کیونکہ تم خود بھی اُن سے کم نہیں۔ لیکن میرے سامنے پھر کبھی ایسی بات نہ کرنا۔ میں نے کہا اچھا آ گئے؟ اکرم:۔ آ گئے! آ گئے کیا کسی بہانے سے نکال باہر کرو اور بعد میں فوراً طلاق بھیج دو۔ میں:۔ توبہ توبہ کیسی بُری باتیں کرتے ہو۔ اکرم:۔ اچھا جاؤ جا کر بیوی کے پاؤں دھوؤ کہیں دیر ہو جائے تو جوتیاں پڑیں گی تم جیسے اس قابل ہی کہاں کہ کسی اعلیٰ رتبہ پر پہنچ سکیں۔ میں نے کہا بہت جوش میں نہ آؤ۔ کچھ خدا کا خوف بھی ہے یا نہیں (لیکن یہ سب باتیں بناوٹی تھیں کیونکہ میرا بے ایمان دل مجھے مجبور کر رہا تھا اور میں دل ہی دل میں اکرم کی عالی ہمتی کی داد دے رہا تھا) اکرم بولا "خدا نے کوئی قید نہیں رکھی اُس نے چار بیویوں تک کی اجازت دی ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ ایک ہی رکھو ایک کو نکال دو۔ بہت عرصہ گذار لیا ہر چیز کی آخر کوئی انتہا ہے۔ تم

جیسے آدمی ہی اصل گناہ گار ہونگے جو اپنی تمام آرزوؤں کا خون کر کے جلتے مرتے عمر گذار کر خدا کی ناشکری کرتے ہوئے دنیا سے اُٹھ جائیں گے۔ بھلے آدمی خوش رہو اور خدا کا شکر کرو کہ اُس نے تمہیں ہر طرح سے آزاد پیدا کیا ہے۔ کیوں عورتوں کی طرح بات بات پر وہم کرتے اور خوف کھاتے ہو۔ کوئی تمہیں مار تو ڈالے گا نہیں" میں نے کہا اچھا میں سوچ کر بتاؤں گا۔ اکرم:۔ بس تم سوچتے رہو اور وہ تمہارے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ اب اگر کوئی ادھر سے تمہاری تحقیقات کو آ گیا اور اندر سے بیگم صاحبہ نے پان بھجوا دیئے تو اچھی عزت رہ جائیگی تمہاری میں نے کہا ہاں ہے تو ٹھیک لیکن میری ہمت نہیں پڑتی۔

اس کے بعد اکرم نے مجھے وہ شیطانی چال سمجھائی جس نے مجھے تباہ کر دیا۔ لیکن اس میں اُس کا بالکل قصور نہیں۔ میں جان بوجھ اپنے آپ کو اُس کے ہاتھوں میں دے چکا تھا۔ اور خود اپنے ضمیر کو دھوکا دیتا رہا کہ میں بے قصور ہوں۔ اکرم نزہت کے بھائی کی طرف سے ایک مصنوعی تار بنا کر دلوا چکا تھا "کہ تمہارے بڑے بھائی سخت بیمار ہیں جلد پہنچو۔" وہ ڈاک گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اور میں وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی فرشتۂ مجسم بیوی کے عیوب سوچنے لگا۔ اگرچہ یہ سب خیال ہی تھے۔

تھوڑی دیر بعد تار میرے ہاتھ میں موجود تھا۔ شام کے قریب موٹر میں بیٹھ کر میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

دبے پاؤں میں نے زینہ طے کیا۔ اپنے کمرے کے باہر ہی سے مجھے ہارمونیم کی آواز سنائی دی۔ اور ساتھ ہی ایک گانے کی دلکش آواز۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شام کی یہ پرسکون خاموشی اسی سحر آفرین نغمہ کا اثر ہے تھوڑی دیر کے لئے میں مسحور ہو گیا۔ اُس کی آواز، آہ یہ وہ شے تھی جس میں ہزاروں کوششوں کے باوجود میں کوئی عیب نہ نکال سکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی آسمانی حور شفق کے سنہرے بادلوں میں جھکی ہوئی دنیا والوں کو شام کی آمد کا پیغام سنا رہی ہے۔

یہ آواز اگرچہ سراپا سوز تھی لیکن پھر بھی اس میں ایک قسم کی طمانیت موجود تھی جو چند لمحے بعد میں اُس سے چھین لینے والا تھا۔ مجھے جرات نہ ہو سکی کہ خود بخود اُس کے سامنے جا سکوں۔ میں نے ماما کو آواز دی "رحیماً رحیماً! دیکھو تار والا چلا گیا کیا؟

باجا بند ہو گیا اور وہ آواز بھی ختم ہو گئی ہمیشہ کے لئے۔

نزہت باہر نکل آئی خلاف معمول آج وہ سیاہ ساڑھی پہنے ہوئے تھی اور اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں

مَیں کانپ گیا "کہیں اُسے معلوم تو نہیں ہوگیا" لیکن جلد ہی مجھے یاد آگیا کہ آج اُس کی والدہ کے انتقال کا دن ہے اُس دن کی یادگار میں ہمیشہ وہ سیاہ کپڑے پہنا کرتی تھی۔ میں نے آج کا تمام دن باہر ہی گذار دیا تھا لیکن مجھے اطمینان تھا کہ وہ مجھ سے کچھ نہ پوچھے گی۔ اپنے جذبات پر وہ بہت زیادہ قادر تھی۔ اُس نے کہا "تار ہے؟ کس کا؟" میں نے کہا "تمہارے بھائی جان کا ہے"۔ اُس نے تار میرے ہاتھ سے لے لیا اور پڑھنے لگی۔ میرا تمام جسم کانپنے لگا اور میں جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اندر آئی اُس کا رنگ فق ہوچکا تھا۔ اُس نے کہا گاڑی تو اب رات کے دس بجے ہی جائے گی۔ میں نے کہا "ہاں دس بجے"۔ وہ بولی "تو پھر ہمیں گھر سے نو بجے ہی چلنا چاہئے"۔ میں نے کہا افسوس آج ایک ایسا ضروری مسئلہ درپیش رہا کہ دن بھر مجھے فرصت نہیں ملی اور کل بھی میرا شہر سے غیر حاضر رہنا ناممکن ہے۔ بہتر ہے کہ اس وقت تم دو نوکروں کو ساتھ لے جاؤ میں بھی کوشش کروں گا کہ جلد کسی وقت پہنچ سکوں خالد کو یہیں چھوڑ جاؤ تمہیں راستے میں تکلیف ہوگی میں اپنے ساتھ اُسے لے آؤں گا۔ اُس نے کہا "جی ہاں وہ خود بھی آپ کے بغیر نہ جائے گا"۔

گاڑی کا وقت قریب ہونے لگا وہ بچے کو دیکھنے کے لئے گئی میں نے کہا اسے جگا کر مل لو۔ اُس نے کہا "واہ ایسا ہی کیا میں کوئی مہینوں کے لئے جارہی ہوں۔ خدا بھائی جان کو آرام دے تو میں جلد آجاؤں گی۔ اس وقت اُٹھ کر اُسے تکلیف ہوگی"۔ آیا کو اُس نے تاکید کی کہ بچے کا اچھی طرح خیال رکھے۔ پھر ہم موٹر میں بیٹھ کر سٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ گاڑی آچکی تھی میں نے اُسے سوار کرادیا۔ اُس نے بچے کے متعلق پھر ایک دفعہ تاکید کی اور کہا اگر تم نہ آسکے تو خط ضرور لکھنا میں نے کہا "ضرور۔ اور تم بھی مجھے پہنچتے ہی خیریت کا تار دلوا دینا"۔

گاڑی کی روشنیاں آہستہ آہستہ ہلتی معلوم ہوئیں۔ میں نے دل میں کہا اُن روشنیوں کے درمیان ایک دل کی فروزاں روشنی عنقریب میرے طرزِ عمل سے بجھ کر رہ جائے گی۔ دور تک اُس کی افسردہ نگاہیں مجھ پر جمی رہیں اور جہاں تک نظر نے کام کیا مجھے اُس کا خوبصورت چہرہ دکھائی دیتا رہا۔ میری آنکھیں نمناک ہوگئیں اور میرا جی چاہا کہ کسی غیبی طاقت سے گاڑی رک جائے میں سب باتیں اُس سے کہہ دوں اور اُسے واپس لے جاؤں۔

گاڑی اوجھل ہوچکی تھی مجھے اکرم کا خیال آیا اور میں نے شکر کیا کہ دل کی باتیں دوسرے کو معلوم نہیں ہوجاتیں ورنہ اِس وقت اکرم مجھے کس قدر بزدل سمجھتا۔ واقعی وہ مجھے اس اعلیٰ رتبہ پر پہنچا رہا ہے جس کے میں قابل ہوں۔ ایک سربمہر لفافہ میں نے لیٹر بکس میں ڈالا۔ یہی میری مسرتوں کا خاتمہ تھا۔ لیکن میری حماقت دیکھو کہ اُس وقت مجھے اپنی ہستی عجیب پُرشکوہ اور شاندار معلوم ہورہی تھی۔ ایک آزاد شہنشاہ کی طرح میں اپنے گھر میں داخل ہوا۔

یہاں ہر طرف ویرانی اور وحشت برس رہی تھی میں نے کہا خزاں کے بعد اب بہار آنے والی ہے۔

رات بھر میں نہ سو سکا۔ ایک نئے طریقے پر زندگی بسر کرنے کے دل خوش کن خیالات سوچتے سوچتے صبح ہو گئی۔

چند دن بعد مجھے نزہت کا ایک خط جو اُس نے نہایت سراسیمگی کی حالت میں سپرد قلم کیا تھا ملا۔ خط میں لکھا تھا "کسی دشمن نے خواہ مخواہ بھائی جان کی بیماری کا تار ہمیں بھیج دیا۔ وہ بالکل تندرست ہیں۔ یہاں تو خیریت تھی لیکن آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا ابھی تھوڑی دیر ہوئی ڈاکیہ ایک خط دے کر گیا ہے۔ تحریر تو تمہاری معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ سُن کر تم حیران رہ جاؤ گے۔ یہ ایک طلاق نامہ ہے۔ میں اسے بھی اپنے خط کے ساتھ بھیجتی ہوں تاکہ تم کچھ معلوم کر سکو۔ یہ خط میں سخت پریشانی کی حالت میں لکھ رہی ہوں اور میں اس واقعہ کا یہاں کسی سے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتی۔"

یہ خط پڑھ چکنے کے بعد پہلے تو میں حیران ہؤا کہ اب کیا کیا جائے۔ لیکن جلد ہی میں نے ایک تدبیر سوچ لی۔ میں نے انسانیت کا جامہ اُتار پھینکا اور حیوانیت اختیار کر لی۔ قلم اٹھا کر میں نے اُسے ایک ایسا خط لکھا جس کے ایک ایک حرف کو پڑھ کر دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اس خط کو ڈاک میں ڈال دینے کے بعد مجھے کچھ اطمینان ہؤا۔ اکرم نے میری "دانائی" کی تعریف کی

اس کے بعد مجھے اُس کا کوئی خط نہ ملا۔

دن گذرتے گئے اور خطوط ہی کے ذریعہ سے نواب کے ہاں سے تمام معاملات طے ہو گئے ہمیں کچھ مسرت بھی تھی اور حیرت بھی کہ وہاں سے کسی نے میری نسبت کچھ تحقیقات نہیں کی۔ لیکن ہم یہ نہ سمجھ سکے کہ تحقیقات خفیہ طریقوں سے بھی ہوا کرتی ہے۔ میرے دل میں اور بھی غرور پیدا ہؤا اور میں نے کہا واقعی میں اسی قابل ہوں کہ میری نسبت کوئی تحقیقات نہ کی جائے۔

شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی چونکہ دونوں طرف روشن خیال اصحاب موجود تھے۔ اس لئے کوئی لمبے چوڑے سامان نہ ہوئے۔ اپنے دوستوں کے ہمراہ میں برات لے کر پہنچ گیا۔ راستے میں کئی افواہیں سننے میں آئیں کوئی کہتا تھا کہ نواب کے ہاں تو کوئی بیٹی ہی موجود نہیں اور کوئی کہتا کہ اُس کی شادی تو ہو چکی ہے۔ ہمیں ان فضول افواہوں کی بالکل پروا نہ ہوئی۔ ہمارے استقبال کے لئے سٹیشن پر کئی معزز لوگ موجود تھے۔ واقعی یہ لوگ نہایت روشن خیال واقع ہوئے تھے ہم ایک خوشنما محل میں داخل ہوئے۔

نکاح ہو گیا اور نواب کی صاحبزادی کوئی درجن بھر ماماؤں کے ہمراہ رخصت ہوئیں۔ جہیز تو کوئی ایسا

شاندار نہیں تھا بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا لیکن معلوم نہیں کہاں سے میرے کان میں یہ بات پڑ چکی تھی کہ نواب صاحب نے ایک بہت بڑی جاگیر بیٹی کے نام کر رکھی ہے۔ اور وہ بیٹی کو ہیروں کے زیور دیں گے۔ مگر دوران نکاح میں اس کا کوئی ذکر نہ آیا۔ میں ان لوگوں کے ساز و سامان دیکھ کر ہی کچھ ایسا مرعوب ہو گیا تھا کہ کسی اور بات کا خیال بھی نہ آیا۔ صبح دس بجے کے قریب عام دوستوں کو رخصت کر کے میں اپنے کمرہ میں داخل ہؤا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور کسی حسن جہاں سوز کے خیال ہی سے آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں۔

اُف! ریاض یقین جانو جو کچھ میں نے دیکھا مجھ پر بجلی گر گئی۔ ایک سیاہ فام چیچک رو فربہ اندام لڑکی سر سے پاؤں تک میری بیوی کے زیوروں سے آراستہ عروسی کا جوڑا پہنے آئینے کے سامنے کھڑی تھی نواب کی ملازمہ، اسے میں ایک دفعہ باہر کام کے لئے آتے بھی دیکھ چکا تھا۔

میں نے بیتابی کے لہجے میں کہا "دلہن کہاں ہے"۔ وہ میری طرف مڑی اور پھر میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ میں نے کڑک کر کہا "دلہن کہاں ہے"، وہ کانپنے لگی۔ میری آواز سُن کر نواب کی تمام نوکریں اندر گھس آئیں ایک بوڑھی سی عورت نے ذرا مجھے ڈانٹ کر کہا۔ بیرسٹر صاحب! آپ تو ہماری بچّی کا خون خشک کئے دیتے ہیں۔ میں نے کہا "نکوست کیا یہ نواب کی بیٹی ہے"؟ وہ صرافہ پہلے ہی کچھ سکھائی پڑھائی معلوم ہوتی تھی کہنے لگی خواہ کسی کی ہو خواہ میری ہو بہر حال آپ نے اس سے شادی کی ہے۔ کیا آپ عورتوں کو دکھ دینے کے لئے ہی شادیاں کرتے ہیں۔ اُس کے اِس فقرے سے بہت کچھ واقعات مجھ پر کھل گئے اور کچھ بعد میں معلوم ہوئے نواب کو معلوم ہو گیا تھا کہ میری شادی پہلے بھی ہو چکی ہے۔ چنانچہ اُن لوگوں نے مجھے سزا دی۔ خیالات کے ہجوم سے میرا دماغ بے کار ہو گیا میں اوپر چلا گیا نواب کو سزا دینے کے لئے میں نے کئی تدبیریں سوچیں لیکن ہر ایک میں مجھے اپنی ہی خفت نظر آئی۔

وہ لڑکی بار بار عجیب و غریب نظروں سے میری طرف دیکھتی۔ کمبخت معلوم نہیں اب اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگی تھی۔ اُف ریاض اُس کی چھوٹی چھوٹی زرد آنکھیں اب بھی میرے دل میں ایک کراہیت پیدا کر رہی ہیں۔ اور اُن کے مدمقابل وہ بڑی بڑی روشن آنکھیں جن کی سیاہ پلکوں میں رخصت کے وقت آنسو جھلک رہے تھے اب مجھے نفرین و حقارت سے گھورتی ہوئی نظر آتی ہیں اور میں کانپ جاتا ہوں۔

دوسرے دن اکرم کئی دوستوں کے ہمراہ آموجود ہؤا اُس شیطان مجسم کے قہقہوں کی آواز دور ہی سے مجھے سنائی دی وہ میرا خوب مذاق بنا رہا تھا۔ میں نے اُس کے ملنے سے انکار کر دیا۔ یوں میری اور اُس کی دوستی

ختم ہوئی۔

میں نے فوراً اُس لڑکی کو طلاق دینا چاہی لیکن وہ ڈھیٹ عورتیں میرا پیچھا چھوڑنے میں نہ آتی تھیں۔ وہ بڑھیا تو مقدمے کی دھمکیاں دیتی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے بہت سا روپیہ ادا کر کے اُن بلاؤں سے نجات حاصل کی۔

اب میں بالکل تباہ ہو چکا تھا ایک ننھے سے بچے کے سوائے کوئی میرا غمخوار نہ تھا۔ بہت کچھ سوچ بچار کے بعد آخر میں نے نزہت کو ایک خط لکھا انسانیت تو یہ تھی کہ وہاں جا کر اُس سے معافی چاہتا۔ لیکن میرا غرور اب بھی قائم تھا۔ دوسرے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں تھا۔ میں نے اس طرح خط لکھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں صرف یہ لکھ دیا کہ تم جلد آجاؤ کیونکہ گھر میں تمہارے بغیر رونق ہی نہیں اور خالد بھی اداس ہے۔ مجھے یہ یقین تھا کہ وہ اِس موقع کو غنیمت جان کر فوراً دوڑی آئے گی میرے بغیر اُس کی زندگی مشکل ہو رہی ہوگی لیکن وہ نہ آئی چند دن بعد مجھے اس کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا "ایک غیر شخص کی حیثیت سے اب تمہیں مجھے خط لکھنا واجب نہیں۔ اس خط سے میری روح کو سخت صدمہ پہنچا۔ جسم ایک فانی چیز تھی اُسے جہاں تک ہو سکا تم رسوا کر چکے۔ لیکن اب میری روح کی تحقیر نہ کرو۔ اس قسم کا کوئی خط اب یہاں نہ آنے پائے صرف میری یہ درخواست ہے کہ میرا بچہ جب تک چھوٹا ہے اُسے میرے پاس رہنے دو اور اس خط کو دیکھتے ہی اُسے یہاں بھیج دو"

لیکن پھر بھی میں نے اُسے یہی لکھا کہ بچے کو وہاں بھیج کر میں خود کیا کروں۔ تم یہاں آجاؤ مجھ پر نہیں تو اسی کے حال پر رحم کرو۔ وہ پھر بھی نہ آئی اُس نے لکھا کہ میری عزت اور خودداری کو جو صدمہ پہنچ چکا ہے اُس کی تلافی حشر تک نہیں ہو سکتی۔ کیوں میری توہین پر توہین کرتے چلے جا رہے ہو۔ کیا میں انسان نہیں ہوں؟ میرا بچہ میرا پیارا میں اُسے بھی خدا کے سپرد کرتی ہوں وہ مجھ سے دور سہی لیکن میرے دل کی دعائیں اس سے بہت نزدیک ہیں خدا اُس کا حافظ و ناصر ہو"

میں کچھ مایوس سا ہو گیا لیکن میری فریب کار طبیعت کو ایک اور ترکیب سوجھی مجھے معلوم تھا کہ وہ بچے کے لئے تڑپ رہی ہوگی۔ اس لئے میں نے اُس کے متعلق ایک دردانگیز خط لکھا جسے پڑھ کر پتھر کا دل بھی موم ہو جائے۔ یہ باتیں اگرچہ بہت کچھ غلط تھیں لیکن پھر بھی ہر بات میں تھوڑی سی صداقت موجود تھی۔ وہ مجھ سے بہت مانوس تھا لیکن یہ فطرت کے خلاف تھا کہ وہ اپنی ماں کو بھول جائے۔ اگرچہ میرے سامنے اُس نے کبھی اپنی اماں کا نام نہ لیا لیکن یہ بھی ظاہر تھا کہ اب اُس کے چہرے پر کبھی وہ حقیقی مسکراہٹ نمودار

نہیں ہوئی۔ اُس کی بناوٹی ہنسی کو ہمیشہ میں محسوس کرتا رہا۔ اُس کا جسم پہلے سے بہت نحیف ہوگیا تھا اور وہ ذرا ذرا سا بہانہ ڈھونڈ کر رونا شروع کر دیتا اگرچہ بچپن کی وجہ سے اُسے خود معلوم نہیں تھا کہ میرے دل میں کیا خلش ہے۔ مجھ سے بھی اب وہ پہلے کی طرح بے تکلف نہیں تھا۔ اور مجھ سے بات بات پر ڈرنے لگا تھا۔ میرے سامنے کبھی اپنی ماں کی کوئی بات نہ کرتا لیکن جو باتیں وہ نوکروں سے کیا کرتا اُن سے صاف معلوم ہوتا کہ اُسے ہر وقت اپنی اماں یاد رہتی ہے۔

دوپہر کے وقت میں اندر کمرے میں بیٹھا تھا آیا باہر فرش پر بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی تھی۔ خالد اپنے چہرے کو ننھے ننھے ہاتھوں کا سہارا دیئے اُس کے قریب بیٹھا مختلف سوال کر رہا تھا۔ مجھے اُس کی آواز سنائی دی "آیا تمہاری اماں بھی تمہاری آنکھوں کو چوما کرتی ہیں؟" آیا نے کہا نہیں بیٹا میری اماں مر چکی ہیں۔ اُس نے کہا "ہوں"، "آیا میری اماں میری آنکھوں کو چوما کرتی ہیں؟" آیا نے کہا تمہاری اماں کہاں ہیں؟ کہنے لگا "مجھے معلوم نہیں"

ایک دن آیا نے نزہت کی ایک پرانی ساڑھی پہن لی اُس دن میں نے دیکھا کہ خالد تمام دن اُس کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ کبھی پوچھتا آیا یہ ساڑھی تمہیں اماں نے دی تھی۔ کب دی تھی؟ کبھی کہتا میرا کوٹ بھی اماں نے مجھے دیا تھا میں مجرموں کی طرح چھپ چھپ کر اُس کی باتیں سنتا اور خود اُس سے کچھ کہنے کی جرات نہ کرسکتا تھا۔

میرے اُس خط کا کوئی جواب نہ آیا کئی دن گذر گئے۔ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کہا سنگدل ظالم عورت بچے کا خیال بھی نہیں کرتی لیکن ریاض سنگدل نہ تھی اُس کا نازک دل اتنے بڑے رنج والم کی تاب نہ لاسکا۔ آہ وہ اس دنیا سے چل بسی۔ اور یہ منحوس خبر جانتے ہو کس وقت مجھے ملی۔ وہ قیامت خیز گھڑی ہیں کیسے بیان کروں۔ میرا دل پھوٹ کر باہر نکل جاتا چاہتا ہے۔ آہ وہ منحوس دن جب کہ اچانک دو بجلیاں مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ ریاض! سنتے ہو مجھ پر کیا کیا گذر گئی، ہاں اس کی موت کی اطلاع مجھے اُس وقت ملی۔ جب میں خالد کو ویران جنگل میں تنہا ہمیشہ کے لئے خاک کے نیچے سلا کر آرہا تھا۔ یہ سانحہ یکبارگی گذر گیا مجھے وہم وگمان بھی نہ تھا۔ میں میز کے قریب بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ مجھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی معلوم نہیں کیوں میں باہر نکل آیا۔ خالد اپنی اماں کا ایک سیاہ سا نقاب پہنے اوپر کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا اور کہہ رہا تھا "آیا دیکھو اماں آرہی ہیں" بے اختیار میں سامنے آگیا۔ گھبراہٹ میں اُس کا پاؤں پھسل گیا۔ لوہے کی تمام سیڑھیوں پر اُس کا سر ٹکراتا رہا ایک لمحہ بعد وہ نیچے آرہا۔ میرا جسم شل ہوگیا تھا مجھ سے ہلا تک نہ گیا۔ ڈاکٹر نے آکر بتایا کہ دماغ پھٹ چکا ہے آہ اس سے آگے میں کیا لکھوں۔

دوسرے دن میں اوپر کی منزل میں اپنی بیوی کے اُس کمرہ میں گیا جہاں اُس کا کچھ سامان وغیرہ پڑا رہتا تھا۔ آہ دو ننھے ننھے پیروں کے نشان گرد آلود صندوق پر ابھی تک موجود تھے۔ اور ایک چھوٹی سی لکڑی جس کے ساتھ خالد نے صندوق پر چڑھ کر کھونٹی سے نقاب اتارا ہوگا۔ بے ہوش ہوکر معلوم نہیں کتنا عرصہ میں وہاں گرا رہا۔

اب میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں لیکن اس تمام انقلاب نے میری آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹا دیا۔ نزہت اگر میرے بلانے پر آ جاتی تو کبھی میں اُسے وہ نہ سمجھ سکتا جو اب سمجھتا ہوں۔ اور اُس نے مجھے بتا دیا کہ حمیت اور غیرت کس چیز کا نام ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ دنیا میں بہترین عورت وہی تھی۔ جسے میں ڈھونڈتا تھا حقیقت میں اُسے پا چکا تھا اور چونکہ خود اُس کے قابل نہیں تھا اس لئے اُس کی زندگی میں مَیں کچھ نہ جان سکا۔ مگر اُس نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا۔ اُس کی یاد کو بھی اب میں اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا ہوں۔ بعض اوقات یہ سب ایک خواب معلوم ہونے لگتا ہے مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ بیش بہا دولت کبھی میرے پاس موجود بھی تھی۔

اب میں سمجھا کہ انسان کو ایک ہی بار جو کچھ مل جائے وہی حقیقی ہے۔ اور جو بار بار کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرے اُس سے زیادہ بیوقوف کوئی نہیں۔ کیونکہ دوسری مرتبہ تو وہ چیز پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ جس قدر محبت میرے حصہ میں آئی تھی اُسے میں نے بے دردی سے ضائع کر دیا اور یہ ایک ایسی چیز ہے جسے بار بار انسان حاصل نہیں کر سکتا اور جب کوئی اسے کھو بیٹھتا ہے تو پھر ساتھ ہی اُس کی تمام مسرتیں اور راحت قلب بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ کیا اب میرے دل میں کوئی دوسری عورت میری بیوی کی جگہ لے سکتی ہے یا کوئی بچّہ خالد کے برابر مجھے عزیز ہو سکتا ہے؟

میں راتوں کو اُٹھ کر باہر نکل جاتا ہوں۔ تمام تمام رات آوارہ و تنہا پھرنے میں گذر جاتی ہے۔ مجھے اب دنیا کی کسی چیز سے دل بستگی نہیں رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک خالی جسم جو ہر قسم کے جذبات سے بے بہرہ ہو چکا ہے کیوں ابھی تک دنیا میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔

عالم تصور میں بار بار مجھے ایک بچّے کی شرارت آمیز ہنسی اور ایک عورت کی ملامت خیز نظریں دکھائی دیتی ہیں۔ میں کانپ اُٹھتا۔ اپنے گناہوں کی ندامت سے میں کانپ اُٹھتا ہوں۔ میری آنکھوں سے آنسو ختم ہو چکے ہیں اب مجھے کبھی رونا نہیں آتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں رونے کی کوشش کروں تو آنسو کا ایک قطرہ بھی میری آنکھوں سے نہ نکلے۔

اب اس جگہ یوں پڑے رہ کر زندگی گذار دینا مشکل ہے میں چلا جاؤں گا یہاں سے دور بہت دور کسی ایسے صحرا میں جس کی ویرانی میرے دل کی ویرانی کی ہمرنگ ہو۔ میں اپنے جسم کو کانٹوں میں گھسیٹتا پھروں گا۔ جب دل کو چین میسّر نہیں تو اس جسم کو کیوں آرام لینے دوں میرا قیام کہیں نہ ہوگا یہ سفر صرف اُس وقت ختم ہوگا جب موت آ کر مجھے اپنے دامنِ عاطفت میں چھپا لے۔

ز ب

عجز و غرور کا مقابلہ

تمہیں ربطِ جور و جفا پر گھمنڈ ہمیں خبطِ مہر و وفا پر گھمنڈ

تمہیں حسنِ دو روز پر نخوتیں ہمیں عشقِ دائم بقا پر گھمنڈ
تمہیں بختِ فیروز پر نخوتیں ہمیں قسمتِ نارسا پر گھمنڈ

تمہیں جبرِ بے جا کی عادت پہ ناز ہمیں تابِ صبر و رضا پر گھمنڈ
تمہیں ایک دنیا کی طاقت پہ ناز ہمیں صرف اپنے خدا پر گھمنڈ

تمہیں تیغِ خوں بار پر نازشیں ہمیں بے ضرر دست و پا پر گھمنڈ
تمہیں خوئے پیکار پر نازشیں ہمیں طبعِ صلح آشنا پر گھمنڈ

تمہیں قبضۂ بحر و بر پر غرور ہمیں ترکِ ہر دو سرا پر گھمنڈ
امیروں کو اموال و زر پر غرور فقیروں کو فقر و فنا پر گھمنڈ

اب آزادؔ تم صاحبِ زر نہ زور
یہ سچ ہے تو پھر کس بنا پر گھمنڈ

حکیم آزاد انصاری

انسان اور الوہیت

ایک دفعہ کا ذکر ہے بلکہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب وقت ابھی پیدا ہی ہُوا تھا جب دیوتاؤں کو معرضِ وجود میں آئے ابھی اتنا عرصہ نہ گزرا تھا کہ اُن کے نام رکھے جاتے، اور انسان کا جسم اُس گڑھے کی مٹی سے جس میں سے کھود کر اُسے بنایا گیا تھا ابھی گیلا گیلا ہی تھا کہ انسان نے دعویٰ کیا کہ ایک پہلو مجھ میں بھی الوہیت کا موجود ہے۔ دیوتاؤں نے اُس کے قول کا وزن کیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ واقعی اُس کا دعوےٰ کچھ اہمیت رکھتا ہے۔

جب انسان کا یہ دعویٰ تسلیم کرلیا گیا تو روایت کہتی ہے کہ دیوتا چوری کے ارادے سے نکلے اور انسان کی الوہیت کو لے اُڑے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسے کسی ایسی جگہ چھپا دیں کہ پھر انسان کی نظر بھی اُس پر نہ پڑ سکے۔ مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اگر وہ اُسے کہیں زمین پر چھپاتے تو اُن کی پیش بین نگاہ دیکھتی تھی کہ انسان اُس وقت تک چین نہ لے گا جب تک وہ زمین کا ذرہ ذرہ چھان کر اُسے نکال نہ لے۔ اگر وہ اسے کہیں اپنے درمیان چھپاتے تو اُنہیں معلوم تھا کہ انسان فضاؤں کو چیر کر آسمانوں تک بھی راستے تعمیر کرے گا۔

اور جب وہ کھڑے یہ مشورے کر رہے تھے تو سب سے عقلمند دیوتا نے کہا:۔

"ادھر لاؤ! میں جانتا ہُوں اسے کہاں چھپانا چاہیے"۔

اُس نے انسان کی الوہیت کی ننھی منی روشنی کو اپنی مٹھی میں بند کرلیا اور جب وہ عظیم الشان ہاتھ کھلا تو روشنی اُس میں موجود نہ تھی۔

دیوتا نے کہا:۔

"اب مطمئن ہو جاؤ میں نے اُسے ایسی جگہ چھپا دیا ہے جہاں سے اُس کے ڈھونڈنے کا خیال تک انسان کے دل میں نہ آئے گا ——— میں نے اُس کو انسان کے اپنے وجود میں چھپا دیا ہے"

کپلنگ　　　　منصور احمد

خدا ہمارے نفس میں موجود ہے۔　　　　اوڈ

جس طرح روح جسم کی زندگی ہے اُسی طرح خدا روح کی زندگی ہے۔ اس لئے جس طرح روح کے جسم کو چھوڑ جانے سے جسم بے کار ہو جاتا ہے اُسی طرح روح مر جاتی ہے جب خدا اُس کو چھوڑ دے۔　　　　سینٹ آگسٹائن

خدا! اے وہ علتِ اولی جسے دنیا نے بہت کم سمجھا۔　　　　پوپ

پیغام بر

۱۸۶۹ء کے موسم سرما میں میں نے اپنا طبی کام کچھ دنوں کے لئے اپنے دو دوستوں کے سپرد کیا اور خود ماسکو میں بین الاقوامی طبی کانگریس میں شامل ہونے کے لئے پیرس سے روانہ ہوا۔ کانگریس کے پہلے پہلے اجلاس حد درجہ دلچسپ تھے۔ وقت کے مشہور و معروف اطبا نئے نئے نظریے پیش کرتے تھے اور اُن نئے نئے طریقوں اور اصولوں پر بحثیں کرتے تھے۔ جو اب بالکل بھُول چکے ہیں۔ اور میں چونکہ اُن دنوں جوان تھا اس لئے ان بحثوں میں نہایت گرم جوشی سے حصہ لیتا رہا۔ کانگریس کی روایات کے مطابق شام کے وقت تمام نمائندوں کو کھانے اور راگ رنگ کی مجلسوں میں بلا لیا جاتا تھا۔

کانگریس کے انعقاد کے تیسرے روز ایک پروفیسر "مسمرازم" کے ذریعے سے، کہ اُن دنوں نفسی طب کے لئے یہی لفظ بولا جاتا تھا، صرع کے علاج پر تقریر کرتا رہا - ایسی ہی دلچسپ اور روح پرور بحثوں کے دوران میں میں نے دور خیالی اور خوابوں کی تعبیر کے متعلق بھی بڑے بڑے حکما کی تقریریں سنی تھیں۔ میں اُن سب کو محض توہم پرستوں کے ایجادات سمجھتا تھا مگر اُس دن جب میں اپنی قیام گاہ کو واپس جا رہا تھا تو مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے میری مادہ پرستی کو کوئی سخت صدمہ پہنچا ہے اور یہی زمانہ تھا جب میں نے زندگی کے متعلق اپنے خیالات کی اصلاح کی۔

اسی شام کو ماسکو کے گورنر نے نمائندوں کے اعزاز میں ایک دعوت دی یہ ایک ایسا مجمع تھا جس میں بڑے بڑے مدبرینِ سلطنت اور عمائدینِ حکومت، بڑے بڑے علما و فضلا اور خوبصورت عورتیں جمع تھیں۔ اب جب کہ بڑھاپا مجھ پر چھا رہا ہے میں اس دعوت کا خیال کرتا ہوں تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ سب کچھ اب خواب و خیال ہو چکا ہے۔ جذبات مردہ ہو چکے ہیں۔ محبت ختم ہو چکی ہے۔ اُس زمانے کے نوجوان لفٹنٹ آج کل بوڑھے جرنیل بن چکے ہیں۔ وہ لڑکیاں جو اُن دنوں نوجوان اور حسین تھیں اب بوڑھی اور خود غرض دادیاں نانیاں ہو چکی ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اُن مہمانوں میں سے اکثر جو اس نہ بھولنے والی دعوت میں شریک تھے اب ہمیشہ کی نیند سو رہے ہیں۔

میں ایک سرجن کے پاس بیٹھا تھا جو فرانسیسی زبان سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور میں ابھی اس زبان میں

مبتدی تھا۔ میری عمر ابھی اُس منزل کو نہ پہنچی تھی جب دل سے مشاہیر پرستی کے تمام خیالات یکسر محو ہو جاتے ہیں۔ میری رومانی نظروں کو دنیا کے عظیم الشان انسان آسمان کے درخشاں ستارے معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی ہستیاں مجھے سطحِ عام سے بلند نظر آتی تھیں۔ میری روح کو کسی ایسے وجود کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جس کے سامنے میں اپنا سرِ نیاز جھکا دوں، جس کی میں پرستش کروں چنانچہ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے امرا و روسا کی اُن لڑکیوں میں سے اکثر کے ساتھ جو اس دعوت میں شریک تھیں مجھے عشق سا ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کم از کم اس وقت میرا درجہ اُن تمام بڑے بڑے حکما کے برابر ہے جو یہاں موجود ہیں۔

کسی نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا یہ ایک عورت تھی جسے میں نہ جانتا تھا اور جو روسی زبان میں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی سازش سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ زرد رو تھی اور اس کا جسم نرم و نازک تھا۔ اُس کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے نقوش نمایاں تھے اور زردی اُس پر غیر معمولی طور سے چھائی ہوئی تھی اُس کی موجودگی اس پُرمسرت اور شگفتہ مجلس میں غم اور افسردگی کے عنصر کی ایک اجنبی آمیزش کر رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی زمہریر کی کھڑکی کھل گئی ہے جس میں سے برفانی ہوا اپنی پوری تندی کے ساتھ کمرے میں برف باری کر رہی ہے۔

چونکہ میں روسی زبان نہ جانتا تھا اس لئے میں نے اپنے سرجن دوست سے ترجمان بننے کو کہا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اِس عورت نے کہیں سے سنا ہے کہ تم دل کے امراض کا بہت اچھا علاج کرتے ہو اور چونکہ اس کا ایک رشتہ دار سخت بیمار ہے اِس لئے وہ تمہیں بلانے آئی ہے۔

ایک سپاہیانہ جوش کے ساتھ میں نے اُسے جواب دیا کہ میں اُس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں۔ گو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اس عظیم الشان دعوت کی شرکت سے محروم ہو جاؤں گا۔ مگر یہی میرے لئے عورت کے بلاوے کو منظور کرنے کا سب سے بڑا باعث ہو گیا۔ کیونکہ نفس کی قربانی میرے نزدیک جوانی کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ اِس کے علاوہ مجھے اس پر ناز ہونے لگا کہ اتنے بڑے بڑے حکما میں سے صرف مجھے منتخب کیا گیا ہے۔

بہر حال میں نے کوئی مزید سوال کئے بغیر اپنی ٹوپی اور اوورکوٹ لیا اور اُس کے ساتھ ہو لیا۔

مجھے یہ تمام باتیں اس طرح یاد ہیں جس طرح کوئی کل کا واقعہ ہو۔ مجھے یاد ہے کہ اُس عورت کے ساتھ جب میں محل کے دروازے کی طرف بڑھا تو اس وقت ایک لڑکی جو سفید لباس میں ملبوس تھی سیڑھیوں پر سے اوپر کی طرف آ رہی تھی جب وہ ہمارے قریب پہنچی تو کھلے ہوئے دروازوں سے جو روشنی باہر آ رہی تھی اُس وقت

اُس کے چہرے پر پڑی ہیں یہ سب کچھ اپنی چشمِ تصور میں اب بھی دیکھ سکتا ہوں اور یہ نظارہ مجھے اُس پرانی تصویر کی طرح نظر آتا ہے جس کا کاغذ زرد پڑگیا ہو۔ مجھے یہ ماضی کا ایک ڈھانچ معلوم ہوتا ہے جس کی جگہ صرف ایک بوڑھے آدمی کے دماغ میں باقی رہ گئی ہو۔

گزرے ہوئے زمانہ کی یاد جہاں کچھ حسرت آفرین سی ہوتی ہے وہاں اُس میں کچھ مضحکہ خیزی بھی ضرور ہوتی ہے۔ اُن دنوں کے لباس دیکھو تو آج کل کے فیشن کا منہ چڑاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اگر آج کوئی اُن عورتوں میں سے کسی کو اپنے بھونڈے لباس میں دیکھ پائے تو کہے کہ ایسی عورت سے بھی کوئی شادی کرے گا؟

باہر آکر حسنِ اتفاق سے ہمیں ایک معمولی گاڑی مل گئی جو عام طور پر ماسکو کے بازاروں میں چلتی ہے اور جس کے آگے تین گھوڑے جتے ہوتے ہیں۔ عورت اُس سے کرایہ طے کر رہی تھی کہ میں نے گاڑی والے کا چہرہ لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ اُس کے رخسار سرخ تھے اور جلد سخت تھی اور اُس پر جھریاں نمودار تھیں۔ گھنی داڑھی تھی اور ناک عام روسیوں کی طرح خفیف سی۔

ہم گاڑی میں بیٹھ گئے اور اُن بازاروں میں سے گزرنے لگے جن کو جگمگاتی ہوئی دکانوں کی روشنی نے بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔ پھر ہم ایسے کھلے اور تاریک مقامات میں آگئے جہاں نظر صرف اشیا کے بیرونی خطوط کو پہچانتی تھی۔ کہیں کہیں اندھیری فضا کے سامنے روسی کلیساؤں کے سفید سفید گنبد بڑی آن سے کھڑے اپنی شانِ تقابل دکھا رہے تھے جن کو دیکھ کر دل پر ایک ہیبت طاری ہوتی تھی۔ تمام راستے میں سوائے بندوقوں سے مسلح سپاہیوں کے ایک دستے کے ہمیں کوئی راہ گیر نظر نہ آیا۔ اب شہر کے نواح سے گزر کر ہم دیہات میں پہنچ چکے تھے۔ قدیم شہر کے شور و غوغا اور چکاچوند کو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ یہاں تاریکی اور بھی زیادہ تھی ہر طرف موسم سرما کی سکوت آمیز شوکت چھا رہی تھی۔ ہر طرف برف ہی برف نظر آتی تھی۔ زمین پر، درختوں پر، درختوں کی شاخوں پر ہر جگہ برف تھی، اور ایک سکونِ کامل تھا جس سے اول اول مجھے کچھ تسکین سی ہوئی۔ مگر بہت جلد میرے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے۔ اور میں محل کی روشنی اور گرمی کیلئے جس کو میں نے بے سوچے سمجھے چھوڑ دیا تھا بہت متاسف ہوا۔ میں اپنی حماقت کو صلواتیں سنانے لگا۔ سفر کے سکوت اور یکسانی سے مجھ پر نیند کا سا غلبہ ہونے لگا۔ مجھے اپنی حالت دگرگوں معلوم ہونے لگی۔ کبھی سمجھتا کہ میں گاڑی میں اکیلا ہوں اور کبھی جانتا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، بہت ہی بوڑھا۔ مجھے ڈر آنے لگا کہ کہیں بھیڑیئے حملہ نہ کر دیں اور میں نے چاہا کہ کاش میں اپنا پستول ساتھ لے آتا۔ میں نہ جانتا تھا کہ میں اُس جرأت کو کیا کہوں جو مجھے یہاں لے آئی تھی، کیونکہ ایک ایسے

ملک میں جہاں ہر طرف خفیہ انجمنوں کا جال پھیلا ہوا ہو ہر ممکن خطرہ پیش آسکتا ہے۔ کیا میں کسی ایسے ہی دام میں پھنسنے کے لئے جا رہا تھا؟ کیا مجھ پر انہیں جاسوسی کا شک ہوا تھا یا کیا انہوں نے مجھے لوٹنے کا تہیہ کر رکھا تھا؟ لیکن اس کے لئے انہوں نے کسی امیر آدمی کو کیوں انتخاب نہ کیا؟ میں نے ہزاروں نظریے قائم کئے اور پھر سب کو رد کر دیا۔

میں تقریباً سو رہا تھا جب ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے کسی کسی مکان کی کھڑکیوں میں سے اب تک روشنی نمودار تھی۔ گھوڑے ہانپ رہے تھے اور اُن کے منہ سے کف جاری تھا۔ گاڑی ایک سرائے نما عمارت کے سامنے کھڑی ہوئی۔ دروازہ کھلا اور مجھے تنباکو کے دھوئیں کے ایک مرغولے میں سے کسی شخص کی تاریک صورت نظر آئی جس نے ایک چغہ اور لمبے بوٹ پہن رکھے تھے۔ ہم گاڑی میں سے باہر آگئے۔ اور مجھے اپنی مضبوط ٹانگیں پھیلا کر ذرا اطمینان حاصل ہوا۔ گاڑی والا سرائے والے سے بات کر رہا تھا مگر وہ عورت مجھے اندھیرے میں اور آگے لے گئی۔ میں اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر حملہ ہوا تو اپنی پوری طاقت سے اُس کی مدافعت کروں گا۔ چاروں طرف کامل سکوت تھا۔ ہم برف میں سے گزر رہے تھے راستے میں ہم نے ایک دوسرے سے کوئی گفتگو نہ کی تھی۔ میں نہایت پریشان تھا اور میرا دماغ عالم لاہوت کے متعلق اُن خیالات سے پُر تھا جن کا تذکرہ ہم شام کے وقت کر رہے تھے۔ مجھے وہ کہانیاں یاد آرہی تھیں جو میری انّا مجھے سُلانے کے لئے سنایا کرتی تھی، اُن بھوتوں کی کہانیاں جو نئی نئی کھدی ہوئی قبروں کے اوپر منڈلایا کرتے ہیں۔ اور میں اپنے دل کی آنکھوں سے قبریں، کفن، کالی کالی شمعیں جو ماتم کے دنوں میں جلائی جاتی ہیں اور تمام وہ وہمی نظارے دیکھ رہا تھا جنہوں نے موت کے خیال کو آلودہ کر رکھا ہے اور اُسے خوفناک اور وحشت انگیز بنا دیا ہے۔ سیاہ اور خاموش تاریکی، اُس کا سحر، رات کی برفانی سردی یہ سب مجھے اُس رات زندوں کی دنیا کی بجائے مُردوں کی دنیا کی چیزیں معلوم ہوتی تھیں۔

آخر کار ہم ایک تاریک سے دیہاتی مکان کے باغ کی دیواروں کے پاس پہنچ گئے۔ مجھے کسی کے پاؤں کی چاپ قریب آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ میں یہ خیال کر کے کہ شاید وہ عورت مجھ سے گفتگو کرنا چاہتی ہے، پیچھے کو مڑا۔ میری حیرت اور خوف کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ غائب ہو چکی ہے۔ میں اب اکیلا تھا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اتنی جلد اور اتنے نامعلوم طریقے سے وہ کہاں چھپ گئی مگر مجھے ان خیالات میں محو ہونے کا زیادہ وقت نہ ملا کیونکہ اسی وقت دروازہ کھلا اور میں نے اپنے سامنے ایک لڑکی کو پایا۔ میں نے

فرانسیسی زبان میں اپنے آنے کا مقصد بیان کر دیا۔ اُس نے رکتے رکتے جواب دیا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ گھر میں سب کی صحت بہت اچھی ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ آپ اندر جا کر میرے والد سے گفتگو کیجے وہ فرانسیسی مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ میں بالکل مایوس ہو رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے مَیں اُس کے پیچھے ہو لیا۔ کمرے میں ایک بوڑھا آدمی آرام کرسی پر مٹی کے ایک چولہے کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر کسی ماہر امراض کے لئے یہ معلوم کر لینا بالکل دشوار نہ تھا کہ یہ شخص دل کی کسی بیماری میں مبتلا ہے۔ اُس کے چہرے کے ارغوانی رنگ میں نیلاہٹ کی ہلکی سی جھلک نمایاں تھی اور ناک کسی شرابی کی طرح سرخ تھی اُس کے ہاتھ میں ایک سگریٹ تھا جو اُس کے دل کی حرکت کے ساتھ ساتھ کانپتا تھا۔

میں نے اُسے سلام کیا اور اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ بوڑھے آدمی نے اپنی عینک کے اوپر سے میری طرف دیکھا اور تیوری چڑھالی۔ ظاہر تھا کہ اُس نے میرے بیان کے ایک لفظ کا بھی اعتبار نہیں کیا اور وہ میرے حقیقی ارادوں سے واقف ہونا چاہتا ہے۔ اُس کے غصہ کو کم کرنے کے لئے اور بے وقت اُس کے آرام میں خلل انداز ہونے کی توجیہ کیلئے میں نے اُسے سارا قصہ سنا دیا۔ اُس نے نہایت توجہ سے میری کہانی سنی اور جب میں ختم کر چکا تو اُس نے کہا:۔

"میں نہیں جانتا کہ تمہارے یہاں آنے کو میں کیا سمجھوں۔ کچھ بھی ہو تم غلطی پر ہو۔ یہاں کوئی بیمار نہیں ہے۔ مگر چونکہ تم نے بے فائدہ بہت سی تکلیف اٹھائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں ذرا دیر آرام لے لو۔ آج رات تم ماسکو واپس نہیں جا سکو گے۔ اس لئے تمہیں یہیں سرائے میں قیام کرنا پڑے گا۔ میں اپنی میزبانی تمہیں پیش کرتا مگر چونکہ ہمارے ہاں مہمان نہیں آتے اس لئے ہم تمہارے آرام کے لئے کوئی خاطر خواہ انتظام نہ کر سکیں گے۔"

اُس نے سگرٹوں کا ڈبا میری طرف سرکا دیا اور اُس کی لڑکی میرے لئے چائے بنا لائی۔ اسی عرصہ میں قریباً قریباً ایک نیم شعوری کی حالت میں مَیں نے ایک نظریہ قائم کیا۔ میں نے سمجھا کہ ہو نہ ہو وہ عورت اسی شخص کی حالت کو سمجھ کر مجھے یہاں بُلا لائی ہے گو خود اسے اپنی مرض کا اندازہ نہیں۔ غالباً اُس نے دیکھا ہوگا کہ ڈاکٹر کا مشورہ نہایت ضروری ہے اور اُس نے مصلحت اندیشی سے کام لے کر اپنے آپ کو ظاہر کئے بغیر ایک ڈاکٹر اُس کے پاس بھیج دیا ہے۔ میں نے بھی اپنا کام پوری حکمت عملی سے انجام دیا ہوتا مگر سفر کی کوفت نے مجھے اُس کی اجازت نہ دی۔

میں نے بوڑھے آدمی سے کہا آپ بالکل اچھی طرح ہیں نا"؟ وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔

"میری عمر اس وقت اکسٹھ برس کی ہے اور اس تمام عرصہ میں مَیں ایک مرتبہ بھی بستر پر نہیں پڑا۔ بڑھاپے کے ساتھ کمزوری یقیناً آجاتی ہے۔ میں اب اُتنا طاقتور نہیں جتنا کہ ہوا کرتا تھا، اور مجھے ضیق النفس کی بھی تھوڑی

سی شکایت ہے مگر اُسے نظر انداز کر دیا جائے تو میں بالکل تندرست ہوں۔نہیں ڈاکٹر! تم مان جاؤ، میرے ہاں سے تم ایک پیسہ بھی نہ کما سکو گے"۔

گفتگو کا موضوع بدل گیا۔کانگریس اور پیرس کی زندگی پر باتیں شروع ہوئیں ۔ بوڑھے کی دبلی پتلی شرمیلی لڑکی اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی لیکن اُس نے گفتگو میں کوئی حصہ نہ لیا۔لڑکی کے باپ کی گفتگو میں دانشمندی اور بذلہ سنجی دونوں موجود تھیں۔اور میں ان صفات کو ایک گوشہ نشین میں دیکھ کر حیران رہ گیا غالباً میری گفتگو نے اُس کی طبیعت کو شگفتہ کر دیا تھا، کیونکہ اُس نے طالب علمی کے زمانے کی باتیں، اپنی جوانی کی غلط کاریاں اور اُس زمانے کے حالات جب وہ ایک نوجوان وکیل تھا سب سنا ڈالے۔کوئی ایک گھنٹے تک اُس نے اپنی بھولی بسری جوانی کو اپنی باتوں سے پھر زندہ کر دیا۔اسی وقت شمع کچھ اس طرح ٹمٹمائی گویا وہ بجھنے کے قریب ہے۔میں نہیں جانتا کہ اس سے مجھ پر ایک گہرا اثر کیوں ہوا درآں حالیکہ اس میں کوئی غیر معمولی بات بھی نہ تھی مومی بتیاں لائی گئیں مگر اب سحر ٹوٹ چکا تھا۔مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی نوجوان خاوند کا ایک کوئی بدشگونی دیکھ پائے۔گھڑی بارہ کا گھنٹہ بجا رہی تھی کہ میں وہاں سے رخصت ہوا۔بوڑھے وکیل نے مجھ سے دوسرے دن دوبارہ ملنے کو کہا اور میں نے اس کا بے ساختہ وعدہ بھی کر لیا۔اُس کی لڑکی دروازے تک میرے ساتھ آئی اور کہنے لگی:۔

"ڈاکٹر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ تم آگئے گو تمہارا آنا غلطی ہی سے ہوا۔میرے والد سالہا سال سے کبھی اتنے خوش نہیں ہوئے جتنے کہ آج۔کل ضرور آنا میں چاہتی ہوں کہ ہمارے ہاں لوگ آیا کریں اس سے اُن کی صحت اچھی رہے گی"۔

میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال اُٹھتا تھا کہ میری خاموش ہم سفر مجھے ضرور راستے میں ملے گی لیکن مجھے کوئی نظر نہ آیا۔سرائے میں ابھی شمعیں جل رہی تھیں اور جب میں اندر داخل ہوا تو سرائے والا کچھ لوگوں کو جنہوں نے روسی طرز کی پوستینیں پہن رکھی تھیں اخبار سنا رہا تھا۔اُن سب کے لمبے چہرے اور لمبے بال تھے اور وہ ایک ہی انداز میں یعنی اپنی ٹھوڑیوں کو اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر بیٹھے ہوئے تھے۔دوسری طرف کچھ تو ایک قسم کی تیز روسی شراب پی رہے تھے اور اکثر حقہ نوشی میں مصروف تھے۔

سرائے کی فضا میں دم رکا جاتا تھا اور تمباکو کے دھوئیں کا ایک دل بادل چھت کو چڑھ رہا تھا۔میں نے اشاروں سے سرائے والے کو سمجھایا کہ مجھے رات گزارنے کے لئے کمرے کی ضرورت ہے۔چنانچہ وہ مجھے ایک

ایسے کمرے میں لے گیا جہاں ایک بہت بڑا پلنگ بچھا ہوُا تھا۔

دیوار جس پر سفیدی ہو رہی تھی یونانی علمائے دین کی تصویروں سے مزین تھی۔ سرائے والا موم بتیاں لے آیا اور لکڑیوں کا ایک ڈھیر لگا کر اُسے بھی آگ لگاتا گیا۔ میں سونا نہ چاہتا تھا اس لئے میں نے سگار سلگایا اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر شام سے لے کر اب تک جو جو واقعات پیش آئے تھے اُن پر غور کرنے لگا۔

میں اپنا سگار ختم کر چکا تھا کہ مجھے سیڑھیوں میں سے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں کانپ گیا۔ میں نے سمجھا کہ یقیناً یہ کوئی چال ہے جس میں مَیں پھنسا ہوں اور لٹا ہی چاہتا ہوں۔ مگر میں نے جلد ہی معلوم کر لیا کہ سرائے والا اور بوڑھے وکیل کی بیٹی جن کے گھر میں میں نے شام کا وقت گزارا تھا میری طرف آ رہے ہیں لڑکی پریشان معلوم ہوتی تھی لیکن پھر بھی اُس نے اپنے حواس کو برقرار رکھا تھا۔

لڑکی نے کہا حسنِ اتفاق کی بات ہے کہ تم یہیں تھے۔ والد ابھی اپنے بستر میں لیٹے ہی تھے کہ اُن پر مرض کا ایک زبردست حملہ ہوُا۔ شاید آج رات زیادہ ہلنے جلنے سے انہیں تکلیف ہو گئی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں تکلیف دی مگر مجھے امید کہ تم میرے ساتھ ضرور چلو گے۔ شاید تم اُن کے لئے کچھ کر سکو"

جس کمرے میں وہ مجھے لے گئی وہ بلند اور نامرغوب سا تھا۔ ہوا میں سے نوش دارو کی تیز بو آ رہی تھی۔ میز پر ایک لمپ جل رہا تھا اور وہ تمام چیزیں اُس پر رکھی تھیں جو عموماً پلنگ کمرے میں ہوتی ہیں۔ مثلاً بالوں کا برش۔ استرا۔ گھڑی اور ایک بڑا سا ٹائی پن جس پر ابھرے ہوئے نقش بنے تھے۔

انگیٹھی میں آگ کے آخری شعلے بجھ رہے تھے۔ بستر کے پردے ہٹا دیئے گئے تھے۔ ایک بوڑھا نوکر بستر کے پاس کھڑا دعا مانگ رہا تھا اور ایک نوکر کرسی پر بیٹھا رو رہا تھا۔

میں نے بوڑھے مریض کے دل کی حرکت سننی چاہی مگر اُس کے سینے میں اب کوئی سانس باقی نہ رہی تھی۔ موت اپنا کام کر چکی تھی اور اعضا میں سختی نمودار ہو رہی تھی۔ میں نے لڑکی کو اُس کے باپ کی موت کی خبر جس قدر نرم پیرایہ میں ممکن تھی سنا دی۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی سمجھ چکی تھی اور اُس نے اپنی پوری نسوانی قوت سے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا

مَیں اپنے ہاتھ دھو رہا تھا اور دن کے تمام واقعات پر غور کر رہا تھا کہ میری نظر ایک تصویر کے چوکھٹے پر پڑی۔ اُسے مصور نے سن ۱۸۳۰ء کے اندازِ مصوری پر بنایا تھا اور جس نوجوان عورت کی یہ تصویر تھی اُس کا لباس لمبا اور بال گندھے ہوئے تھے۔ کسی شک وشبہ کے بغیر میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی عورت تھی جو ماسکو کے

محل کے ہال میں مجھ سے ملی تھی اور میرے ساتھ یہاں تک آئی تھی۔ میری حیرت اس قدر بڑھی کہ میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ لڑکی اور اُس کے نوکروں نے متعجب ہوکر میری طرف دیکھا۔

تصویر کی طرف اشارہ کرکے میں نے کہا "یہ کون ہے؟ یہی عورت تو مجھے یہاں لائی تھی۔"

لڑکی نے غور سے میری طرف دیکھا۔ اُس کے اوپر کے ہونٹ میں ذرا سا خم آگیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے میری بات پر اعتبار نہیں کیا، مگر مجھ کو بے چین دیکھ کر اُس کے چہرے کا رنگ بھی زرد پڑ گیا۔

اُس نے کہا "یہ میری ماں ہے بیس برس ہوئے جب میں پیدا ہوئی تھی تو وہ مرگئی تھی"

ہاپین منصور احمد

لمعات

دلِ خوں گشتہ کو وابستگی تھی لالہ زاروں سے
نوا ہائے محبّت سُن رہا تھا آبشاروں سے

نمی اُن میں نہ دیکھی چشمِ بیمارِ محبت کی
لڑا کر دیکھ لی ہیں رات بھر آنکھیں ستاروں سے

مہ و خورشید نے اُس کا مرقع کھینچنا چاہا
نہ ظاہر ہوسکا وہ حُسن ان آئینہ کاروں سے

میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جسے اُڑنا نہیں آتا
بحسرت دیکھتا ہوں جانبِ خور لالہ زاروں سے

شعاعِ مہر جوئے آب پر کیا کیا لرزتی ہے
درخشاں ہے ردائے آب کا دامن ستاروں سے

ح - ب

رازِ محبّت

میں نے کہا کہ اے چمنِ زندگی کے پھول — تیرے بغیر خار ہے مجھ کو یہ گلستاں
کانٹا سا کیا یہ دل میں کھٹکتا ہے ہر گھڑی؟ — دن رات کیوں ہے وردِ زباں ہائے میری جاں؟
آیا نہ کچھ سمجھ میں کہ کیا چیز عشق ہے؟ — کس طرح شعلہ بار ہے یہ آتشِ نہاں؟
تاریکیاں بھی مجھ کو مسرت کا نور ہوں — گر تیرے دل میں میری محبت ہو ضوفشاں
شعلہ ہے آفتاب کا چشمک ہے برق کی — الفت جو مجھ کو تجھ سے ہے اے میری جانِ جاں

سُن کر یہ داستاں مری مجھ سے کہا بہار — یہ رازِ سر بمُہر کسی پر نہ ہو عیاں
اُلفت تھی مجھ کو تم سے تمہیں مجھ سے عشق تھا — حائل مگر ہمارا مقدّر تھا درمیاں
کردیں فلک نے زیست کی راہیں الگ الگ — پھینکا تمہیں یہاں تو دھکیلا مجھے وہاں
تم مجھ کو بھول جاؤ یہ ممکن نہیں اگر — میں تم کو بھول جاؤں نہ کرنا کبھی گماں
دونوں دلوں میں نورِ محبّت ہے جلوہ زیر — اک دوسرے کی دید ہے دونوں کو لطفِ جاں
چارہ نہیں مگر کہ جو ہونا تھا ہو چکا — چھایا ہوا ہماری زمین پر ہے آسماں
وہ کام تم کرو جو خدا نے تمہیں دیا — بے کار ہیں یہ وہم و خیال و غمِ نہاں
کاوش ہے میرے جی کو بھی ہر دم وہی کروں — جو مجھ سے چاہتا ہے مرا ربِّ دو جہاں
موتی کی آب و تاب ہے خوشبو ہے پھول کی — الفت جو مجھ کو تم سے ہے اے میری جانِ جاں!
کرنا ہے آسماں کو جُدا اگر کیا کرے — نزدیک تر کریں گی دلوں کو یہ دُوریاں

دل میں بہار رازِ محبت چھپائے ہے
اے میری زندگی کی محبّت کے رازداں

بہار

ضرورت

"کسی کا قول ہے کہ خدا کسی کو تعلیم دلانا چاہتا ہے تو وہ اُسے مکتب میں نہیں بھیجتا بلکہ ضرورت کے حوالے کر دیتا ہے۔"

ضرورت جس کا دوسرا نام غربت ہے بعض مرتبہ انسان کی پوشیدہ طاقتوں کو نمایاں کر کے ترقی کا ایک ایسا دروازہ کھول دیتی ہے جو اُس کے لئے کبھی بند نہیں ہوتا۔ اِن پوشیدہ قوتوں کو بیدار کرنے کے لئے "ضرورت" سب سے زیادہ مفید چیز ہے، آرام وراحت اور دولت وعشرت کو کسی مذہب نے ذریعۂ ترقی نہیں بتایا۔ متمول خاندان کے افراد اس قدر عیش پسند ہو جاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اُن سے تحریکِ عمل مفقود ہو جاتی ہے اور یہی اُن کے انحطاط کا وہ زمانہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اس میں اپنے آپ کو سنبھال سکے تو خیر ورنہ ہمیشہ کے لئے تباہ وبرباد ہو جاتے ہیں۔

اگر "غربت" کے مسئلے پر ایک عمیق نظر ڈالی جائے تو بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ اُس کا وجود، دنیا کے لئے کسی طرح ایک نعمت سے کم نہیں۔ اگر دنیا میں غربت ومصیبت کا وجود نہ ہوتا تو آج اُس کے مشہور فاتح، جانباز جرنیل، دولتمند تاجر اور بہادر جہازران جن کا تاریخ فخر کے ساتھ ذکر کرتی ہے پیدا نہ ہوئے ہوتے دنیا کے بڑے بڑے لوگ راحت واطمینان کی آغوش سے محروم رہے ہیں۔ انہوں نے صرف تکلیف وغربت کے دامن میں پرورش پائی ہے۔ ملٹن سائیکل کے پہیوں، مائکل فریڈے ٹوٹی ہوئی بوتلوں اور پروفیسر بل ایک معمولی اپریٹس کے تجربہ سے متمدن دنیا کا قابلِ فخر انسان بن گیا۔

امریکا میں سب سے زیادہ دلچسپ قصے اُن نوجوانوں کے ہیں جو باوجود افلاس وغربت کے میدانِ ترقی میں برابر آگے بڑھتے رہے اُن کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی دنیاوی زندگی کی ابتدا کی اور کس طرح زمانے کی پیہم مخالفتوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس سے بڑھ کر جاذبِ توجہ شاید اور کوئی واقعہ نہیں ہو سکتا کہ باوجود مشکلات وموانعات کے ایک صمیم العزم انسان کس طرح بجائے پیچھے ہٹنے کے آگے بڑھتا ہے۔ طوفانی مصائب اس کے پاؤں کو لغزش دینے کی بجائے مضبوط کرتے ہیں۔ وہ مشکلات کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اُس کا دل قسمت کی مخالفتوں کی پروا نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ زمانے کی یہ مخالفتیں عارضی ہیں۔ قسمت کی برائی امتحان تک ہے۔ اگر وہ استقلال کے ساتھ اپنے ارادوں پر قائم رہا تو ایک دن یہی مخالفتیں اُس کے لئے عیش وعشرت کا دروازہ

کھول دیں گی۔

جن کے عزائم بلند اور خیالات پختہ ہوتے ہیں۔ تقدیر اُن کی ترقیوں کے راستے میں حائل نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ ہر سال پختہ عزائم رکھنے والے انسان محض اپنی بلند حوصلگی کی بدولت اس قید و بند سے نکل کر ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو صرف تقدیر کے بھروسے پر اپنی قوتِ عمل کو بے کار و معطل کر دیتے ہیں وہ رفتہ رفتہ پستی کی اُس عمیق ترین گہرائی میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سوائے غربت و فلاکت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

جس چیز سے حیاتِ انسانی استوار ہوتی ہے اُس کی نشو و نما خود اُسی کے دل و دماغ میں ہوتی رہتی ہے۔ جو چیز سب سے زیادہ تحریکِ عمل پیدا کرتی ہے اُس کا نام "احساس" ہے اسی سے انسان اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اُسی کے فقدان سے ذلت و پستی کے خوفناک غار میں گر جاتا ہے۔ اگر کسی انجن میں بھاپ نہ ہو تو ظاہر ہے کہ پہیوں میں جنبش پیدا نہیں ہو سکتی اور کل پرزے بذاتِ خود کسی انجن کو نہیں چلا سکتے۔ اسی طرح اگر انسان کے احساساتِ مدرکہ میں گرمی نہ ہو تو ارادوں میں پختگی اور مزاج میں استقلال پیدا نہیں ہو سکتا۔

اگر کوئی مشکل تمہارے مقصد سے زیادہ قوی اور تمہارے عزم سے زیادہ راسخ ہے تو یقیناً تم دنیا میں کبھی کامیاب باوقار اور باعزت نہیں ہو سکتے۔ اس لئے سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہئے کہ آیا جو چیز تمہیں ترقی کی منزل سے روک رہی ہے وہ تم سے قوی ہے یا تم اس سے قوی ہو، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری مشکلات تم سے قوی ہیں اور تم میں اُن کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے تو بلا شبہ یہ تمہارے احساسات و عزائم کی کمزوری ہے لیکن اگر تم ان مشکلات و موانع کے باوجود اپنی قوت وجرات کا احساس رکھتے ہو اور تمہیں اس کا یقین ہے کہ تمہاری مشکلات تمہارے عزائم کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتیں تو تم بغیر کسی پس و پیش کے دنیا کی ہر تجارت اور ہر کام کو کامیابی کے ساتھ انجام دے سکتے ہو۔ پھر جس وقت تمہیں اپنی بلند حوصلگی کا یقین ہو جائے اسی وقت تم دنیا کی مخالفتوں کو ٹھکراتے ہوئے بلا انتظارِ مواقع اپنے کام کو پورے جوش کے ساتھ شروع کر دو۔ اس لئے کہ جس وقت تم میں بلند حوصلگی کا احساس پیدا ہوا تھا اسی وقت کامیابی نے تمہارے دروازے کھول دیئے تھے

بارہا تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے جو مشکلات ناقابلِ حل معلوم ہوتی ہیں وہ کام شروع کرنے کے بعد خود بخود راستے سے ہٹ گئیں اور کامیابی کے وہ ذرائع جن کا پہلے علم نہ تھا یکے بعد دیگرے سامنے آ گئے۔

وہ لوگ جو ہر کام کو خواہ مخواہ مشکل اور ناقابلِ فتح سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں انہیں کسی کام میں بھی کامیابی

فتح اور امید کی روشنی نظر نہیں آتی - وہ جس زمین کو دیکھتے ہیں اُسے یہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ اس میں تخم ریزی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا - لیکن اگر وہ جرات کر کے اپنے اس پس وپیش اور بے جا تامل کو چھوڑ دیں تو پھر بھی ٹھکرائی ہوئی زمین اُن کے لئے مفید و نفع بخش ثابت ہوسکتی ہے - کاش ہر شخص یہ جان لیتا کہ تخم ریزی کے کیا طریقے ہیں اور کن ذرائع سے وہ زیادہ سے زیادہ نفع اپنے کھیتوں سے اُٹھا سکتا ہے - اس لئے کہ بہت سے لوگ اب بھی دنیا میں ایسے موجود ہیں جو تخم ریزی تو کر رہے ہیں لیکن اس سے بے خبر ہیں کہ اُسی زمین کو الٹ پھیر کے جوتنے سے کس قدر کثیر نفع ہوسکتا ہے -

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے وطن میں کاروبار کرنے کے باوجود دوسرے دور و دراز ملکوں میں تجارت کرنے کے دور از کار خیالات میں مبتلا رہتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جب اپنے ہی شہر میں جہاں ہر طرح کے ذرائع انہیں حاصل ہیں - وہ اپنی تجارت کو فروغ نہ دے سکے تو غیر ملکوں اور شہروں میں ایک اجنبی کی حیثیت سے کیا ترقی کرسکتے ہیں - تقدیر آزمائی کے لئے کسی دوسرے ملک یا شہر میں جانے کی ضرورت نہیں خود تمہارے ہی شہر میں ترقی کے تمام ممکن سے ممکن ذرائع موجود ہیں - جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اُن شہروں میں جہاں لوگ اپنی بیکاری و بے روزگاری کی شکایت کیا کرتے ہیں کچھ ایسے اولوالعزم انسان بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو ترقی کے اعلےٰ مدارج پر پہنچ کر یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ وسائل بشرطیکہ تحریکِ عمل سلب نہ ہوئی ہو ہر جگہ موجود ہیں -

گورنر جانسن اپنی تقدیر آزمائی کے لئے سینٹ پیٹر سے کہیں باہر نہیں گیا - وہ چند مہینوں کو مستثنیٰ کر کے تمام عمر علم سے بے بہرہ رہا - فروڈ گلس اپنی غلامانہ کاشتکاری کے زمانے میں بھی آفتابِ اقبال کو تلاش کرتا رہا - گارفیلڈ نے راہ گیری اور لنکن نے ایک تنگ و تاریک زاویہ میں بیٹھ کر تقدیر کے گوہر کو پا لیا -

دنیا میں کسی انسان کی ناکامی و نامرادی کی اگر کوئی وجہ ہوسکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ لوگ اپنے "مواقع" اور ترقی کے وسائل کو عام سطح سے گزر کر عظیم الشان بلندی اور انتہائی رفعت پر تلاش کرتے ہیں وہ اس قدر بلند ہو جاتے ہیں کہ انہیں سطحِ عام کی چیز دکھائی نہیں دیتی اور بعض ایسے مواقع اُن کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں جن سے اگر فائدہ اٹھایا جاتا تو یقیناً وہ کامیاب ہو جاتے +

ثاقب کانپوری

رازِ زندگانی

کسی ٹہنی پہ تھا اک پھول مسرور — اور اپنے حسن پر نازاں و مغرور

کہا میں نے سن اے گل بات میری — ہے تیری زندگی بس ایک دن کی

تو کیوں ہے اس قدر پھر اس پہ نازاں — تو کیوں ہے اس قدر شاداں و فرحاں

ترا کیا جانے کل کیا حال ہوگا — کہاں تو خاک میں پامال ہوگا

کہا گل نے میں سب کچھ جانتا ہوں — تری ہر بات کو میں مانتا ہوں

مگر میں حرص کا بندہ نہیں ہوں — میں اپنی جان کو پھندا نہیں ہوں

فنا کا مجھ کو بالکل غم نہیں ہے — چمن میں فکرِ بیش و کم نہیں ہے

یہ مانا کم ہے میری زندگانی — مگر حاصل ہے مجھ کو شادمانی

مری خوشبو سے ہیں گلشن بھی مہکے — مری تعریف میں بلبل بھی چہکے

فدا ہیں مجھ پہ ننھے ننھے بھنورے — وہ مجھ کو دیکھ کر ہیں رقص کرتے

سحر کو باغ میں آتی ہے جس دم — دھلاتی ہے مرا منہ آ کے شبنم

سراپا زیست ہے میری مسرت

مسرت — زندگانی کی حقیقت

ر۔ب

ہمارا پہلا مقدمہ

"کیوں بھائی بشیر یہ نکٹائی کی گرہ تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں"

"ذرا اُٹھ کر دیکھو وہیں سے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے۔"

"میرے خیال میں تو بالکل ٹھیک ہے۔"

"بندۂ خدا عجب سست واقع ہوئے ہو میں کہہ رہا ہوں ذرا اُٹھ کر دیکھو۔ جانتے ہو ہم آج پہلی دفعہ کچہری جا رہے ہیں۔"

"دیکھئے...... ٹھیک تو ہے۔ ہاں ذرا موٹی ہے کچھ پتلی ہو جائے تو بہتر ہو۔"

بشیر کے اس اعتراض پر ہم نے گرہ کو درست کرنا شروع کیا۔ اُسے دبایا۔ گردن کو کبھی اس طرف کبھی اُس طرف گھمایا۔ نکٹائی کا ایک سرا کھینچا۔ پھر خوب کھینچا۔ آئینہ دیکھا گرہ بدستور موٹی اور بدنما تھی۔ اُسے پھر دبایا۔ پھر آئینہ دیکھا۔ موٹی تھی۔ نکٹائی کو کھول ڈالا۔ پھر باندھا اور اُسے موٹا پایا۔ اب کے تو ہمیں غصہ آگیا دونوں ہاتھوں سے نکٹائی کے ایک سرے کو پورے زور سے کھینچا۔ مگر سرا باقی حصّے سے علیحدہ ہو کر ہمارے ہاتھ میں آرہا۔ مجبوراً دوسری نئی نکٹائی نکالی اب کے گرہ بہت چھوٹی اور پتلی بندھی۔ مگر بشیر کے خیال میں وہ نہایت موزوں اور خوبصورت تھی ہم نے بھی سوچا چلو چھوٹی ہی اچھی ہے۔ اس کے بعد پتلون پہنی۔ محمد دین نے کوٹ پہنایا۔ ریشمی رومال اور پارکر فونٹین پن جیب میں رکھ کر ایک دفعہ پھر آئینے میں اپنے حلیے کا جائزہ لیا۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ پہلی دفعہ کچہری جا رہے ہیں کوئی نقص نہ رہ جائے۔ اس خیال کے آتے ہی نکٹائی کی گرہ پر پھر نظر جا پڑی دیکھتے ہی جی میں شک پیدا ہوا کہ گرہ کچہری کی پہلی حاضری کے قابل نہیں۔ بشیر کو بلوایا ــــ

"بھائی سچ سچ کہنا نکٹائی کی گرہ بدنما تو نہیں؟"

"بھائی جان آپ کو خدا جانے آج کیا ہو گیا ہے۔ گرہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے اچھی گرہ آج تک کسی وکیل سے نہ بندھی ہو گی۔"

"بشیر بھائی مذاق نہ کرو۔ ہمیں آج پہلی دفعہ کچہری جانا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے پھر آئینہ دیکھا۔ کچھ دیر کے لئے عینک اتار کر رکھ دی اور بغیر عینک کے گرہ کو ملاحظہ کیا۔ پھر عینک لگالی اور شیشوں میں سے اُسے پھر دیکھا دل کو تسلی دی کہ بالکل ٹھیک ہے۔

خیر اس کے بعد کھانا کھایا اور کھایا بھی بہت جلدی کھانے کے دوران میں انگیٹھی پر دھری ہوئی گھڑی پر بار بار نظر جاتی تھی خیال آتا تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے کیونکہ آج پہلی مرتبہ کچہری جانا ہے۔ کھا چکنے بعد صابون سے ہاتھ وغیرہ صاف کئے۔ کلی کی۔ منہ پونچھا ٹوپی سر پر رکھی اور چھڑی ہاتھ میں لے کر گھر سے نکلے۔ بازار میں پہنچے پان فروش کی دکان پر پان خریدنے کے لئے ٹھہرے دکان میں ایک بڑا آئینہ لگا ہوا تھا اُس پر نگاہ جو پڑی تو سب سے پہلے نکٹائی کی گرہ نظر آئی اُسے وہیں کھڑے کھڑے پھر درست کرنے کی کوشش کی اور ایک دو منٹ تک اُس کے ساتھ زور آزمائی کرتے رہے اتنے میں پان لگ چکا تھا۔ لے کر منہ میں رکھا اور چھڑی گھماتے ہوئے کچہری کا راستہ لیا۔ راستے میں خیال آیا کہ پہلی دفعہ کچہری جا رہے ہیں ذرا رعب سے چلنا چاہئے۔ اِس خیال کے آتے ہی کمر کو ذرا اور سیدھا کیا گردن کو اکڑا لیا اور تیز تیز چلنے لگے۔ راستے میں ادھر ادھر بالکل نہیں دیکھا ہاں البتہ ہر دس قدم کے بعد ایک ہاتھ سے یہ دیکھ لیتے تھے کہ گرہ تو ٹھیک ہے ؟۔

غرض کہ دس پندرہ منٹ تک تیز چلنے کے بعد کچہری کے احاطے کے قریب جا پہنچے۔ ایک دفعہ پھر گرہ کو ٹٹولا اور بسم اللہ کہہ کر احاطے کے اندر داخل ہوئے اور لگے ادھر اُدھر گھومنے۔ احاطے کے اندر دو تین بڑی بڑی عمارتیں تھیں جن کے اردگرد برآمدوں کے اندر۔ برآمدوں کے باہر۔ احاطے میں لگے ہوئے درختوں کے نیچے۔ اِدھر اُدھر لوگ بیٹھے باتوں گپوں اور حقوں میں محو تھے۔ جا بجا لوگ چٹائیوں اور تختوں پر بیٹھے کاغذات لکھنے میں مشغول تھے۔ اِن کے علاوہ اور بہت سے لوگ اِدھر اُدھر گھبرائے ہوئے پھر رہے تھے۔ خدا جانے کیوں ؟ کہیں کہیں ایک آدھا سپاہی بھی نظر آتا تھا۔ ہم کچھ دیر تک اِن عمارات کے اردگرد گھومتے رہے۔ کہیں کہیں کمروں کے باہر بورڈ آویزاں تھے۔ جن پر ڈپٹی کمشنر، سینیر سب جج۔ مجسٹریٹ دفعہ تیس وغیرہ لکھا ہوا تھا۔ ایک بورڈ پر نظر پڑی جو ایک کمرے کے باہر برآمدے کے ستون کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ "سب جج" سمجھ گئے کہ یہی وہ کمرہ ہے جہاں پہلے پہلے نئے وکیل جھوٹ بولنا سیکھتے ہیں۔ ایک درخت کے نیچے ایک عرضی نویس بیٹھا تھا جسے ہم پہلے ہی سے جانتے تھے اُس کے پاس گئے وہ سلام کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم نے مسکراتے ہوئے کہا "ہم آج پہلی مرتبہ کچہری آئے ہیں۔ ایک کرسی منگوا دو تاکہ ہم ذرا بیٹھ جائیں"۔ وہ بیچارہ بھاگتا ہوا گیا اور ایک منٹ کے بعد کہیں سے ایک کرسی لے آیا۔ ہم کرسی پر بیٹھ گئے اور یوں گویا ہوئے۔

"کیوں جی یہاں کام وغیرہ کی کیا حالت ہے ؟ ہمیں ذرا بتاؤ ہم آج پہلی ہی دفعہ آئے ہیں"۔

وہ "کام بہت اچھا ہے جناب۔ دیکھئے ابھی ابھی آپ کو کوئی مقدمہ دلوا دوں گا"۔

ہم نے دونوں ہاتھوں سے نکٹائی کی گرہ کو ٹٹولتے ہوئے ذرا رعب سے کہا "اچھی بات" اور جیب سے اپنی سنہری ڈائری نکال کر اُس کے خالی اوراق کو اِدھر اُدھر اُلٹنا شروع کیا۔ عرضی نویس اُٹھا اور ایک طرف کو چلا گیا ہم نے موقع پاکر ایک دفعہ پھر نکٹائی کو ٹٹولا۔ اطمینان کرنے کے بعد ایک دم کھڑے ہوگئے۔ پتلون کی کریزوں پر نظر دوڑائی چھڑی کو گھمایا اور پھر کرسی پر بیٹھ کر ڈائری کے اوراق الٹنے شروع کئے۔ ہم بظاہر تو ڈائری کے مطالعہ میں محو تھے مگر در اصل جی میں یہ سوچ رہے تھے کہ چونکہ آج پہلی مرتبہ کچہری آئے ہیں اس لئے لوگوں پر اپنی شخصیت کا اچھا رعب ڈالنا چاہئے۔ چنانچہ کچھ دیر کے بعد جیب سے ایک سگار نکالا اور سلگا کر منہ میں رکھ لیا۔ کمبخت تھا نہایت کڑوا ایک کش کے ساتھ ہی زور زور سے کھانسنا شروع کیا۔ اتنے میں دیکھا کہ وہی عرضی نویس ایک بوڑھے سے آدمی کو ساتھ لے کر ہماری طرف آرہا ہے۔ ہم نے کھانسی روکنے کی کوشش کے ساتھ ہی نکٹائی کی گرہ کو ٹٹولتے ہوئے ایک اور کش لگایا۔ اب کے کمبخت دھواں حلق سے نیچے اتر تو گیا مگر اندر جاکر اکڑ بیٹھا گلا بند ہوگیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دم گھٹنے لگا مگر ہم نے ہمت کی اور ایک ہاتھ سے نکٹائی کی گرہ کو سنبھالتے ہوئے کھانس کھانس کر دھوئیں کو باہر نکالنا شروع کیا۔ اس اثنا میں عرضی نویس اور بڈھا بالکل قریب آپہنچے۔

بڈھا (جھک کر) "سلام حضور"

"سلام"

"میرا یہ چھوٹا سا کام تو کر دیجئے"

ہم کھانستے ہوئے بولے "کیا ہے؟"

"جناب میرے حق میں یک طرفہ ڈگری مدعا علیہ کے خلاف ہوچکی ہے۔ مگر اب مدعا علیہ نے اس ڈگری کے منسوخ کرانے کے لئے درخواست دی ہے اور آج پیشی ہے۔ کیا آپ میری طرف سے پیش ہو جائیں گے؟

اس پر ہم نے مسکرا کر عرضی نویس کی طرف دیکھا اُس نے اپنے سر کو ہلایا اور ہم نے فوراً جواب دیا "ہاں ہم یہ کام کردیں گے"، یہ کہہ کر ہم پھر نکٹائی کی گرہ اور سگار کے کڑوے دھوئیں سے زور آزمائی کرنے لگے۔ عرضی نویس اور بڈھا ذرا دور ہٹ کر کچھ دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے جو ہم نہ سُن سکے مگر یہ فقرہ ہم نے بڈھے کا سن ہی لیا "یہ تو کوئی بالکل نیا جا ـــ ہے کہیں کام ہی خراب نہ کردے"۔ عرضی نویس آخر ہمارے قریب آیا اور کہنے لگا "لیجئے صاحب فیصلہ ہوگیا ہے۔ اس پر دستخط کر دیجئے" یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک چھپا ہوا کاغذ پیش کیا جس پر ہم نے اپنے پارکر پن سے دستخط کئے اور کاغذ اُسے واپس دے دیا۔

عرضی نویس (بڈھے سے) لو بابا۔ چل کر وہاں بیٹھو اور آواز کا خیال رکھو۔"

بڈھا (جاتا ہوا) "بابو جی کہیں چلے نہ جانا۔ ابھی آواز پڑے گی"

ہم "معمولی بات ہے۔ ہم یہیں ہیں"

بڈھے کے جا چکنے کے بعد عرضی نویس پھر ہماری جانب آیا اور کہنے لگا "لیجئے صاحب مبارک ہو یہ آپ کا پہلا محنتانہ ہے" یہ کہہ کر اُس نے تین روپے ہمیں دیئے اور تھوڑی سی دیر کے بعد پھر بولا "میرا حق دلوا دیجئے۔ آپ کا پہلا مقدمہ ہے اس لئے مجھے اچھے پیسے ملنے چاہئیں" ہم نے ایک روپیہ دیا مگر وہ نہ مانا۔ خیر پندرہ بیس منٹ کی بحث کے بعد اُسے ڈیڑھ روپے پر راضی کیا۔ اس کے بعد ہم پھر اپنی ڈائری کے مطالعہ میں مصروف ہو گئے "مطالعہ" کے دوران میں خیال آیا کہ پہلے مقدمے کے پیسے تو درج کر لیں۔ ۲۰ تاریخ کا صفحہ نکالا اور اُس پر موٹے حرفوں میں لکھا۔

"پہلا دن۔ پہلا مقدمہ۔ پہلا کام۔ یعنی پہلی دفعہ کچہری .... مبلغ ڈیڑھ روپیہ"

یہ لکھ کر ڈائری کو جیب میں رکھ لیا اور کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چھڑی گھماتے ہوئے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے جی میں خوش تھے کہ پہلی دفعہ آنے پر ہی مقدمہ مل گیا ہے لوگ غلط کہتے ہیں کہ "پروفیشن" کا برا حال ہے اور وکیل دو دو آنے لے کر پیش ہو جاتے ہیں خدا نے ہمیں پہلے دن ہی تین روپے کا کام دلوا دیا ہے"۔

تھوڑی دیر میں خیال آیا کہ چلو "بار روم" میں چل کر اپنی آمد کی خوشخبری سنائیں لوگوں سے پوچھتے ہوئے وہاں پہنچے۔ برآمدے میں داخل ہوئے۔ کمرے کے اندر سے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں ہم نے حوصلہ کر کے چک اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور ایک پاؤں دروازے کے اندر رکھا ساتھ ہی خیال آیا کہ سگار بجھ چکا ہے ہم نے وہیں کھڑے کھڑے یعنی ایک پاؤں دہلیز کے اس طرف اور دوسرا اُس طرف رکھے اور چک کو کندھے پر اُٹھائے ہوئے جیب سے دیا سلائی نکالی اور لگے سگار سلگانے۔ سگار کا سلگنا تھا کہ زبردست کھانسی کا دورہ شروع ہو گیا اور ہماری بے ڈھب کھانسی کی سقف شگاف آواز نے ایڈووکیٹوں اور پلیڈروں وغیرہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنی باتیں چھوڑ کر ہماری طرف توجہ کریں۔ چنانچہ اُن میں سے ایک دو شریف آدمی اُٹھ کر ہماری طرف آئے ہم نے کھانستے ہوئے کہا "آج ہم پہلی دفعہ کچہری آئے ہیں معمولی بات ہے"۔ اس پر اُن میں سے ایک بولا "کیوں صاحب آپ کا کوئی مقدمہ ہے؟" ہم نے اپنا دوسرا پاؤں دہلیز کے اندر رکھتے ہوئے جواب دیا "ہاں" یہ سنتے ہی اور بہت سے اشخاص ہمارے پاس آ گئے اور اس طرح سے سوالوں کی بوچھاڑ کرنے لگے۔

"آپ کا کیا مقدمہ ہے؟" "آپ کی تاریخ کب ہے؟"۔ "آپ کے کاغذات کہاں ہیں؟" "آپ کا مقدمہ کونسی عدالت میں ہے؟" "تشریف رکھئے" "بنسی ارے او بنسی کرسی لاؤ" "آیئے۔ بیٹھئے وغیرہ وغیرہ۔ اتنے میں ایک شخص جو چپڑاسی معلوم ہوتا تھا کرسی لے آیا اور ہمیں دروازے کے قریب ہی بٹھا دیا گیا۔ اور وہ سب لوگ ہمارے اردگرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہم جی میں خوش ہو رہے تھے کہ پہلی دفعہ آنے پر ہی اتنی آؤ بھگت ہو رہی ہے اس خیال کے آنے کے ساتھ ہی ہم نے "نکٹائی" کی گرہ کو ٹٹولا اور سگار منہ میں رکھ کر ذرا رعب کے ساتھ مسکراتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ چند مختلف قسموں کے دیگر سوالات کے بعد ایک صاحب پوچھنے لگے "کیوں صاحب آپ نے اپنے مقدمہ کے لئے کوئی وکیل بھی مقرر کیا ہے؟" اس پر ہمیں غصہ آیا اور جی میں یہ خیال کر کے کہ پہلی دفعہ آنے پر بھی ان کو اتنا پتہ نہیں کہ ہم بذات خود ایک معزز وکیل ہیں ہم نے گلا پھاڑ کر جواب دیا "ہم خود وکیل ہیں ہمارا مقدمہ نہیں بلکہ ہمارے پاس کسی کا مقدمہ ہے اور ہم آج پہلی دفعہ کچہری آنے پر پیش ہو رہے ہیں" یہ سن کر اُن لوگوں نے ہمیں یوں دیکھنا شروع کیا جیسے ہم کوئی معمولی درجے کے نہایت کم مایہ آدمی ہیں اُن لوگوں میں سے ایک بولا "اچھا! تو آپ بھی وکیل ہیں؟ خوب" ہم نے سگار کو منہ سے نکال کر جواب دیا "ہاں"۔ یہ سُن کر سب لوگ ہمیں چھوڑ کر اپنی اپنی جگہوں پر جا بیٹھے اور ہم کچھ دیر تک وہیں یعنی دروازے کے پاس ہی کرسی پر ڈٹے رہے۔

تھوڑی سی دیر کے بعد ایک خوش وضع نوجوان کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "ایک نئے وکیل صاحب تشریف لائے ہیں اور میں آپ سے اُن کا تعارف کراتا ہوں" اس پر آوازیں آئیں "آپ کا نام؟" "آپ کا اسم گرامی" وغیرہ وغیرہ اس کے بعد اُس شخص نے (جو ہمیں بعد میں معلوم ہوا بار ایسوسی ایشن کا سکرٹری تھا) ہمارا تعارف ہر ایک سے کرایا۔ ہم نے ہر ایک سے ہاتھ ملایا اور تعارف سے فارغ ہو کر پھر کرسی پر آ بیٹھے۔ سکرٹری صاحب نے ہمارا نام ایک رجسٹر میں درج کر لیا اور رجسٹر ہمارے پاس لے آئے۔ صفحے کے اوپر ہی موٹے الفاظ میں لکھا تھا "جون ۱۹۲۶ء چندہ ماہواری ایک روپیہ" سکرٹری صاحب کہنے لگے "دو روپے فیس داخلہ اور ایک روپیہ چندہ دے کر مشکور فرمائیے" ہماری جیب میں اس وقت وہی ڈیڑھ روپیہ یعنی ہمارے پہلی مرتبہ کچہری آنے پر ہمارے پہلے مقدمے کی پہلی فیس کی رقم تھی ہم نے جھٹ ہاتھ جیب میں ڈالا جیب میں سے صرف ایک روپیہ نکلا ہم نے باقی تمام جیبیں ٹٹولیں مگر کچھ نہ نکلا ہم نے حیران ہو کر کہا "لاحول ولا قوۃ۔ ہماری اٹھنی کہاں گئی!" ساتھ ہی خیال آیا او ہو عرضی نویس نے اٹھنی واپس نہیں دی یعنی اُس سے نصف نصف کا فیصلہ ہوا تھا اور ہم نے اُسے دو روپے دیئے تھے مگر اُس کمبخت نے اٹھنی واپس ہی نہیں دی۔ بہت غصہ آیا خیر۔ ہم نے وہ ایک روپیہ ہی سکرٹری صاحب کی نذر کیا اور کہا کہ باقی رقم یعنی دو روپے ہم کل دیں گے۔ انہوں نے روپیہ تو جیب میں رکھ لیا اور رجسٹر

میں وصولی کے اندراج کے لئے ہم سے ہمارا قلم مانگا۔ ہم نے مسکراتے ہوئے اپنا سنہری پارکر پن جیب سے نکال کر اُنہیں دیا۔ اُنہوں نے ہمارے نام کے آگے لکھ دیا "وصول . . . . ایک روپیہ" اور اِس کے بعد وہ کچھ اور لکھنے میں مشغول ہوگئے اور ہم باقی لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔ کسی نے پوچھا "آپ کا وطن"؟ کوئی کہنے لگا "آپ نے کس سال سند حاصل کی"؟ کسی نے دریافت کیا "آپ نے اب تک کیوں پریکٹس شروع نہیں کی تھی"؟ وغیرہ۔ ہم ہر ایک کو باری باری سے مناسب جواب دیتے رہے۔ ہم اِن باتوں میں مشغول تھے کہ دروازے کی چک اُٹھی اور وہی بڈھا ہمارے پہلے مقدمے والا ہمارا پہلا موکل ہانپتا کانپتا داخل ہوا اور چھوٹتے ہی کہنے لگا۔ "بابو جی جلد آئیے۔ مقدمہ پیش ہوگیا" ہم کھڑے ہوگئے اور بار روم سے نکل آئے اور ہم نے اُس سے پوچھا "کس عدالت میں"؟ بڈھے نے جواب دیا "منصف صاحب کی عدالت میں" ہم جلد جلد قدم بڑھاتے ہوئے سب جج کے کمرے کی طرف چلے جی میں خوش تھے کہ ہم اس وقت واقعی اپنا پہلا مقدمہ بھگتنے جا رہے ہیں۔ دروازے پر پہنچ کر ذرا رُکے، ٹوپی کو ٹیڑھا کرکے سر پر رکھا، کوٹ کا دوسرا بٹن بند کیا نکٹائی کو ٹٹولتے ہوئے چک اُٹھائی اور اندر داخل ہوئے۔

سب جج صاحب ایک بہت بڑی میز پر بیٹھے کاغذ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ دو تین شخص میز کے اس طرف کھڑے تھے جن میں سے ایک پنسل کاغذ ہاتھ میں لئے کبھی اِدھر کبھی اُدھر بغور دیکھتا تھا۔ ہم فوراً تاڑ گئے کہ یہ شخص فریق ثانی کا وکیل ہے خیر ہم بھی وہیں جا کھڑے ہوئے۔ جج صاحب نے کاغذات سے نظر اُٹھا کر کہا "مدعی آگیا"؟ ہمارے بڈھے نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "ہاں حضور" جج صاحب کی نظر ہم پر پڑی پوچھنے لگے "آپ مدعی کی طرف سے پیش ہو رہے ہیں"؟ ہم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں"

جج صاحب۔ (دوسرے وکیل سے) "کیوں صاحب ڈگری کیوں منسوخ کی جائے"؟

وکیل۔ "صاحب عرض یہ ہے کہ میرے موکل کو آج تک دعوے کی اطلاع ہی نہیں ہوئی یعنی سمن وغیرہ بھی اُسے نہیں پہنچے"۔

جج صاحب (ہم سے) "کیوں صاحب آپ کیا کہتے ہیں"؟

ہمیں چونکہ کہنا ہی کچھ نہ تھا اس لئے ہم خاموش کھڑے رہے۔

جج صاحب آپ کیا کہتے ہیں انہیں اطلاع ہوئی تھی یا نہیں؟" ہم بدستور خاموش کھڑے رہے۔

جج صاحب "بولئے کچھ تو فرمائیے"

ہم پھر چپ سادھے رہے۔ جی میں سوچ رہے تھے کہ "ہاں" کہیں یا "نہیں" کیونکہ ہمیں تو کچھ علم ہی نہ تھا۔

اس کے بعد جج صاحب نے ایک کاغذ اُٹھایا اور اُس پر سے کچھ پڑھ کر دوسرے وکیل سے کہا "یہ دیکھئے اطلاع تو باقاعدہ ہو چکی ہے۔ یہ رپورٹ ملاحظہ کیجئے"۔

وکیل۔ التماس یہ ہے جناب کہ اطلاع بالکل نہیں ہوئی آپ ان لوگوں کی چالاکیوں سے بخوبی واقف ہیں پیسے دے دلوا کر لکھوا لیا کرتے ہیں"

جج صاحب۔ (ہم سے) آپ کیا کہتے ہیں؟"

ہم (دبی آواز میں) "کچھ نہیں"

جج صاحب "ڈگری کتنے کی ہے"؟

دوسرا وکیل "صاحب چالیس روپے کی"

جج صاحب (کاغذ پر لکھتے ہوئے) اچھا ڈگری برطرف۔ تاریخ ۱۲۔ اگست"

یہ سُن کر سب لوگ عدالت کے کمرے سے نکل آئے ہم کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے کہ جائیں یا وہیں رہیں۔ ہمارا بڈھا بھی چل دیا تھا۔ خیر کچھ دیر کے بعد ہم بھی باہر نکل آئے۔ باہر آکر دیکھا تو بڈھا عرضی نویس سے جھگڑا کر رہا تھا "اچھا وکیل بنایا تھا تو نے۔ اُس کے تو منہ میں زبان ہی نہیں۔ ڈگری بھی گئی"، عرضی نویس ہمارے قریب آیا اور کہنے لگا "آپ تو کچھ بولے ہی نہیں میں بھی وہیں ایک کونے میں کھڑا سن رہا تھا"، ہم نے کہا "کوئی ڈر نہیں کیا ہوا" اتنے میں دوسرا وکیل بھی آ پہنچا اور پاس سے گزرتا ہوا کہنے لگا "آپ تو بولتے ہی نہیں کچھ۔ کام کرنے آئے ہیں یا تماشا دیکھنے"! یہ سُن کر ہمیں سخت غصہ آیا اور ہم نے لال پیلے ہو کر جواب دیا "چپ رہو جی تمہیں کیا" اس پر بڈھا عرضی نویس اور وکیل سب کے سب چل دیئے اور ہم وہیں کھڑے رہے۔ جب ذرا غصہ فرو ہوا تو سوچا کہ واقعی غلطی ہوئی کچھ نہ کچھ ضرور کہنا چاہئے تھا۔ وکالت میں بولنے ہی کا تو کام ہے خیر ہم جی ہی جی میں افسوس کرتے رہے اور کچھ دیر کے بعد "بار روم" کا راستہ لیا۔ داخل ہوتے تو دوسرا وکیل پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ ہمارے داخل ہونے پر اِدھر اُدھر سے آوازیں آنے لگیں "آیئے آیئے۔ سنا ہے آپ خوب بولتے ہیں"، "صاحب کہتے ہیں کہ آپ بحث خوب کرتے ہیں"، "فرمایئے مقدمہ جیت لیا" وغیرہ وغیرہ۔ یہ فقرے سُن کر ہمارے غصے کا پارہ ایک سو بیس ڈگری پر پہنچ گیا۔ چاہا کہ اُس دوسرے وکیل کے کلے پر ایک گھونسا رسید کریں مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ ہم اکیلے ہیں اور وہ لوگ چالیس پچاس۔ جی میں سوچا کاش یہ لوگ لاہور میں ہوتے تو ذرا.........

غرض کہ ہم وہیں کھڑے کھڑے غصے سے کانپا کئے اور جی ہی جی میں اپنے حریف کو۔ بار کے ممبروں کو۔ اپنے پہلے مقدمے کو۔ بڈھے کو اور وکالت کے پیشے کو گالیاں دیتے رہے۔ ہم اپنی پوشیدہ گالیوں میں مشغول تھے کہ ایک شخص ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا "آئیے آئیے تشریف رکھئے شروع شروع میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے"! ہم نے ذرا درشتی سے جواب دیا "نہیں صاحب معاف فرمائیے۔ ہم اب گھر جا کر ہی آرام کریں گے"! یہ کہہ کر ہم بار روم سے نکل آئے اور سیدھا گھر کا راستہ لیا۔ واپسی میں اِدھر اُدھر بالکل نہیں دیکھا۔ سڑک کے ایک کنارے چلتے رہے یہاں تک کہ نکٹائی کی گرہ کی بھی خبر نہ لی۔ جب گھر کے قریب پہنچے تو خیال آیا کہ چھڑی کہیں کچہری میں یا بار روم میں رہ گئی ہے۔ نہایت افسوس ہوا۔ خیر۔ گھر کے اندر داخل ہوئے اور سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے۔ کوٹ اتار کر رکھنے لگے تو اوپر کے جیب پر نظر جا پڑی۔ سنہری پارکر پن غائب تھا۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد خیال آیا کہ بار ایسوسی ایشن کے سکرٹری نے رجسٹر میں ہمارا نام وغیرہ درج کرنے کے لئے لیا تھا اور اُس بدمعاش نے واپس نہیں دیا۔ اِس نقصان پر اور زیادہ غصہ آیا۔ کوٹ کو میز پر پھینک چارپائی پر دراز ہو گئے۔ اور جی ہی جی میں اپنے پہلے مقدمے کے واقعات کو دہرانے لگے۔

ہمارے پہلے مقدمے کی خاص باتیں جو اس روز پیش آئیں یہ تھیں۔

(۱) مقدمہ کی فیس تین روپے جن میں سے دو روپے عرضی نویس ہضم کر گیا اور باقی ایک روپیہ بار روم کی نذر ہوا۔

(۲) ہماری چاندی کے دستے والی چھڑی کہیں رہ گئی۔

(۳) پارکر پن یعنی سونے کے نب اور سونے کے کلپ والا قلم بار ایسوسی ایشن کا سکرٹری کھا گیا۔

لطیف الرحمٰن

ہر بچہ یہ پیغام لے کر آتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا۔
زندگی کو بہار کے پھولوں کی طرح اور موت کو خزاں کے پتوں کی طرح خوبصورت بناؤ۔
یہ ظلمت کا نظر نہ آنے والا شعلہ کیا ہے جس کی چنگاریاں آسمان کے ستارے ہیں۔
یہ دنیا وحشی طوفانوں کی دنیا ہے جسے حسن کی موسیقی نے رام کر رکھا ہے۔

ٹیگور

محفل ادب

پریت کا گیت

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

من مندر میں پریت بسالے چھوڑ دے مسجد اور شوالے
دل کی دنیا کرے روشن اپنے گھر میں جوت جگالے
پریت ہے تیری ریت پرانی بھول گیا او بھارت والے
بھول گیا او بھارت والے
پریت ہے تیری ریت
بسالے
اپنے من میں پریت

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

بھارت ماتا ہے دکھیاری دکھیارے ہیں سب نر ناری
تو ہی اٹھالے سندر مرلی تو ہی بن جا شام مراری
تو جاگے تو دنیا جاگے جاگ اٹھیں سب پریم پجاری
جاگ اٹھیں سب پریم پجاری
گائیں تیرے گیت
بسالے
اپنے من میں پریت

کرودھ کپٹ کا اترا ڈیرا چھایا چاروں کھونٹ اندھیرا
شیخ برہمن دونوں رہزن ایک سے بڑھ کر ایک لٹیرا
ظاہرداروں کی سنگت میں کوئی نہیں ہے سنگی تیرا
کوئی نہیں ہے سنگی تیرا
من ہے تیرا میت
بسالے
اپنے من میں پریت

نفرت اک آزار ہے پیارے دکھ کا دارو پیار ہے پیارے
آجا اصلی روپ میں آجا تو ہی پریم اوتار ہے پیارے
یہ ہارا تو سب کچھ ہارا من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے جیتے جیت
بسالے
اپنے من میں پریت

دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے ۔۔۔ سر جائے پر میت نہ جائے

میں ڈرتا ہوں کوئی تیری ۔۔۔ جیتی بازی جیت نہ جائے

جو کرنا ہے جلدی کر لے ۔۔۔ تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

وقت نہ جائے بیت

بسا لے

اپنے من میں پریت

"مخزن"

دنیا کی تقسیم اور شاعر کا حصّہ

"آگے بڑھو، یہ دنیا سامنے ہے، اسے لے لو! ہاں وقت آگیا ہے کہ دنیا پر قبضہ کر لو! میں تمہارا خالق، تمہیں اور تمہارے بعد تمہاری نسلوں کو یہ میراث دیتا ہوں - یہ دنیا تمہاری ہے - تمہاری جاگیر ہے - ہمیشہ کے لئے صرف تمہاری ہے - ایسا نہ ہو کہ اپنے بھائیوں پر ظلم کرنے لگو، کیونکہ میں ظلم سے ناراض ہو جاؤں گا"

اس طرح خدا نے آسمان پر سے پکار کر انسانوں سے کہا ہر آدمی معبود کی آواز سُن کر اپنا حصہ لینے دوڑا - بوڑھے اور جوان سب تیزی سے آگے بڑھے - کسانوں نے زمین کی پیداوار پر قبضہ کر لیا - شکاریوں نے جنگلوں پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا - بادشاہوں نے راستے روک لئے اور چلائے زمین ہماری ہے محصول دیئے جاؤ

جب سب نے اپنا اپنا حق لے لیا تو شاعر دور سے آتا دکھائی دیا - اُس کا سر جھکا ہوا تھا - آنکھیں نیچی تھیں وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا - آہ اب کوئی چیز بھی باقی نہ رہی تھی - شاعر کے سامنے میدان خالی پڑا تھا -

شاعر روتا ہوا خدا کے عرش کے سامنے گر پڑا - اپنے مولا کو پکار کر شکایت کرنے لگا - "آہ میں تیرا وفادار بندہ برباد ہو گیا! تو نے سب کو دیا، مگر مجھ اکیلے کو بھلا دیا!"

"غافل تو کہاں تھا؟" خدا نے شاعر سے کہا - "تو تو عالم خواب میں پڑا تھا - اب مجھ سے جھگڑنے کیوں آیا ہے؟"

"میرے معبود!" شاعر نے کہا "میں تیرے جوار میں کھڑا تھا - تیرے رخِ انور کے تماشے میں محو تھا - تیرے آسمانوں کے گیت مجھے مسحور کئے ہوئے تھے - کیا تو اُسے معاف نہیں کرے گا جسے تیری نورانی شراب نے

مدہوش کر دیا تھا، جسے تیرے جمال نے غافل کر دیا تھا"

"اب میں کیا کروں"؟ خدا نے کہا۔ "وقت نکل گیا، دنیا بٹ گئی ہے کسی کا حصہ چھین نہیں سکتا۔ لیکن ہاں اگر تو میرے ساتھ آسمان پر رہنا چاہے تو دیکھ، آسمان کے یہ دروازے تیرے لئے کھلے ہیں۔ میرے اچھے شاعر! چلا آ، میرے ساتھ رہ" میں تجھ سے محبت کروں گا۔ اپنا بے نقاب چہرہ تجھے دکھا دوں گا اس سے زیادہ تو اور کیا تمنا کر سکتا ہے؟"

"شلر" "ریاست"

عربی حسن کی ایک تصویر

اُس کی پیشانی آئینہ کی طرح صیقل زدہ ہے، اُس کے بال حد سے زیادہ سیاہ تاب ہیں اور ایسے گھنے اور لمبے ہیں جیسے گھوڑے کی دُم جب وہ جوڑا کھول دیتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک زنجیر لٹک رہی ہے اور جب کنگھی کرتی ہے تو بال ایسے چمکتے ہیں کہ گویا انگور کے خوشوں کو بڑی بڑی بوندوں کے بادل نے سیراب کیا ہے اور بھویں قلم سے کھینچی ہیں یا کاجل سے سیاہ کی گئی ہیں جیسے موٹی ہرنی کی آنکھوں پر کمانیں (بھویں) ہوتی ہیں اور اُن کمانوں کے وسط میں ستواں ناک اس طرح نمایاں ہے جیسے تلوار کی دھار اُس کی دونوں جانب گورے چہرہ پر جس کا رنگ موتی کی طرح ہے دو ارغوانی گال ہیں اور گالوں کے بیچ دہن انگوٹھی کے مشابہ ہے۔ ہونٹ شیریں اور اوپر نیچے کے چار دانت نہایت چمکدار ہیں جس کے اندر ایک فصیح اور متحرک زبان ہے۔ بڑی عاقلہ اور حاضر جواب ہے، جب اُس کی سفید نقرئی گردن کو حرکت دی جائے تو سرخ لبوں کا پانی شہد جیسا میٹھا ہے اور سینہ پر گردن ہاتھی دانت کی مورت کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ بازو گول ہیں۔ جس سے ملے ہوئے ہاتھ ہیں اور اس درجہ نرم ہیں کہ اُن میں ہڈی معلوم ہوتی ہے نہ رگیں اور ہتھیلیاں ایسی نرم ہیں کہ چاہو تو انگلیوں کو اس سے ملا سکتے ہو۔

"علی گڈھ میگزین"

نوا ہائے راز

بخواہم بادۂ دیگر وزاں کیف و کمے دیگر
جہاں بیں جامِ دیگر دیدہ افروزِ جمے دیگر

مپرس اے ہم نشیں از منِ دنیا و زشر و شورش
کہ من با جامِ عشق افتادہ ام در عالمے دیگر

نمک از خندہ اش باشد علاجِ زخمِ پنہانم
نمک پروردۂ عشقم بخواہم مرہمے دیگر

نمی ارزد بجز باغِ گیتی روضۂ رضواں | نمی خواہم بہشتے دیگر اندر عالمے دیگر
تو بہرِ امتحانے دیگرے پیدا کن ابلیسے | کہ شاید از دگر خلدے بر آید آدمے دیگر
بہ مہرِ آں حسنِ کامل چوں مشعبد می کند بازی | دمے پیدا کند اما کند پنہاں دمے دیگر

ازیں پستی بہ آں رفعت نگاہم بردہ خاکم را
کہ من در عالمے و سایہ ام بر عالمے دیگر

حامد علی خاں

"انقلاب"

زندگی ہنوز ایک راز ہے

چکاگو یونیورسٹی نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کو اُس کے سولہ پروفیسروں نے مل کر تصنیف کیا ہے اور جس میں علوم و فنون کی ترقیوں کی تفصیل کی ہے، اس کتاب میں ایک فقرہ یہ ہے "ہم پر فرض ہے کہ ہم نہایت صراحت کے ساتھ یہ کہہ دیں کہ زندگی کا اصلی راز اب تک لاینحل ہے اس کے حل کرنے کے لئے بہتر سے بہتر جو طریقہ ہمارے پاس ہے وہ ہنوز ابتدائی مفروضات ہیں، زندگی کی ابتدا اور آغاز کی حقیقت کی گرہ اب تک ناخنِ عقل سے کھل نہیں سکی ہے اور جمادات اور زندہ مخلوقات کے درمیان جو ناقابلِ عبور خلیج حائل تھی وہ اب تک اسی طرح ہے"۔

"معارف"

لفظِ ڈاکٹر

آج کل ڈاکٹر کا لقب، متعدد علوم و فنون کے ماہروں کو دیا جاتا ہے، مگر اس لفظ کے ابتدائی معنی اس قدر عام نہیں ہیں، ڈاکٹر لاطینی زبان کا ایک لفظ ہے، جس کے اصلی معنی، معلم اور استاد کے ہیں، قرونِ وسطیٰ میں یہ لقب دینیات اور منطق کے معلموں کے لئے مخصوص تھا، جو اس زمانہ میں لاطینی زبان میں ان دونوں علموں کی تعلیم دیا کرتے تھے اور پھر جب لاطینی زبان میں طب کی بھی تعلیم شروع ہوئی تو طبیبوں کو بھی ڈاکٹر کہنے لگے، قانون کے کامیاب علماء کو ڈاکٹر کا لقب سب سے پہلے ۱۱۳۰ء میں بولونی فرانس میں دیا گیا، پھر اس لفظ نے یہاں تک وسعت اختیار کی کہ اب فلسفہ، زبان، تاریخ، موسیقی، اور دوسرے علمی شعبے کے ماہروں کو بھی یہ لقب دیا جانے لگا۔

"معارف"

تبصرہ

رسائل

"تعلیم و تربیت" - آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ کا سہ ماہی رسالہ ہے جو ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب پی، ایچ ڈی، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی اور خواجہ غلام السیدین صاحب بی، اے ایم ای ڈی ایسے ماہرین تعلیم کی ادارت میں شائع ہوتا ہے - ہندوستان تعلیم کے معاملہ میں دنیا کے مہذب ممالک سے ابھی بہت پیچھے ہے اور اس قسم کی کوئی باقاعدہ اور منظم تحریک بھی موجود نہیں جو ہماری قوم کو تعلیمی ضروریات اور اصلاحات سے روشناس کرتی رہے، دنیا کے تازہ ترین تعلیمی تجربات سے آگاہ کرے اور دوسری قوموں کے بار آور تعلیمی انقلابات سے ہر وقت ہم کو باخبر رکھے - یہ رسالہ انہیں کمیوں کو پورا کرنے کے لئے بعض دوربین اور ترقی پسند اصحاب نے جاری کیا ہے، چنانچہ "جرمنی میں صنعتی تعلیم"، "جامعات اسکاٹستان" اور "ایک مدرسۂ جدید بلجیم میں" وہ مضامین ہیں جن سے ان مقاصد کی تکمیل بوجہ احسن ہو رہی ہے - باقی تمام مضامین بھی نہایت بلند پایہ ہیں - جو اصحاب ملک کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لیتے ہوں اور تعلیم و تربیت کی تحریکات جدیدہ سے واقف رہنا چاہتے ہوں انہیں یہ رسالہ ضرور پڑھنا چاہئے حجم ڈیڑھ سو صفحے سے زیادہ اور قیمت پانچ روپے سالانہ ہے کاغذ کتابت اور طباعت بہت عمدہ ہے -

"مخزن" کا سالگرہ نمبر" "مخزن" ایک ایسا رسالہ ہے جس نے دور حاضر کی عامیانہ روش سے انحراف کرتے ہوئے ملک کے سامنے مفید اور متین ادبیات پیش کرنے کے لئے اپنی کوششیں وقف کردی ہیں حضرت حفیظ جن کے ہاتھ میں اس رسالے کی عنانِ ادارت ہے نہایت سلیم مذاق رکھتے ہیں - اور انہوں نے سالگرہ نمبر کو ہر پہلو سے قابل تعریف بنایا ہے اُن کی کہانی "افسانہ در افسانہ" اور اُن کی نظم "پریت کا گیت" اس نمبر کے بہترین مضامین ہیں حفیظ کی تحریر میں جھوٹی شان و شوکت نہیں اور نہ اُن کے تخیل میں دور از کار بلند پروازی ہے - اُن کا افسانہ ہماری تہذیب اور تمدن کا صحیح نقشہ ہے - اور اس پر اُن کی ٹھیٹ اور سلیس زبان نے اُسے اور بھی دلکش بنا دیا ہے - پرچے کا حجم ڈیڑھ سو صفحات کے قریب ہے اور قیمت چودہ آنے (۱۴؍) منیجر "مخزن" بھاٹی گیٹ لاہور سے طلب فرمایئے -

"طور" لاہور سے اس نام کے ایک نئے علمی و ادبی مصوّر رسالے کا اجرا ہوا ہے - جلال الدین صاحب اکبر جن کا کلام اکثر ہمایوں میں شائع ہوتا رہتا ہے اس کے ایڈیٹر ہیں - رسالہ کو کارآمد اور دیدہ زیب بنانے میں انہوں نے کافی محنت کی ہے اور اُس کے لئے مشہور ادیبوں سے مضامین حاصل کئے ہیں - رسالے کی اُٹھان شاندار ہے - اور ہمیں امید ہے کہ

یہ خوب ترقی کرے گا۔ اپنے ناظرین سے ہم سفارش کرتے ہیں۔ کہ وہ بھی "طور" کی سرپرستی کریں"۔ طور ہر ماہ کی سولھویں تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ سالانہ چندہ تین روپے ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ مینجر رسالہ "طور" شیراں والا دروازہ لاہور

"پیمانہ" مولانا سیماب اکبر آبادی اور جناب ساغر نظامی نے اس رسالے کو تیسری مرتبہ دارالسلطنت دہلی سے جاری کیا ہے۔ ساغر و سیماب کے احباب اُن کے طرزِ تحریر اور اُن کی ادبی قابلیتوں سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے ہمیں یہاں اُن کا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ پیمانہ اپنی تمام قدیم خصوصیات کو لئے ہوئے تیسری مرتبہ دور میں آیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ میکشانِ ادب اس کا پُرجوش خیر مقدم کریں گے۔ رسالہ مصور ہے حجم ۸۰ صفحے ہے سالانہ قیمت للعہ ر علاوہ محصول ملنے کا پتہ دارالتصنیف دہلی۔

تصاویر

یورپ کے بہترین مصوّروں کے شاہکار۔ یہ پچیس کارڈوں کا ایک خوبصورت اور نفیس مجموعہ ہے جن پر اعلیٰ درجہ کے رنگ و روغن سے یورپ کے اُن مصوروں کی حُسن کاری کے منتخب شاہکار جمع کئے گئے ہیں۔ جو اقلیمِ فن میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ رنگوں کی نمائش شگفتہ اور دل کش ہے۔ اور کارڈوں کے کنارے سنہری ہیں۔ بعض تصاویر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً دولت کا تعاقب۔ محوِ دریا۔ محبت کا دروازے کے باہر۔ طوفان۔ رومیو اور جولیا۔ اقلیمِ خداوندی کا سفر۔ حرم کا نیا چراغ۔ جھولا۔ دریافتِ موسیٰ علیہ السلام۔ سحرِ موسیقی۔ رونقہ اور زاہدی۔ ماں اور بچہ۔ رفع نقاب اور اندھا بھکاری۔ **دولت کا تعاقب** اتنی وسیع المعنی تصویر ہے کہ اُس کو دیکھ کر مصور کے دماغ کی داد دینی پڑتی ہے۔ دولت کی دیوی ایک پانی کے بلبلے پر سوار اُڑی چلی جارہی ہے اس کے پیچھے ایک کم عرض پل پر جس کے نیچے زور شور سے ایک دریا بہہ رہا ہے دو سوار اس دیوی کے تعاقب میں اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑا رہے ہیں۔ سواروں میں سے ایک غالباً ناکامی اور نامرادی کا بھوت ہے جو دولت کے تمنائی کو روک رہا ہے مگر وہ ہر خطرے سے بے پروا ہو کر چلا جاتا ہے اُس کے گھوڑے کے پاؤں تلے ایک نازنین کچلی جارہی ہے جس کا شاید یہ مطلب ہے کہ وہ دولت کے حصول کے لئے دنیا پر ہر ظلم و ستم توڑنے کے لئے تیار ہے محوِ دریا میں دکھایا گیا ہے کہ غروبِ آفتاب کے وقت ایک لڑکی سمندر کے کنارے پر بیٹھی ہوئی ہے اور اس کی موجوں کے زیر و بم میں محو ہے۔ اس تصویر کی خوبی یہ ہے کہ اس کی ہر چیز حیرت میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ محبت دروازے کے باہر ایک ایسی تصویر ہے جس سے محبت کی مجبوریاں ٹپک رہی ہیں۔ اسی طرح تمام تصویریں نہایت بلیغ اور پُر معنی ہیں۔ البتہ دو تین تصاویر میں عریانی بھی موجود ہے۔ گو باعتبارِ فن ہم اُن میں بھی کوئی نقص نہیں پاتے۔ مجموعہ کی قیمت للعہ روپے ہے۔ ایس احمد اینڈ کمپنی پوسٹ بکس ۱۲۵ لاہور سے منگائیے۔